ڈاکٹر شاہ عباد الرحمن نشاط
سابق پروفیسر، شعبۂ انگریزی، ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت، تحریک اور اثرات

ڈاکٹر شاہ عباد الرحمن نشاط
سابق پروفیسر، شعبۂ انگریزی، ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ

ناشر
سید احمد شہید اکیڈمی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

جمادی الاخری ۱۴۳۶ھ مطابق اپریل ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	سید احمد شہیدؒ - شخصیت، تحریک اور اثرات
مؤلف	:	ڈاکٹر شاہ عباد الرحمن نشاط
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
صفحات	:	۲۵۵
قیمت	:	

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے:

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ، لکھنؤ

ناشر
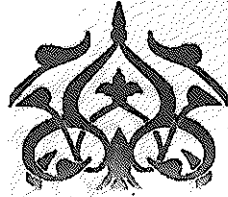
سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

اور

مولانا غلام رسول مہرؒ

کے نام

جن کی جستجو و تحقیق نے حضرت سید احمد شہیدؒ
کی شخصیت و تحریک کو بیسویں صدی میں دوبارہ زندہ کیا۔
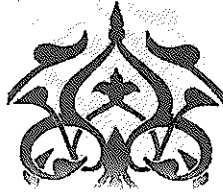
تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

اقبال

فہرست مضامین

دوسرا باب

بنیادی ارکان دین کا احیاء

(۱۱۰-۱۵۱)

تیسرا باب
اصلاح اخلاق
(۱۵۲-۱۸۲)

چوتھا باب
اصلاح معاشرہ
(۱۸۳-۲۰۵)

پانچواں باب
اسلامی ریاست کا قیام
(۲۰۶-۲۲۵)

چھٹا باب

تحریک جاری ہے

(۲۴۲-۲۲۶)

فہرست کتب

(۲۴۶-۲۴۳)

اشاریہ (انڈکس)

(۲۵۵-۲۴۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

امیر المؤمنین سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پر بیسیوں کتابیں تصنیف کی گئیں، جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' اور مولانا غلام رسول مہر کی محققانہ تصانیف ''سید احمد شہیدؒ''، ''سرگزشت مجاہدین'' اور ''جماعت مجاہدین'' کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کے علاوہ بھی متعدد رسائل اس موضوع پر تصنیف کیے، جن میں ایک اہم رسالہ ''تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ'' بھی ہے، جس میں حضرت سید صاحبؒ کے سلسلہ میں پیدا کی گئی بعض غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے، اور اس سے بعض وہ حقائق بھی سامنے آجاتے ہیں جن کی طرف نگاہ بھی نہیں پہنچتی، اس کے علاوہ ''جب ایمان کی باد بہاری چلی'' حضرت سید صاحبؒ کے مؤثر واقعات کا ایک ایسا دل آویز مرقع ہے جس کو پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے، اور تعلق مع اللہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں اللہ نے ایسی تاثیر اور جاذبیت رکھی ہے جو کم کسی کے حصہ میں آتی ہے، چونکہ حضرت کو نماز سے ایک خاص نسبت حاصل تھی اس لیے ان کا تذکرہ پڑھ کر نماز میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور نمازوں میں جی لگنے لگتا ہے، بعض مرتبہ ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کسی نے نماز میں جی نہ لگنے کی شکایت کی تو حضرتؒ نے ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' پڑھنے کا مشورہ دیا، اور اس کا فائدہ محسوس کیا گیا۔

پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، مصنف نے خاص طور پر اس کتاب میں بڑی خوبصورتی سے ''حضرت سید صاحبؒ'' کی مختلف صفات وامتیازات کو

علیحدہ علیحدہ اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کے اندر ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور کسی درجہ میں اس کو حاصل کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے ایسے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے بعض لوگوں کے اندر پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوتا ہے، اس کی بڑی وجہ مصنف کا صاحب تذکرہ سے وہ تعلق و نسبت ہے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا، اس کے علاوہ وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے محب و محبوب رہے ہیں، اور ان کو حضرت کی طرف سے خلافت بھی حاصل ہوئی، اس کا بھی ان کی تصنیف میں خاص اثر نظر آتا ہے، پھر واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھی اردو لکھتے ہیں، اور ان کے آسان اور موثر اسلوب نے کتاب میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

میں مصنف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس کی اشاعت اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں، سید احمد شہید اکیڈمی کے مقاصد میں یہ بات داخل رہی ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے سلسلہ میں بہتر لٹریچر سامنے لایا جائے، یہ کتاب اس کی ایک بہت اہم کڑی ہے، میں مصنف کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب اشاعت کے لیے اکیڈمی کے حوالہ کی اور اس سلسلہ میں ہر طرح کا تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور کتاب کو نافع و مقبول فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۱۹/ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ (شب جمعہ)

دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہار تشکر

میں اللہ تعالی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کتاب دراصل میری انگریزی کتاب Sayyid Ahmad Shaheed: Life, Mission and Contributions کا آزاد اردو ترجمہ ہے۔ میں نے یہ کتاب انگریزی میں ابھی ابھی مکمل کی ہے اور وہ ابھی چھپی بھی نہیں ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد مجھے اسے اردو میں منتقل کرنے کا خیال آیا کہ اردو داں قارئین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و تحریک سے زیادہ واقف اور مانوس ہیں۔ امید ہے کہ زیر نظر کتاب قارئین کے دلوں میں سید صاحبؒ کی سوئی ہوئی محبت کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنے گی اور ان کے دل و دماغ میں سید صاحبؒ کے نصب العین اور پیغام کو تازگی بخشے گی۔

اس کتاب کی تصنیف کے لئے میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کا انتہائی مشکور ہوں جنھیں دنیا دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اعلی، ایک بلند پایہ عالم دین، عظیم مفکر، مخلص داعی اور مشہور محقق اور مصنف کی حیثیت سے جانتی ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ پر سب سے پہلے میں نے انہی کی کتاب پڑھی اور انہی کی نجی محفلوں میں سید صاحبؒ کے نام اور تحریک سے متعارف ہوا۔ بعد میں جب میں نے ان سے سید صاحبؒ پر ایک کتاب لکھنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا اور ان کی خدمت میں کتاب کا خاکہ پیش کیا تو نہ صرف انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔ میری اس کتاب میں ان کی دلچسپی وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں: اولاً سید احمد شہیدؒ سے ان کی والہانہ محبت، اور دوئم اس کتاب کا ان کی آرزوؤں کے شہر مکہ مکرمہ میں زیر تصنیف ہونا جہاں ان دنوں میں اپنی نوکری کے سلسلے میں مقیم تھا۔ حضرت مولانا معین اللہ ندویؒ نے ایک بار مجھے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرتؒ نے اپنی ایک نجی مجلس میں ان سے اس کتاب کا ذکر فرمایا۔ خود ایک بار حضرتؒ نے مجھ سے فرمایا کہ انہوں نے ایک جگہ اپنی تقریر میں

بھی یہ بات کہی کہ حضرت سید صاحبؒ پر ایک کتاب مکہ مکرمہ میں زیر تصنیف ہے جو ان کی عنداللہ مقبولیت کی شاہد ہے۔ انہوں نے اس موضوع سے متعلق اپنی دو کتابیں بھی (میری درخواست کے بغیر) مجھے مکہ مکرمہ بھجوائی تھیں، اور ایک بار از راہ احسان و کرم مجھ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اس کی طباعت کے اخراجات میں وہ بھی شریک ہونا پسند فرمائیں گے۔ افسوس کہ اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ اپنے رب سے جا ملے لیکن اس علمی کاوش کے ہر دور میں احسان شناشی کے ساتھ ان کی یاد میرا سہارا رہی۔

میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا جو دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہیں اور میرے محسن بھی، دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے لئے انتہائی گراں قدر مقدمہ لکھ کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ تادیر ان کا سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھے اور انہیں بہترین اجر عطاء فرمائے۔ آمین!

مراجع اور مآخذ کی حصولیابی میں میرے جن مہربان دوستوں نے حصہ لیا، میں تہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے اہل خاندان کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے میرے اس تصنیفی کام میں دلچسپی لی اور میری ہمت افزائی کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور میری اس حقیر کوشش کو محض اپنے لطف و کرم سے قبول فرما کر میرے ساتھ دونوں جہاں میں ستاری و غفاری کا معاملہ فرمائے۔ آمین۔

شاہ عباد الرحمٰن نشاط
۱۴۔ ایچ۔ ابوالفضل انکلیو، دہلی، ۱۱۰۰۲۵

مئی ۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جب میں نے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تحریک احیاءِ دین پر چند کتابیں پڑھیں تو مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ اس تحریک کو، جو ہمارے زمانے سے اتنا قریب ہے اور جس نے ہندوستان کے تاریخ پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں، خود اس ملک کی تاریخ میں مناسب مقام کیوں نہیں حاصل ہو سکا۔ بعد میں اس موضوع پر مزید مطالعہ کرنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر چہ اس کی کئی وجوہات تھیں لیکن اس کا سب سے اہم سبب ہندوستان کی اس وقت کی انگریز حکومت کی وہ شدید مخالفانہ پالیسی تھی جس کی رو سے اس تحریک کو دبانے اور مٹانے کی ہر وہ کوشش کی گئی جو ممکن تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کو اتنا مجروح کر دیں کہ وہ کبھی انگریزوں کے خلاف کھڑے نہ ہو سکیں۔ اس پس منظر میں سید احمد شہیدؒ کا اپنے رفقاء اور مجاہدین کے ساتھ کھڑے ہو جانا اور انگریزوں کی قوت کو چیلنج کرنا انگریزوں کے لئے ایک ایسا خطرہ تھا جس سے صرف نظر کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس تحریک کو کچلنے اور سید احمد شہیدؒ کی شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے ایک منظم مہم کا آغاز کیا۔

انگریزوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اپنائے: اولاً طاقت کا استعمال، جس کے تحت انہوں نے تحریک کے رہنماؤں اور بہی خواہوں کو جیل اور کالا پانی کی سزا دی، انھیں مقدمات میں الجھایا، ان کی جائیداد ضبط کی، اور ہندوستان میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں سید صاحبؒ کی شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے ایک تحریک چھیڑی، انہیں "وہابی" کا نام دیا اور شیخ عبد الوہابؒ کا جو سعودی عرب کے ایک دینی قائد تھے اور جنھیں بعض وجوہات کی بناء پر ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا، خوشہ چیں بنا کر پیش کیا۔ مزید برآں، انہوں نے سید صاحبؒ اور ان کی تحریک پر مستقل مضامین اور کتابیں لکھیں جس میں بدترین غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے سید صاحبؒ کو مرگی کا مریض، ڈاکو، اور غیر معروف خاندان سے تعلق رکھنے

والا ایک شخص قرار دیا جب کہ حقیقت میں وہ ایک انتہائی پاکیزہ شخصیت کے مالک، مسلمانوں کے عظیم رہنما اور ایک انتہائی معزز خاندان کے فرد تھے۔ (۱)

انگریزوں کے دور حکومت میں سید صاحبؒ کی تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں کو اتنے خطرات درپیش تھے کہ جب حضرت جعفر تھانیسری نے، جو اس تحریک کے ایک مخلص رہنما تھے، سید صاحبؒ کی سوانح لکھی تو انہیں مآخذ میں تبدیلی کرنی پڑی اور سید صاحبؒ کے خطوط میں بعض مقامات پر جہاں لفظ "انگریز" لکھا تھا، اسے بدل کر اس کی جگہ انہوں نے "سکھ" لکھ دیا۔ (۲) اسی طرح جب سر سید احمد خان نے ولیم ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کے جواب میں ایک رسالہ لکھا تو انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سید صاحبؒ کی تحریک نہ تو تحریک جہاد تھی اور نہ ہی وہ انگریزوں کے خلاف تھی۔ (۳) بعد میں ایک کتاب "شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ"، مرتبہ عبد اللہ بٹ، جو شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ پر مضامین کا مجموعہ تھی جب ۱۹۴۰ء میں چھپی تو اس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ وہ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے تعارف کی ایک نامکمل اور بس ابتدائی کوشش تھی۔ ایسی کسی کتاب کی اشاعت جس میں مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا، اس وقت ممکن ہو سکی جب انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا قطعی ہو چکا تھا۔

لیکن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا، سید صاحبؒ کی تحریک پر مواد ان کے سوانح نگاروں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ ابتدائی دور میں ہی محفوظ کر لیا تھا۔ "مخزن احمدی"، "وقائع احمدی"، اور "منظورۃ السعداء" ایسی کتابیں ہیں جن کے مصنف اس تحریک سے متعلق حالات اور واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ "تذکرۂ صادقہ" اور "تاریخ عجیبہ (سوانح احمدی)" کے مصنف وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں خود اس تحریک میں حصہ لیا تھا۔ پھر وہ خطوط بھی محفوظ تھے جن میں اس تحریک سے متعلق بہت سی ضروری اطلاعات محفوظ تھیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے بعد لکھی گئی کتابوں میں بھی جا بجا اس تحریک کا تذکرہ ملتا تھا۔ اس طرح سید صاحبؒ کی شخصیت، جدوجہد اور مشن کے بارے میں پوری تفصیلات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیے سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب، تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۵۲ تا ۵۷

(۲) غلام رسول مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۷۔

(۳) سر سید احمد خان، ریویو آن ڈاکٹر ہنٹرز انڈین مسلمان، (انگریزی)

ان تحریروں کی روشنی میں سید صاحبؒ کی شخصیت اور تحریک کا علمی اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جاتا، اسے مجموعی شکل میں پیش کیا جاتا اور اس کا مطالعہ تاریخ کے پس منظر میں کیا جاتا۔

یہ مشکل اور اہم کام بیسویں صدی کے دو اہم اور جلیل القدر مصنفین، سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور مولانا غلام رسول مہرؒ نے انجام دیا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کا ایک بڑا حصہ اس کام میں صرف کیا، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے مآخذ کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیا، حقائق کو غیر مستند روایات سے الگ کیا اور اس تحریک پر ایسی مفصل اور مستند کتابیں تیار کیں جن میں اس تحریک کا مکمل خاکہ بھی تھا اور جن میں پیش کی گئی تفصیلات پر پورا اعتماد بھی کیا جا سکتا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے اس موضوع پر پانچ انتہائی محققانہ کتابیں لکھیں اور ان میں تاحیات قیمتی اضافے کرتے رہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ اور مجاہدین پر تین عظیم الشان کتابیں لکھیں اور ان میں تحقیق کا وہ معیار برقرار رکھا جو انھیں دنیا کے بہترین مورخ اور سوانح نگاروں میں شامل کرتا ہے۔ صرف اپنی پہلی کتاب ''سید احمد شہیدؒ'' لکھنے کے لئے انہوں نے چودہ سال لئے جس میں اس موضوع سے متعلق ہر وہ چھوٹی بڑی چیزیں پڑھیں جنھیں وہ حاصل کر سکے۔ حقیقت میں سید صاحبؒ پر موجودہ اسکالرشپ کی قابل اعتماد حیثیت ان دونوں عظیم محققین کی مرہون منت ہے۔

زیر نظر کتاب میں میں نے سید صاحبؒ کی تحریک کے مکمل تعارف کے ساتھ ساتھ اس کے گہرے اور دیرپا اثرات کا مفصل خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے تحت اس کتاب کے پہلے باب میں سید صاحبؒ کی شخصیت اور ان کی تحریک کا مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو ضروری تفصیلات سے متعارف کیا جا سکے۔ دوسرے باب سے پانچویں باب تک اس تحریک کے مختلف اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹا باب اس کتاب کا اختتام ہے جس میں اس تحریک کے دوررس اثرات کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اس تحریک کے اثرات موجودہ دور میں بھی زندہ ہیں۔

میرے مطالعہ اور تحقیق کے نتیجے کے طور پر جو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ سامنے آئیں اور جو فطری طور پر اس کتاب میں اہمیت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سید صاحبؒ کی تحریک خالص اسلامی تحریک تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو اسلام کی سیدھی

اور سچی تعلیمات کی طرف واپس لانا تھا۔ سید صاحبؒ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا اور ان کی ساری کوششیں اس مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ کا درجہ رکھتی تھیں۔

۲۔ اس تحریک کو صرف جہاد کی تحریک سمجھنا غلط ہے۔ یہ اصلاً ایک ایسی اسلامی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کی مکمل زندگی کا احاطہ کیا اور اسے متاثر کیا۔ ان اثرات کو ہم مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور قومی دائروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ جہاد یقیناً اس تحریک کا ایک بہت اہم حصہ تھا لیکن اس تحریک کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کے سارے پہلوؤں کا مجموعی مطالعہ ضروری ہے۔

۳۔ یہ تحریک مختلف ارتقائی ادوار سے گزری اور پروان چڑھی۔ اس کا آغاز احیاء ایمان کے بعد انفرادی سطح پر اخلاق کی درستگی سے ہوا۔ پھر یہ سماجی اصلاح کی داعی بنی۔ اس کے بعد اس تحریک نے جہاد کو ایک ذریعہ کے طور پر اپنایا۔ پھر اس کا ایک سیاسی ڈھانچہ ابھرا جو ایک اسلامی ریاست کی شکل میں قائم ہوا۔ ان سب ادوار میں اس تحریک نے اسلامی شریعت کے اصولوں کی پوری پوری پابندی کی۔

۴۔ تحریک جہاد کے دور میں اگرچہ سید صاحبؒ کا مقابلہ پہلے سکھوں سے ہوا جس کی وجہ پنجاب میں مسلمانوں پر سکھ حکومت کا ظلم وستم اور سرحد پر ان کی دست درازی اور فوج کشی تھی، لیکن سید صاحبؒ مسلمانوں کا اصل دشمن انگریز کو سمجھتے تھے۔

۵۔ اس تحریک نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مجاہدین نے شروع سے انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور ان سے اس وقت تک جنگ کرتے رہے جب تک کہ ہندوستان آزاد نہیں ہو گیا۔ حقیقت میں مجاہدین کی جماعت ہی ایک ایسی جماعت تھی جس نے اتنے لمبے عرصہ تک انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی اور ان سے مصالحت کی کوئی شکل کبھی قبول نہیں کی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اس تحریک کے مقام کا اعتراف مؤرخین کا ایک اخلاقی فرض ہے جسے ادا کرنے کی اس وقت تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

۶۔ یہ تحریک صحیح اسلامی خطوط پر قائم ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے مذہبی تعصب سے بالکل پاک تھی۔ اس تحریک نے اسلام کے نام پر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف نفرت نہیں پھیلائی۔ اگر سید صاحبؒ نے سکھوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کی تحریک کے بعد کے لیڈروں نے انگریزوں کے خلاف لڑائیاں لڑیں تو وہ مسلمانوں اور اسلامی اقتدار کے دفاع میں تھیں، نہ کہ اس

لئے کہ سکھ اور انگریز دوسرے مذاہب کے ماننے والے تھے۔ مندرجہ بالا مقاصد کے پیش نظر سید صاحبؒ نے بحالت مجبوری مسلمان خوانین سے بھی جنگ کی ہے۔

۷۔ یہ تحریک ایک انتہائی کامیاب تحریک تھی۔ اسے ناکام سمجھنا ایک ایسی غلطی ہے جس کی وجہ اس کے سارے پہلوؤں پر نظر نہ ہونا ہے۔ حقیقت میں اس تحریک نے اپنے سارے مقاصد پورے طور سے حاصل کیے اور مسلمانوں کی دینی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی زندگی میں ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کیا جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تحریک کے بعض پہلوؤں پر مفصل بحث ابھی باقی ہے۔ خاص طور سے انگریزی میں غیر جانبدارانہ اور قابل اعتماد کتابیں آج بھی کم ہیں۔ امید ہے کہ پیش نظر کتاب اور اس کی انگریزی اصل (جس کا یہ اردو ترجمہ ہے) کسی حد تک قارئین کی ضرورت پوری کرے گی۔ اس کتاب میں سید صاحبؒ کی تحریک کے مختلف اثرات کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس ترتیب کی وجہ سے قارئین کے سامنے ان اثرات کا خاکہ زیادہ واضح طور پر سامنے آسکے گا۔

شاہ عبادالرحمٰن نشاط

دہلی، مئی ۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمدلله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه الغر الميامين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، ودعا بدعوتهم أجمعين، أما بعد:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مورث اول حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی بیوی حضرت حواء علیہ السلام کو جنت سے اس کرۂ خاک پر جب اتارا تو ان کو اور ان کی اولاد کو اس بات کی امید دلائی کہ ان کی اولاد بنی آدم نے اگر زندگی کو اپنے پروردگار کے بتائے ہوئے راستہ پر چلایا تو جنت میں اس کی نعمتوں کی طرف بخیر و خوبی اور خوشی واپسی ملے گی۔ اور جو لوگ اس راستہ سے انحراف کریں گے ان کو ان کے پروردگار کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکے گی، اور ان کی زندگی میں ان کی جو غلط کاریاں ہونگی ان ہی کے معیار سے آخرت کی زندگی میں وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیکوکار اور شکر گزار بندوں کے لئے جنت اور اپنے نافرمان اور ناشکر گزار بندوں کے لئے جہنم کا ٹھکانہ طے کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے کچھ عرصہ تک اس بات کا خیال رکھا، لیکن وہ بتدریج اپنے ازلی دشمن شیطان کی کوششوں سے جو انسان کو ہوا و ہوس کے ذریعہ غلط راستوں پر ڈالنے لگا، اور اپنے پروردگار کے حکموں کے خلاف کفر و کوتاہی میں مبتلا کرنے لگا، راستہ سے بھٹکنے لگے، اور اپنے پروردگار کے اس توجہ دلانے کو بھلانا شروع کر دیا کہ دیکھو شیطان تمہارا دشمن ہے، ہوشیار رہو، وہ تم کو بہکا نہ دے۔ پھر بھی ان کے بہکنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیج کر ان کو سنوارنے اور بنانے کی

طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسی علیہ السلام تک جگہ جگہ اور یکے بعد دیگرے نبی آتے رہے، اور لوگوں کو نیکی کی طرف توجہ دلاتے رہے، پھر حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد نبیوں کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے روک دیا گیا، اور انسانوں کو ان میں آئے ہوئے گزشتہ نبیوں کی تعلیمات کو خود سے اختیار کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، اور کچھ مدت کے لئے نبیوں کی آمد نہیں ہوئی۔

پھر اللہ تعالی نے حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک بھرپور اور جامع نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمایا اور ساری دنیا کی ہدایت کے لئے ان کو مقرر کیا، اور ان کے بعد کے زمانے کے لئے نبیوں کے بجائے خود ان کی امت کے برگزیدہ بندوں پر لوگوں کی ہدایت کی کوشش کی ذمہ داری ڈالی۔ چنانچہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد جب جب بگاڑ بہت بڑھ جاتا تو کوئی مصلح اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جاتا، جو نبی نہ ہوتا لیکن نبیوں کا کام اس کو انجام دینا ہوتا۔

ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد عرصہ سے بسی ہوئی ہے، کئی بار ایسی بڑی شخصیتیں سامنے آئیں جنہوں نے دینی اصلاح کا زبردست کام انجام دیا اور ''مجدد'' کہلائے، ان کے کام کے اثرات ملک گیر ہوئے اور عرصہ تک ان کے اثرات باقی رہے۔

تیرہویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی زندگی میں شریعت اسلامی سے بے اعتنائی اور باطل رسم و رواج سے وابستگی اور توحید و سنت سے روگردانی جب عام ہوئی، اور مجدد سطح کی شخصیت کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالی نے اپنے ایک باہمت اور دینی غیرت رکھنے والے بندہ حضرت سید احمد بن عرفان شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو کھڑا کر دیا، اور ان کے کام میں ایسی اثر انگیزی فرمائی کہ جہاں جہاں وہ اصلاح، اخلاق اور توحید و سنت کی دعوت کے لئے گئے گہرا اثر پڑا، اور تھوڑی مدت میں بڑی اصلاح ہوئی۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے اندر ایک ایسا احساس بھی پیدا ہوا کہ صرف اخلاق کی درستی اور نیک عملوں کا اختیار کرنا کافی نہیں، بلکہ عہد اول کے اہل ایمان میں جو عملی مدارج تھے، ان مدارج کا بھی احیاء کیا جائے، مثلاً اخلاق و سیرت کی اصلاح کے بعد ہجرت و جہاد کا عمل بھی اختیار کیا جائے، اور اسلام کا پانچواں رکن حج جو کہ سفر اور راستہ کی دشواریوں کے پیش نظر تقریباً متروک ہو گیا تھا اور ﴿من استطاع الیہ سبیلا﴾ کو قابل عمل نہ سمجھ کر حج کی ضرورت کا احساس بالکل دب گیا تھا، اس کا

بھی احیاء کیا جائے چنانچہ سید صاحبؒ نے ان سب کا احیاء کیا۔

ان باتوں کی وجہ سے اس برصغیر میں جس کے پورے علاقے کو ہندوستان کہتے رہے ہیں، غیر معمولی اور وسیع پیانہ پر لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آئی، اور توحید وسنت سے لوگوں کے قلوب صرف آشنا ہی نہیں ہوئے، بلکہ دلوں کی گہرائی میں ان کی اہمیت اور ان کی پابندی کا جذبہ بھی راسخ ہوا۔ ہزاروں غیر مسلم بھی مسلمان ہوئے، اور حج وجہاد کے عمل بھی سنت کے طریقہ سے ایک بڑی تعداد نے حضرت سید صاحبؒ کی امارت میں انجام دیئے۔

حضرت سید صاحبؒ کی زندگی کے یہ مختلف مدارج اور احوال ان کے بعض مسترشدین نے ضبط تحریر کئے جو وسعت کے ساتھ کتابوں کی صورت میں وجود میں آئے۔ وہ کتابیں اپنی ضخامت کی وجہ سے زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں، لیکن ان سے فائدہ اٹھا کر حضرت سید صاحبؒ کی سیرت پر کئی کتابیں تصنیف ہوکر شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر جناب غلام رسول مہر صاحب کی کتاب ''سید احمد شہیدؒ'' اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جنہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اصل کتابیں جو بنیادی مرجع ہیں، مخطوطہ کی شکل میں اپنی جگہ پر محفوظ رہیں۔ ان میں ''وقائع احمدی'' کے نام کی کتاب اپنی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ''وقائع سید احمد شہیدؒ'' کے نام سے سید احمد شہید اکیڈمی لاہور سے اعلیٰ طباعت کے ساتھ ایک جلد میں تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اہم مراجع میں حضرت سید صاحبؒ کے قافلہ کے ایک ممتاز اور باہمت فرد مولانا سید جعفر نقوی بستوی کی تصنیف ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' جو فارسی میں ہے، اس کے اردو ترجمہ کا کام جاری ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''سید احمد شہیدؒ'' ایک جلد میں تھی، اور اس تحریک کے امتداد کو انہوں نے ''سرگزشت مجاہدین'' اور ''جماعت مجاہدین'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو اب ہندوستان میں مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی سے ''تحریک سید احمد شہیدؒ'' کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہو کر عام ہو رہی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بھی اپنی کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' میں بعد میں بڑے اہم اضافے کئے۔ دو ضخیم جلدوں میں یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع

کی، اور سید صاحب کے رفقاء اور اصحاب و خلفاء کا تذکرہ ''کاروان ایمان و عزیمت'' کے نام سے مولانا نے ہی مرتب کیا جسے مکتبہ اسلام لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے ایمان افروز سرفروشانہ اور مجاہدہ و عزیمت کے واقعات عربی داں حضرات کے لئے جمع کر کے ایک کتاب تیار کی جو "إذا هبّت ريح الإيمان" کے نام سے پہلے دار عرفات رائے بریلی نے، پھر مؤسسة الرسالة بیروت نے شائع کی جو بڑی مقبول ہوئی، جس کا اردو ترجمہ ''جب ایمان کی بہار آئی'' کے نام سے مولانا کے برادر زادہ عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے کیا، اور وہ ہندوستان میں مکتبہ فردوس لکھنؤ اور پاکستان میں مجلس نشریات اسلام کراچی سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ لیکن یہ خلا اپنی جگہ باقی رہا کہ عربی میں سید صاحبؒ کی تحریک، سیرت، مشن اور اس کے اثرات پر مستقل تصنیف ہو۔ اس خلا کو برادر عزیز مولوی محمد واضح رشید حسنی ندوی (حال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے پُر کیا، اور ''الامام أحمد بن عرفان الشهيد'' کے نام سے ایک مستقل تصنیف تیار کی، جو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب بھی تحقیقی انداز سے اور عصری اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے عصری اسلوب میں اس تحریک اور اس کے اثرات کو پیش کیا تھا، جس نے مسلمانوں کے اندر پھر سے نئی روح پھونک دی تھی۔ مزید تحقیق و تصنیف کا کام جاری ہے، اور سید صاحبؒ کے مکتوبات بھی مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور سے سید صاحبؒ کی تحریک کے ایک اہم علمی واقف کار مولانا سید شاہ نفیس الحسنی صاحبؒ کی توجہ سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

مستشرقین نے جو غلطیاں پھیلائی تھیں ان کے ازالہ کی بھی اہل قلم حضرات نے منصفانہ کوشش کی ہے، اور اپنی تحقیقات کے ذریعہ اس تحریک کا مضبوط دفاع کیا ہے۔

پروفیسر محمد اسلم استاذ شعبۂ تاریخ جامعہ پنجاب سید صاحب کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سید صاحب کی تحریک کی غرض و غایت کو سمجھنے کے لئے ان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر کو جاننا بیحد ضروری ہے، جب سید صاحب نے اپنی تحریک کا ڈول ڈالا تو اس وقت ''شاہ عالم'' دہلی تا پالم کا بھی مالک نہیں رہا تھا، اور اس کی حکومت قلعۂ معلی کی فصیل کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ شہر میں رزیڈنٹ صاحب بہادر کا حکم چلتا تھا، اور خلیج بنگال سے لے کر ستلج تک

نواب سرکار کمپنی بہادر کا سکہ چلتا تھا۔ ستلج کے اس پار رنجیت سنگھ کی حکومت تھی، اور وہ درۂ خیبر تک بلاشرکت غیرے حکمراں تھا۔ دہلی کے نواح میں انگریزوں کے تسلط کے باوجود جاٹ اور رانگھڑ دندناتے پھرتے تھے۔ مسلمانوں کی جان ومال اور آبرو نہ انگریزوں کے ماتحت علاقوں میں محفوظ تھے، اور نہ رنجیت سنگھ کے زیر تسلط علاقوں میں۔ پنجاب کی اکثر مساجد کو سکھوں نے اصطبلوں میں تبدیل کردیا تھا، اور مساجد کے مینار مؤذنوں کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ ان حالات میں شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا اور دیندار لوگ برصغیر سے ہجرت کا ارادہ کرنے لگے۔

ملک تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، دین بھی ہاتھ سے جانے والا تھا، فرائض کی جگہ رسومات نے لے لی تھی، اور دین مجموعۂ توہمات ورسومات بن کر رہ گیا تھا۔ ان حالات میں حضرت سید صاحبؒ اپنے سرفروش رفقاء کے ساتھ مسلمانوں کو قبضہ اغیار سے رہائی دلانے اور بدعات کو مٹا کر سنت نبوی کو زندہ کرنے پر تل گئے۔ لیکن انگریز شاطروں نے اپنے ایجنٹوں اور "مجددوں" کے ذریعہ اس تحریک کا استیصال کرنے کی مذموم کوشش کی۔ اگر سید صاحبؒ کی تحریک کامیاب ہوجاتی تو برصغیر انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوجاتا اور ایشیا کے دوسرے ممالک بھی اہل یورپ کی غلامی سے بچ جاتے۔

سید صاحب کی تحریک کے بارے میں معاندین نے طرح طرح کے بہتان تراشے ہیں، اور وہ ہمیشہ سے اسی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ جیسے بھی بن آئے ان کی اسلامی تحریک اور اس کے پاکیزہ عزائم ومقاصد کو مسخ کرکے غلط رنگ میں پیش کیا جائے"۔ (مقدمہ مکاتیب سید احمد شہیدؒ، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور، ۱۲۔۱۴)

ہمارے ڈاکٹر شاہ عبادالرحمٰن نشاط صاحب شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان سب حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک دستاویزی کتاب (Sayyid Ahmad Shaheed: Life, Mission, and Contributions) انگریزی میں تصنیف کی ہے، جس کی شدید ضرورت تھی اور زیر نظر کتاب جس کا آزاد اردو ترجمہ ہے، بعض انگریزی مصنفین کی جانب سے سید صاحبؒ کی تحریک سے متعلق واقعہ کے خلاف باتیں منسوب کی گئی تھیں، اور غلط پروپیگنڈا کیا گیا تھا جس کی وجہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو ایک رسالہ "تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" لکھنا پڑا تھا، جو بڑا مقبول ہوا۔ مولانا کی سرپرستی میں انگریزی میں بھی سید غلام محی الدین صاحب مرحوم نے سید صاحب کے متعلق ایک کتاب تیار کی تھی جو مجلس

تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس طرح انگریزی میں بھی تعارف پیش کیا گیا، لیکن اس کے باوجود اس بات کی ضرورت تھی کہ عصری اسلوب میں تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس عظیم مجدد و مصلح شخصیت کے کارناموں اور ان کی تحریک کے اثرات کو کہ جن سے آج کا عہد بھی متاثر ہے، اور ان کے مشن اور پیغام کو کہ جس کی ضرورت آج بھی اسی طرح ہے کہ اسی طاقتور اور انقلابی انداز سے سماج کی برائیوں کا ازالہ کیا جائے جو نئے نئے وسائل کے ذریعہ نئے نئے انداز سے پھیل رہی ہیں۔ یہ بات ایک واقعہ بن چکی تھی کہ جدھر سے سید صاحبؒ اور ان کی جماعت کے لوگ گذر جاتے وہاں کی فضا بدل جاتی، توبہ وانابت کا ماحول پیدا ہو جاتا، اور لوگ صاف محسوس کرتے کہ ایمان کی باد بہاری چل رہی ہے۔ ڈاکٹر نشاط صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ اس کتاب کو پیش کر کے ایک بڑے مادی طوفان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نشاط صاحب جو کہ امریکہ کی ناردرن الی نوائے یونیورسٹی (Northern Illinois University) میں استاذ رہ چکے ہیں، پھر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں انگریزی کے پروفیسر رہے، اور اب ابہا سعودی عرب کے کنگ خالد یونیورسٹی (King Khalid University) میں خدمات انجام دے کر ریٹائر ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل امریکہ میں کی، پھر وہاں لکچرار کی حیثیت سے کچھ مدت گذاری، پھر سعودی عرب میں انگریزی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ کی عمر تک خدمت انجام دی، وہ اس پوری مدت میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے برابر تعلق رکھتے رہے، اور دینی اور نظریاتی لحاظ سے استفادہ کرتے رہے، کھلے ذہن کے لیکن پختہ اخلاق و کردار کے حامل رہے، اور حضرت مولاناؒ کا اعتماد حاصل کیا، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے کام اور مقام کو سمجھنے میں بھی حضرت مولاناؒ سے اچھا استفادہ کیا۔ چنانچہ ان کو انگریزی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو پیش کرنے کا تقاضہ ہوا، اور اس تقاضے کو پیش نظر کتاب کی صورت میں تیار کیا۔

انہوں نے اپنی اس کتاب میں امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی حیات، تحریک، مشن اور اس کے آج تک مرتب ہونے والے اثرات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور اس کے ساتھ اخلاقی تربیت، سماجی تبدیلی، سیاسی اثرات اور حکومت کے دس ماہ کے قیام جو خلافت راشدہ کا نمونہ تھی، اس کا تذکرہ کیا ہے، اور اس طرح پوری تحریک کا ایک انصاف پسندانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تحریک وقتی نہیں تھی، اس کے آج بھی اثرات قائم ہیں، اور یہ کہ یہ اصلاً اسلامی

تحریک تھی، جس میں دعوت، اسلامی زندگی کی طرف واپسی کی دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ تحریک شریعت مطہرہ کی طرف خالص دعوت دینے والی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی زبردست اور کامیاب ترین کوشش تھی، اور یہی اس تحریک کا اصل مقصد تھا، اور اس مقصد میں یہ تحریک انتہائی کامیاب رہی۔ یہ تحریک ہر قسم کے تعصب سے پاک تھی۔ اصلاً نشانہ انگریزوں کے خطرات تھے۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس تحریک نے ہندوستان کی آزادی کی کوششوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرائی، اور جنگ آزادی کی داغ بیل ڈالی۔ ان تمام حقائق کا تفصیلی جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوگی، اور لوگوں کے لئے چشم کشا بنے گی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس کا عظیم صلہ عطا فرمائے اور ان حضرات کی برکات کا حصہ بھی عطا فرمائے، آمین!

ہم ان کو اس بات پر مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو شائع کرکے اس عظیم مجدد شخصیت کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں، جس نے جہاد جیسے اصلاح حال اور نصرت حق کے لئے جدوجہد کے مشکل عمل کو جاری کرکے ایک طرف تو اپنے قریب ترین اصحاب کے ساتھ اپنی جانوں کی قربانی دی، دوسری طرف اپنی مجاہدانہ اور مصلحانہ کوششوں سے لوگوں کے اخلاق وعقائد میں انقلاب پیدا کردیا۔ اور اس طریقہ سے وہ اسلامی زندگی کے لئے ایک روشن مینار بن گئے۔ ضرورت تھی کہ روشنی کے اس مینار کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے، اور اس کے نفع کو عام کرے، آمین۔

۲۶/۱۱/۱۴۳۰ھ
۱۵/۱۱/۲۰۰۹ء

(محمد رابع حسنی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

سید احمد شہیدؒ: حیات اور نصب العین

تاریخ ہندو پاک میں جس عہد کو مسلمانوں کا دورِ زوال کہا جاتا ہے، یہ اسی کا ایک باب ہے۔ لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تأمل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابل فخر نہیں ہوسکتا۔ حکم و فیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں بلکہ عزم جہاد، ہمت عمل اور راہ حق میں کمال استقامت پر ہوتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمال عزیمت اور کمال ہمت و استقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہد عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں جن میں مقصود، نصب العین، دین اور صرف دین ہی رہا ہو؟ (غلام رسول مہر، "سید احمد شہیدؒ")

دائرہ شاہ علم اللہ نامی بستی میں، جو ہندوستان میں اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں سئی ندی کے کنارے شرفاء کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے، ایک سید گھرانہ قیام پذیر تھا، جس نے اس آبادی کے آغاز سے ہی اس علاقے میں علم، اخلاق، تقوی اور روحانیت کا چراغ روشن کر رکھا تھا اور جس کے دم سے اس علاقے میں شریعت مطہرہ کی ساکھ قائم تھی۔ یہ خاندان حضرت شاہ علم اللہؒ(۱) سے نسبی تعلق رکھتا تھا جنہوں نے سترہویں صدی میں یہ بستی بسائی تھی اور جو شریعت مطہرہ اور سنت نبوی کے احترام میں اپنے وقت کے امام تھے۔ اسی خاندان میں ۲۹ر نومبر ۱۷۸۶ء (۶ر صفر ۱۲۰۱ھ) کو حضرت سید احمد شہیدؒ کی ولادت ہوئی۔(۲) ان کے والد کا نام محمد عرفان اور والدہ کا نام سیدہ ناجیہ (عرف ناجو) تھا۔ یہی وہ خوش نصیب بچہ تھا جو انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سب

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے، تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ از مولانا محمد الحسنیؒ۔ اس کتاب اور دوسری کتابوں جن سے استفادہ کیا گیا، کی مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے "فہرست کتب"۔

(۲) غلام رسول مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۰-۶۱۔

سے زیادہ قابل احترام اور با اثر مسلم رہنما کے طور پر ابھرا اور جس کی تحریک احیاء اسلام اب اس صدی کی مسلم۔ سکھ۔ برٹش تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک احیاء اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کی حامل تھی۔ اس تحریک نے انیسویں صدی کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو کو یکساں طور پر متاثر کیا اور ان کی دینی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی زندگی میں اپنے غیر معمولی اثرات ثبت کیے۔ یہ تحریک بہت عمیق، بہت وسیع اور بہت طاقتور تھی اور اس نے امت مسلمہ میں نشاۃ ثانیہ کے جو مظاہر پیدا کیے، وہ ایک طویل مدت تک باقی رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بعض حیثیت سے حضرت سید صاحبؒ جیسا قد آور رہنما ہندوستان کی تحریک احیاء اسلام کی تاریخ میں صدیوں تک نظر نہیں آتا۔

ابتدائی زندگی

سید صاحبؒ کی ابتدائی تعلیم ۱۷۹۱ء میں شروع کی گئی۔ اس وقت آپ کی عمر چار سال تھی۔ گرچہ تعلیم اس خاندان کی امتیازی شناخت تھی، لیکن سید صاحبؒ نے اپنی تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ ابتدائی تین سال میں انہوں نے قرآن کی چند چھوٹی سورتیں یاد کیں اور اردو کے حروف لکھنا سیکھ سکے۔ (۳) لیکن جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو عبادت اور ذکر الٰہی میں ان کی رغبت بہت بڑھ گئی۔ وہ تہجد کا اہتمام کرتے اور دعاء و تلاوت میں بہت ذوق و شوق سے مشغول رہتے۔ اس کے علاوہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت میں غیر معمولی دلچسپی لیتے۔ وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے غریب ضعیفوں، مجبوروں اور بیواؤں کے پاس خود جا کر ان کی ضرورتوں کے بارے میں دریافت کرتے اور جب تک ان کی ضرورتیں پوری نہیں فرماتے، انہیں اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ وہ ان کے لئے کنویں سے پانی بھر کر لاتے، جنگل سے جلاون کی لکڑی اپنے سر پر رکھ کر ان کے گھروں تک پہنچاتے، اور ان کے دوسرے چھوٹے بڑے کام کرتے اور اس بات کا ذرا خیال نہیں کرتے کہ ایسے کام ان کی بلند خاندانی حیثیت سے کسی طرح میل نہیں کھاتے۔

انہیں جسمانی کسرت اور جنگی کھیلوں کا بھی بہت شوق تھا۔ عمر کے ساتھ ان کی دلچسپی ایسے کھیلوں میں بڑھتی گئی جو اس زمانہ میں شہ زوری اور مردانگی کے کھیل سمجھے جاتے تھے۔ وہ گھنٹوں لگاتار ورزش کرتے۔ (۴)

---

(۳) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۱۔ (۴) سید ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۰۷۔

انہوں نے شمشیر زنی، تیر اندازی اور بندوق سے نشانہ لگانے میں بھی مہارت حاصل کی۔ تیراکی میں انہیں استاد وقت کا درجہ حاصل تھا۔ نواب وزیر الدولہ، جو ریاست ٹونک کے حاکم تھے، اس کی شہادت دیتے ہیں کہ سید صاحبؒ تیز موجوں کے مخالف رخ پر تیر سکتے تھے۔ یہ ایک ایسی فنی مہارت تھی جس کی وجہ سے وہ اس فن کے اساتذہ کے لئے بھی قابل رشک رہے۔ (۵)

لکھنؤ کا سفر

حضرت سید احمد شہیدؒ جب بارہ برس کے تھے تو آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور اس طرح گھر کی معاشی کفالت کی ذمہ داری ان پر آپڑی۔ ۱۷، ۱۸ برس کی عمر میں آپ نے کسی مناسب ذریعہ معاش کی تلاش میں لکھنؤ کا سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ لکھنؤ بڑا شہر تھا اور وہاں معاش کا کوئی مناسب انتظام ہو جانے کی امید تھی۔ پھر یہ رائے بریلی سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اس سفر میں سات رشتہ دار رفقاء بھی حصول معاش کی امید میں ساتھ ہو گئے۔ رائے بریلی سے لکھنؤ کا سفر پیدل ہی طے کرنا تھا اور ہر شخص اپنے سامان کا خود ذمہ دار تھا۔ سواری کے لئے صرف ایک گھوڑا تھا جس پر سب باری باری سے سوار ہوتے۔ اس طرح سفر طویل بھی تھا اور دشوار گزار بھی، لیکن اس تھکے ہوئے قافلہ کو سید صاحبؒ کی موجودگی سے بڑا سہارا ملا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان سب کا سامان ایک جگہ جمع کر کے ایک گٹھر بنالیا اور اسے اپنے سر پر اٹھا کر پورا سفر طے کیا۔ جب گھوڑے پر سواری کی ان کی باری آتی تو وہ اصرار کر کے اپنے کسی تھکے ہوئے ساتھی کو گھوڑے پر بٹھا دیتے اور خود پیدل چلتے۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کو حصول معاش میں کامیابی نہیں ملی۔ ان دنوں لکھنؤ شدید بے روزگاری کی گرفت میں تھا۔ سید صاحبؒ کو شہر کے ایک رئیس نے، جو ان کے بزرگوں سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھتا تھا، اپنا مہمان بنالیا، لیکن ان کے ساتھیوں کے لئے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ سید صاحبؒ کے لئے ان کے میزبان کے یہاں سے جو کھانا آتا، سید صاحبؒ اسے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر کھاتے۔ وہ اپنے میزبان کے یہاں سے آیا اچھا کھانا اپنے ساتھیوں کو کھلا دیتے اور خود ان کا پکایا معمولی کھانا کھاتے۔ اگر کسی دن ان کے ساتھیوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو وہ ان کے سامنے اپنا کھانا رکھ دیتے اور کسی نہ کسی بہانے

---

(۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۳-۶۴۔

سے اصرار کر کے انہیں کھلا دیتے۔ ان کے میزبان نے، جو ایک بارسوخ شخص تھا، ان کے اور ان کے رفقاء کے لئے کسی ملازمت کا انتظام کرنا چاہا مگر حالات اس کے قابو سے باہر تھے۔ (۶)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں

اس تنگی اور عسرت میں چار مہینے بیت گئے۔ یہ حالات سید صاحبؒ کے ساتھیوں کے لئے حوصلہ شکن تھے، لیکن خود انہوں نے ان پر بالکل ہی خلاف توقع ردعمل کا اظہار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نامور صاحبزادہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، جو ایک مشہور عالم دین اور اپنے والد کی روحانی امانت کے امین تھے، دہلی میں قیام پذیر تھے۔ ان دنوں سید صاحبؒ ان کا ذکر انتہائی محبت وعقیدت سے کرتے اور اپنے ساتھیوں کو ترغیب دیتے کہ سب دہلی چلیں اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی صحبت میں رہ کر معرفت الٰہی کی دولت حاصل کریں۔ لیکن ان کے رفقاء جو معاشی بدحالی سے بری طرح متاثر تھے، سفر کی ہمت نہ کر سکے۔ ادھر سید صاحبؒ کے دل میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضری کا تقاضا اتنا شدید ہو گیا کہ ایک دن وہ کسی کو بتائے بغیر دہلی کے لئے تن تنہا روانہ ہو گئے۔ انہیں لکھنؤ سے دہلی کا سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔ جو پیسے پاس تھے اس سے تو راستے میں کھانے کا انتظام بھی مشکل تھا۔

اس سفر میں سید صاحبؒ ایک جگہ رُکے اور ان کے پاس جو آخری رقم بچی تھی، اس سے کچھ کھانا خریدا۔ جیسے ہی انہوں نے کھانا کھانا شروع کرنا چاہا، ایک مفلوک الحال شخص ان کے پاس آیا اور اپنی بیچارگی ظاہر کرتے ہوئے بولا: "چار روز کی بھوک نے ہلاکت کے کنارے پہنچا دیا ہے، مجھے نہ دو گے تو مر جاؤں گا۔" سید صاحبؒ خود بہت بھوکے تھے اور کئی وقت کے فاقہ کے بعد انہیں تھوڑا سا کھانا نصیب ہوا تھا۔ پھر وہ کھانا انہوں نے اپنے آخری پیسے سے خریدا تھا۔ ان کا جی چاہا کہ سائل کو نظر انداز کر کے اپنی بھوک مٹالیں، لیکن دوسرے ہی لمحہ انہوں نے اپنی کمزوری پر قابو پالیا۔ انہوں نے سارا کھانا اس سائل کو دے دیا اور خود اللہ کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔ (۷)

روحانی تربیت

جب سید صاحبؒ دہلی پہنچے تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہ سید صاحب کے چچا سید نعمانؒ اور نانا سید ابوسعیدؒ سے واقف تھے جو ان کے والد حضرت شاہ ولی اللہ

(۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۰۷۔۱۱۰۔ (۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۱۔

محدث دہلویؒ سے باہمی محبت و اعتماد کا تعلق رکھتے تھے۔ (۸) جب انہیں معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ نے لکھنؤ سے دہلی کا پُر مشقت سفر معرفت الٰہی کے حصول کے شوق میں طے کیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور قدر دانی کے ساتھ سید صاحبؒ کو اپنے چھوٹے بھائی حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے حوالے کیا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے سید صاحبؒ کے قیام کے لئے اکبری مسجد (۹) کو تجویز فرمایا جہاں وہ ان حجروں میں سے ایک میں قیام پذیر ہوئے جو مسجد سے ملحق طلباء کے لئے بنائے گئے تھے۔ سید صاحبؒ وہاں حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک جمعہ کو حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے سید صاحبؒ کو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ سید صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت کی (۱۰)، ان کی نگرانی میں اپنی تربیت و اصلاح کا سفر شروع کیا اور شب و روز نماز، دعاء اور ذکر میں کمال یکسوئی کے ساتھ مشغولیت اختیار کی۔

(۸) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چند خطوط بنام حضرت سید ابو سعیدؒ پہلی بار ایک کتاب بہ عنوان ''نادر مکتوبات: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ''، میں چھپ گئے ہیں۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ نسیم احمد فریدی کا ہے۔ (ص ۴۰۵ تا ۴۰۹، جلد اول)۔ اس کتاب کا آئندہ حوالہ ''نادر مکتوبات'' کے مختصر نام سے دیا جائے گا۔

(۹) اکبری مسجد، بیگم اعزاز النساء نے جو مغل بادشاہ شاہ جہاں کی بیگم تھیں اور اکبر آبادی محل کے نام سے زیادہ معروف تھیں، اگست ۱۶۵۰ء (رمضان ۱۰۶۱ء ہجری) میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ ایک انتہائی وسیع اور خوشنما مسجد تھی اس کے تین اطراف حجرے بنے ہوئے تھے جو بیرونی طلباء کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں نے انتقامی طور پر اس مسجد کے آس پاس کا علاقہ تباہ کر دیا، لیکن مسجد محفوظ رہی۔ سر سید احمد جب اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' لکھ رہے تھے تو یہ مسجد موجود تھی اور انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، مہر، سید احمد شہید، ۷۴ تا ۷۶)۔ اس مسجد اور اس پر لکھے کتبہ کی تصاویر ''نادر مکتوبات''، جلد اول کے صفحہ ۱۲۸ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۱۰) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک مکتوب میں اپنے ایک خواب کا ذکر فرمایا ہے جس میں سید صاحبؒ کی طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ انہوں نے خواب میں ایک سولہ (۱۶) سالہ نوجوان کو دیکھا جسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک مسجد میں پیش کیا گیا جو یا تو دہلی کی جامع مسجد تھی یا اکبری مسجد۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے فرمایا کہ وہ اس نوجوان کو خرقہ پہنائیں۔ حکم کی اطاعت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی چادر اس نوجوان کو اڑھا دی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بھی اس نوجوان کو اپنا خرقہ عنایت فرمایا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس نوجوان کو نہیں پہچانا۔ وہ اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ''دیکھنا چاہئے کہ دوست کس سے محبت فرماتا ہے اور اس کے دل کا رجحان کس کی طرف ہے۔'' مولانا نور الحسن کاندھلوی نے اپنے ایک مضمون ''شاہ ولی اللہؒ کے ایک خواب کی تعبیر: سید احمد شہیدؒ'' (الفرقان: فروری ۱۹۹۰ء) میں اس خواب کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواب میں نظر آنے والے نوجوان اور سید احمد شہیدؒ میں بہت ہی واضح مماثلت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ انہیں اس لئے نہیں پہچان سکے کہ ان کی پیدائش (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں سید صاحبؒ کا برسوں معمول صلوٰۃ العشاء کے وضوء سے صلوٰۃ الفجر ادا کرنے کا تھا۔ اس طرح ان کی پوری رات عبادت الٰہی میں بسر ہوتی تھی۔ (۱۱) تہجد میں طویل قیام کی وجہ سے ان کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔ جلد ہی ان کا اخلاص، للٰہیت اور ذوق عبادت رنگ لایا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آثار قبولیت ظاہر ہونے لگے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی نگرانی اور رہنمائی نے سید صاحبؒ کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی، حتیٰ کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی نگاہ جوہر شناس نے ان کی روحانی صلاحیت اور باطنی ترقی کا ادراک کیا اور انہوں نے سید صاحبؒ کے لئے توصیفی کلمات فرمائے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے بھتیجے حضرت شاہ اسماعیلؒ سے فرمایا کہ سید صاحبؒ کو طریق نبوت سے غایت درجہ کی مناسبت ہے جس کی وجہ سے وہ کسی ایسے عمل کو ہرگز قبول نہیں کرتے جو شریعت کی نگاہ میں پوری طرح مستند نہ ہو۔

سید صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا اور باطنی ترقی میں ان کی رفتار بہت تیز اور پرواز نہایت بلند تھی۔ ان دنوں وہ ایسے مبارک خوابوں سے مشرف ہوئے جن سے ان کے تزکیۂ نفس اور روحانی بلندی کی تصدیق ہوتی تھی۔ ایک بار انہوں نے خواب دیکھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ انہیں اپنے ہاتھوں سے غسل دے رہے ہیں، جیسے باپ اپنے بچوں کو نہلاتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انہیں اپنے ہاتھوں سے ایک لباس فاخر پہنایا۔ دوسرے موقع پر ستائیس رمضان المبارک ۱۲۲۲ھ (مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۰۷ء) کی شب میں سید صاحبؒ رات کے اخیر حصہ میں اس طرح نیند سے بیدار ہوئے جیسے انہیں جگایا گیا ہو۔ آنکھ کھولنے پر انہوں نے اپنے سامنے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود پایا۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) شاہ صاحبؒ کے انتقال کے پچیس (۲۵) سال بعد ہوئی تھی۔ جب سید صاحبؒ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوئے تھے تو ان کی وہی عمر تھی جو خواب میں اس نوجوان کی تھی۔ سید صاحبؒ کا تعلق دہلی کے قیام میں اکبری مسجد اور جامع مسجد دہلی سے رہا تھا جو خواب میں شاہ ولی اللہ نے دیکھا تھا۔ ان کا حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے روحانی استفادہ کرنا گویا حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہی استفادہ کرنا تھا، اس لئے کہ شاہ عبد العزیزؒ حقیقتاً شاہ ولی اللہؒ کی روحانی وراثت کے امین تھے۔ خواب میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اس نوجوان کو خرقہ عطا فرمانا اسی روحانی استفادہ کی طرف اشارہ تھا جو شاہ عبد العزیزؒ کے ذریعہ سید صاحبؒ کو عطا ہوا۔ نثار احمد فاروقی، مولانا نور الحسن کاندھلوی کی ان تعبیرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان سے اختلاف کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ ("نادر مکتوبات"، جلد اول، ۱۲۶ تا ۱۲۸)۔

(۱۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۱ اور ۸۱۳۔

ان سے کہا گیا: "احمد! جلد اٹھ اور غسل کر۔ آج شب قدر ہے۔ یادالٰہی میں مشغول ہو اور دعاء ومناجات کر۔"

سید صاحبؒ اٹھ کھڑے ہوئے، غسل کیا، اور نماز اور دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ وہ رات ان کے لئے بڑے خیر و برکت کی رات ثابت ہوئی۔ وہ ایسے روحانی تجربات سے دوچار ہوئے جو ان کے لئے بالکل نئے تھے۔ انہوں نے اپنے اندر ایک انتہائی طاقتور قوت ادراک جاگتی ہوئی محسوس کی جس کی وجہ سے انہوں نے اس طرح چٹانوں اور درختوں کو اللہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہوتے دیکھا اور اللہ کی تسبیح اور حمد وثنا کرتے سنا، جسے بیان کرنے سے انسانی زبان قاصر ہے۔ یہ تجربہ شک وشبہ سے بالکل پاک اور سوفی صدی یقینی تھا، لیکن اتنا عجیب تھا کہ وہ خود اس کا یقین کرنے سے قاصر تھے کہ جو کچھ انہوں نے اس شب میں دیکھا وہ خواب تھا یا حقیقت۔ صبح کو انہوں نے پورا واقعہ اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو سنایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ انتہائی مسرور ہوئے اور سید صاحب کو ان الفاظ میں مبارکباد دی: "اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں فقیر پایا اور بادشاہ بنا دیا۔" اس واقعہ کو سید محمد علیؒ نے، جو سید صاحبؒ کے ابتدائی سوانح نگاروں میں ہیں، منظوم شکل میں اپنی کتاب "مخزن احمدی" میں محفوظ کر دیا ہے۔ (۱۲)

رائے بریلی کی واپسی

سید صاحبؒ لکھنؤ سے دہلی اچانک آ گئے تھے۔ معرفت الٰہی کی طلب انہیں حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی خدمت میں کھینچ لائی تھی۔ اب جب کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا، انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے وطن واپس ہونے کی اجازت چاہی اور ۱۸۰۷ء کے آخر یا ۱۸۰۸ء کے آغاز میں (۱۲۲۲ھ یا ۱۲۲۳ھ) وطن واپس ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ ۱۸۰۸ء میں ان کی شادی سیدہ زہراء سے، جو نصیر آباد کی تھیں، ہوئی۔ اگلے سال ان کے گھر ایک بچی کی ولادت ہوئی جن کا نام سارہ رکھا گیا۔ (۱۳) رائے بریلی کے قیام کے دوران وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے ہونگے۔ تاریخ کے صفحات میں ہمیں اس دور کی ایسی تفاصیل نہیں ملتیں جن سے پتہ چلے کہ اس وقت ان کے ذہن میں ہندوستان میں احیاء اسلام کا کیا خاکہ تھا۔ مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحبؒ کا قیام دائرہ شاہ علم اللہ میں مئی ۱۸۱۱ء (ربیع الآخر

---

(۱۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۲۲ تا ۱۲۳ اور مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۲۔

(۱۳) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۳۔

۱۲۲۶ھ) تک رہا۔ اس کے بعد انہوں نے وطن چھوڑا اور طویل سفر کرکے امیر خان (جو بعد میں نواب امیر خان، والئ ٹونک کی حیثیت سے جانے گئے) کی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ (۱۴) ان کے ذہن میں امیر خان کو ہندوستان میں احیاء اسلام کے لئے تیار کرنے کا ایک واضح خاکہ ضرور رہا ہوگا جس پر عمل کرنے کی خاطر انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

امیر خان کی فوج میں

سید صاحبؒ جیسے صاحب ضمیر اور احساس ذمہ داری رکھنے والے شخص کے لئے اس دور میں مسلمانوں کی زبوں حالی یقیناً انتہائی افسوس ناک تھی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی نقشے پر خصوصاً تین ایسی اہم طاقتیں ابھر آئی تھیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کرکے اپنے لئے جگہ بنانا چاہتی تھیں، اور وہ طاقتیں تھیں مرہٹہ، سکھ اور انگریز۔ مرکزی ہندوستان اور دکن میں مرہٹہ سرداروں نے اپنی آزادانہ طاقت بہت بڑھالی تھی اور پنجاب میں سردار رنجیت سنگھ نے ایک سکھ ریاست کی بنیاد ڈال دی تھی۔ انگریزوں نے مختلف ریاستوں میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں۔ انہوں نے کرناٹک، بہار، بنگال اور اڑیسہ کو زیر نگیں کرلیا تھا اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کی شہادت کے ساتھ ان کی ریاست میسور کو اپنی سیاسی قوت کے زیر اثر لاکر ایک بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ہندوستان میں دو مسلم ریاستیں اس وقت بھی تھیں، ایک دکن جہاں نظام کی حکومت تھی اور دوسری اتری ہندوستان کا صوبہ اودھ۔ لیکن یہ دونوں حکومتیں انگریزوں کے سامنے سپر ڈال چکی تھیں۔ دہلی پر اب بھی مغل بادشاہ شاہ عالم کی حکومت تھی لیکن وہ پورے طور پر انگریزوں کے گرفت میں تھا۔ مسلمانان ہند کو جو سیاسی بساط پر مات کھانے کی وجہ سے اب گونا گوں مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کا شکار تھے، اس صورت حال سے نکالنے والی کوئی مسلم قیادت سامنے نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت اگر کوئی قائد اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اہل تھا تو وہ امیر خان تھا جس نے اپنی زبردست فوجی طاقت سے ہندوستان میں اپنا دبدبہ بنا رکھا تھا اور جو ہر سیاسی بندھن اور گٹھ جوڑ سے بالکل آزاد تھا۔

امیر خان روہیل کھنڈ کے افغان سردار محمد حیات خان کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بہادر اور بے خطر نوجوان تھا اور سپہ گری اور مہم جوئی کا فطری ذوق رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے بیس برس کی عمر میں گھر چھوڑا اور نئے میدان کی تلاش میں نکل پڑا۔ جلد ہی اس نے جنگجو سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے

---

(۱۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۵۔

گرد جمع کرلی اور ایک ایسی آزاد فوجی طاقت بن کر ابھرا جسے وقت کے حکم رانوں نے تسلیم کیا۔ چنانچہ جب مرہٹہ اور راجپوت حکمرانوں کو آپسی تنازعات میں فوجی مدد کی ضرورت پڑتی تو وہ امیر خان کی فوجی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ امیر خان اس سردار کا ساتھ دیتا جو اسے زیادہ معاوضہ پیش کرتا۔ اس کی فوجی قوت واہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک زمانہ میں اس کی فوج میں پچاس ہزار گھوڑسوار، بارہ ہزار پیدل سپاہی، اور ڈیڑھ سو توپیں تھیں۔ اس کی فوجی قوت اور باصلاحیت قیادت کا شہرہ ہندوستان سے باہر بھی پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء (۱۲۲۹ھ) میں والی کابل شاہ شجاع الملک نے اسے اپنی مدد کے لئے کابل بلایا تھا۔ نصیر خان، والی بلوچستان کی بیوی نے بھی اسے اپنی مدد کے لئے بلوچستان طلب کیا تھا۔ (۱۵)

گرچہ امیر خان کی صلاحیت وقوت حقیر مقاصد کی نذر ہورہی تھی، تاہم وہ اس وقت ایک ایسا آزاد مسلم رہنما تھا جو اگر ہندوستان کی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی حمایت کے لئے ایک منظم اور مربوط پروگرام بناتا تو وہ مسلمانوں کے سب سے طاقتور دشمن، انگریزوں سے بھی لوہا لے سکتا تھا۔ وہ والی کابل شاہ شجاع کو انگریزوں کے خلاف اپنے ساتھ لے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ہزاروں کی تعداد میں یوسف زئی نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرسکتا تھا جو اس کے ہم وطن تھے۔ مزید برآں امیر خان سے احیاء اسلام کے مقصد میں تعاون اور شمولیت کے لئے بجا طور پر امید کی جاسکتی تھی۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ امیر خان ایک باعمل مسلمان تھا اور دین کے لئے احترام کا جذبہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سید صاحبؒ کے خاندان سے بھی واقف تھا اور اس خانوادے کی دینی حیثیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر سید صاحبؒ نے امیر خان کی معیت اختیار کی اور احیاء اسلام کی اپنی کوششوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسے ساتھ لینا چاہا تو یہ ایک دانشمندانہ اور عملی قدم تھا۔ (۱۶)

سید صاحبؒ بہت جلد امیر خان کی فوج میں ایک برگزیدہ اور مستجاب الدعوات شخص کی حیثیت سے جانے جانے لگے۔ سپاہیوں کا ان کی طرف رجوع ہوا اور وہ ان کی خدمت میں دعاؤں کی درخواست لے کر آنے لگے۔ سید صاحبؒ ایسے لوگوں کی دلجوئی فرماتے اور ان کے حق میں دعاء کرتے۔ لیکن اس سے بڑھ کر وہ ان کے ایمان وعمل کی فکر کرتے اور انہیں صحیح راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے۔ مثال کے طور پر جب ایک بیمار شخص نے ان سے صحت کے لئے دعاء کی

(۱۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۲۸۔ (۱۶) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۸۔

درخواست کی تو انہوں نے فرمایا: ''اگر تم سب برے کاموں سے توبہ کرو اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا اقرار کرو تو میں اپنے شافی مطلق اور معبود برحق سے دعاء کروں، وہ اپنی عنایت بے نہایت سے شفا بخشے۔'' اسی طرح مراد بخش نامی ایک غریب تاجر سے جو رزق میں برکت کی دعاء کی خاطر حاضر ہوا، فرمایا: ''آج سے اپنا نام اللہ بخش رکھو اور سب برے کاموں سے تائب ہو، پانچوں وقت نماز پڑھو، جھوٹ نہ بولو، دغا فریب جان بوجھ کر نہ کرو، اپنا مال کسی کو کم نہ دو اور کسی غیر کا زیادہ نہ لو۔'' ایک ایسے ہی ضرورت مند دعاء جو سے فرمایا: ''شرک کے اقوال، افعال چھوڑ دو، یہی نصیحت ہے۔'' انہوں نے مزید فرمایا: ''نصیحت ہماری مانو اور سچ جانو تو اللہ تعالی تمہارا دین دنیا میں بھلا کرے گا''۔ اللہ تعالی کے فضل سے سید صاحبؒ کی دعاؤں کی برکت سے بیمار شفا پاتے، معاشی تنگی سے بدحال لوگوں کو وسعت و برکت حاصل ہوتی، اور دیگر ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر ان کے ایمان کی اصلاح ہوتی، وہ بری عادات سے تائب ہوتے اور دین کے راستے پر پڑ جاتے۔ (۱۷)

سید صاحبؒ نے امیر خان کے ساتھ اپنے تعلق میں بھی انہیں مقاصد کو سامنے رکھا۔ امیر خان نے انہیں اپنے مشیروں میں شامل کر لیا تھا۔ سید صاحبؒ روزانہ امیر خان کے پاس جاتے اور مشورہ کی نشستوں میں شریک ہوتے۔ (۱۸) اس بات کی تحقیق مشکل ہے کہ سید صاحبؒ نے نجی ملاقاتوں میں امیر خان کو ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے تئیں اس کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کیا کوششیں کیں، لیکن ان کی فوج میں موجودگی بذات خود امیر خان کے لئے اسلام کی تعلیمات کی یاددہانی کا ایک مضبوط ذریعہ تھی۔ جے پور کے جنگ کے موقع پر یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے۔ اس جنگ میں امیر خان نے اپنے ایک کمانڈر محمد عمر خان کو ایک نالہ میں مورچہ قائم کرنے کی ہدایت دی۔ یہ مقام میدان جنگ میں خطرناک اور غیر محفوظ تھا جس کی وجہ سے عمر خان آگے بڑھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ سید صاحبؒ امیر خان کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے عمر خان کے ساتھ آگے بڑھ کر نالے میں مورچہ بنانے کے لئے خود کو پیش کیا، لیکن امیر خان انہیں اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ تب سید صاحبؒ، عمر خان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''بھائی صاحب! خدا کو یاد کیجئے، کوئی بے موت نہیں مرتا، ان شاء اللہ تعالی آپ کی فتح اور دشمن کی شکست ہے۔'' اس کے فوراً بعد یہ خبر آئی کہ مخالف فوج کا کمانڈر چاند سنگھ تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بہت

(۱۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۳۱۔۱۳۲۔ (۱۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۰۱۔

قریب پہنچ چکا ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ سید صاحبؒ نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے مدد کے لئے پراثر دعاء کی جس میں سب شریک تھے۔ اس کے بعد انہوں نے امیر خان کو مشورہ دیا کہ وہ خود چھ گھوڑ سواروں کے ساتھ آگے بڑھ کر تحقیق کریں گے اور اگر موقعہ سازگار ہوا تو وہ باقی فوج کو آگے بڑھنے کا اشارہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ (۱۹)

اس مقام پر سید صاحبؒ ایک حوصلہ مند سپاہی کی حیثیت سے جو خطرات میں آگے بڑھنے کی ہمت رکھتا ہو سامنے آتے ہیں اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ امیر خان ان پر اس درجہ اعتماد کرتا تھا کہ وہ عین میدان جنگ میں ایک جنگی قدم اٹھانے کا مشورہ دیتے ہیں جسے امیر خان قبول کر لیتا ہے اور اسی پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن اس صورت حال کا مزید گہرائی سے کیا گیا تجزیہ یہ حقیقت بھی سامنے لاتا ہے کہ جنگ کے فیصلہ کن لمحات میں بھی وہ کس طرح اسلامی اقدار کو اجاگر کرتے ہیں۔ عمر خان کو اللہ کی بڑائی کی یاددہانی، موت سے نہ ڈرنے کی ترغیب، موت کا ایک وقت موعود ہونے کی تلقین، اور میدان جنگ میں ایک مشکل لمحہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا، دعاء مانگنا اور اعانت طلب کرنا ــــ یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے یقیناً سالار فوج امیر خان، کمانڈر عمر خان اور سپاہیوں کو یکساں طور پر متاثر کیا ہوگا اور ان کے ذہنوں میں اسلامی اقدار کو اجاگر کیا ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ سید صاحبؒ کی کوششوں سے امیر خان میں کوئی اہم فکری انقلاب رونما ہوتا، ہندوستان کی سیاسی بساط پر ایک بڑی سیاسی تبدیلی سامنے آئی جس کے زیر اثر امیر خان نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ اس وقت تک پیشوا، سندھیا اور ہلکر انگریزوں سے معاہدہ کر چکے تھے۔ اور دوسری کئی ریاستیں بھی انگریزوں کے سامنے سپر ڈال چکی تھیں۔ اس طرح امیر خان انگریزوں کے مقابلے میں تنہا رہ گیا۔ اسے تنہا پا کر انگریزوں نے اس کے خلاف ایک فوج روانہ کی اور جب وہ مدھوپوری کی مہم میں مشغول تھا تو انگریزی فوج نے تین اطراف سے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اب امیر خان نہ تو پنڈارہ قبائل سے فوجی مدد حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی سندھیا یا ہلکر سے اسے مدد مل سکتی تھی۔ خود اس کی فوج میں بھی انگریزوں نے غداری اور بغاوت کا بیج بو دیا تھا۔ جیسے ہی انگریزی فوج امیر خان کی طرف بڑھی، امیر خان کے ایک قدیم سپہ سالار فیض اللہ بنگش نے انگریزی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہو گیا۔ (۲۰) امیر خان کو اس طرح دباؤ میں لے کر انگریزوں نے اس کے سامنے معاہدہ کر لینے کی پیش کش کی۔ امیر خان نے انگریزوں

---

(۱۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۳۵-۱۳۶۔ (۲۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۳۸۔

سے صلح کر لی اور معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد اسے ٹونک کا نواب بنا دیا گیا اور پلول کا علاقہ بھی اس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ (۲۱)

سید صاحبؒ نے شروع سے ہی امیر خان کے انگریزوں سے معاہدے کی شدید مخالفت کی اور اس کو حوصلہ رکھنے اور انگریزوں سے لڑنے کی ہر ممکن ترغیب دی۔ لیکن امیر خان حوصلہ ہار چکا تھا اور اسے خود اپنے ساتھیوں اور فوج کی وفاداری پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً سید صاحبؒ نے امیر خان کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ آخری بار امیر خان سے ملے اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور اس نے غم زدہ لہجے میں کہا: ''جو کچھ تقدیر میں تھا وہی ہوا۔ حکم الٰہی سے چارہ نہیں۔ اب جب آپ دہلی جاتے ہیں تو صاحبزادہ محمد وزیر خان کے ہمراہ جایئے۔''

اس کے بعد سید صاحبؒ نے امیر خان سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے شیخ و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضری کی نیت سے دہلی روانہ ہو گئے۔ سید صاحبؒ کا امیر خان کا اس وقت ساتھ چھوڑنا جب امیر خان نواب بنا دیئے گئے تھے اور معاشی خوش حالی کے دروازے ان پر کھل چکے تھے، یہ ثابت کرتا ہے کہ سید صاحبؒ نے مال و دولت اور عہدہ و رتبہ کے لئے امیر خان کا ساتھ اختیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے لشکر سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو ایک مکتوب میں اپنی دہلی واپسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا: ''یہاں کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔''(۲۲) اس طرز تحریر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ سید صاحبؒ کے سامنے ایک دوسرا نصب العین تھا جو امیر خان کی انگریزوں سے مصالحت اور ان کے نواب بن جانے سے میل نہیں کھاتا تھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں واپسی

سید صاحبؒ کے اس بار دہلی کے قیام کے دوران ان کی طرف غیر معمولی طور پر رجوع خاص و عام ہوا۔ اس وقت کے ہندوستان کے چوٹی کے علماء، مولانا شاہ محمد اسماعیلؒ، مولانا عبدالحی بڈھانویؒ، مولانا شاہ اسحٰقؒ اور مولانا یوسف پھلتیؒ نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور انہیں اپنا مرشد و مقتدا تسلیم کیا۔ پھر ان کی بیعت میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مکمل تائید و ترغیب شامل تھی۔ یہ خبر پورے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اس طرح حضرت سید صاحبؒ

---

(۲۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۰۷۔۱۰۹۔ (۲۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۴۰۔

حقیقتاً پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی محبت وعقیدت کا مرکز بن گئے۔ دہلی کا تو پوچھنا ہی کیا، بیرون دہلی سے لوگوں نے آ آ کر ان کے دست حق پر توبہ کی۔ جو سفر کر سکتے تھے انہوں نے اس مبارک مقصد کے لئے دہلی کا سفر کیا۔ جو کسی وجہ سے سفر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، انہوں نے خطوط کے ذریعہ سید صاحبؒ سے اپنے علاقوں میں تشریف لانے کی استدعا کی تا کہ وہ ان کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں۔ جلد ہی ایسے خطوط کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی۔ سید صاحبؒ نے وہ سارے خطوط اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں بھیج دئے اور ان سے راہنمائی کی درخواست کی۔

پہلا دعوتی سفر

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ان خطوط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف سید صاحبؒ کو دعوتِ دین اور اصلاح معاشرہ کے مقصد سے سفر کی اجازت دی، بلکہ اس موقع پر انہیں اپنا خرقہ بھی عنایت فرمایا جو رسم زمانہ کے مطابق ایک شیخ اپنے کسی مرید کو اپنی تائید کے طور پر دیتا تھا۔ سید صاحبؒ نے بیس رفقاء کے ساتھ اس علاقے کا سفر شروع کیا جسے گنگا اور جمنا کا درمیانی حصہ ہونے کی وجہ سے دوآبہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ مشہور مقامات جہاں سید صاحبؒ گئے، ان میں غازی آباد، میرٹھ، بڑھانہ، پھلت، دیوبند، مرادنگر، سردھنہ، سہارنپور، مظفرنگر، انبیٹھ، نانوتہ اور گنگوہ کا نام آتا ہے۔ انہوں نے میرٹھ، دیوبند اور سہارنپور کے اطراف کے علاقوں کا بھی دورہ کیا۔

سید صاحبؒ جہاں گئے، ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد از راہ شوق ومحبت اپنے شہروں اور بستیوں سے باہر نکل کر ان کا خیر مقدم کرتی۔ ہر چھوٹے بڑے مقام پر لوگوں کا ہجوم اُمڈ آیا۔ لوگ بیعت سے مشرف ہوئے، غلط عقائد سے توبہ کی، گناہ اور برائی کے کام ترک کئے اور نیکی، دین داری اور تقویٰ کی زندگی اختیار کی۔ سہارن پور میں شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ نے جو مشہور شیخ وقت تھے اپنے سارے مریدوں کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب سید صاحبؒ ایک مقام سے دوسرے مقام کے لئے روانہ ہوتے تو لوگ میلوں ساتھ جاتے اور اشکبار آنکھوں سے رخصت کرتے۔ جب وہ میرٹھ سے روانہ ہونے لگے تو سیکڑوں لوگ بے اختیار ہو کر رو پڑے۔ سید صاحبؒ پر بھی اثر تھا۔ انہوں نے لوگوں سے تسلی وتشفی کے الفاظ کہے لیکن جدائی کے وقت خود ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ (۲۳)

(۲۳) سفر کی تفصیلات سیرت سید احمد شہیدؒ از ندوی، حصہ اول، صفحات ۱۵۱ تا ۱۷۲ سے لی گئی ہیں۔

سید صاحبؒ مسلمانوں کو قرآن وسنت کی صحیح اور سچی تعلیمات کو اپنانے اور ہر طرح کی غیر اسلامی افراط وتفریط کو چھوڑ دینے کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ جب لوگ ان کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے، اور ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں آتے، تو سید صاحبؒ دو باتوں پر ان سے بیعت لیتے: اول توحید وسنت پر عمل، اور دوئم، شرک وبدعت سے اجتناب۔ سید صاحبؒ جہاں بھی اس پیغام کے ساتھ پہنچے وہاں دینی شعور کی بیداری اور روحانی خیر وبرکت کی ایک فضا قائم ہوگئی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے والد مولانا ذوالفقار علیؒ فرماتے ہیں: ''سید صاحب اس نواح (دیوبند وسہارنپور) کے اکثر حصہ جات میں تشریف لے گئے۔ وہاں اب تک خیر وبرکت ہے۔۔۔ گویا کہ ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر جدھر وہ گئے، ادھر ادھر وہ پھیل گیا ہے۔'' (۲۴) اس سفر میں چھ ماہ کا وقت لگا۔ یہ سفر نومبر ۱۸۱۸ء میں شروع ہوا اور مئی ۱۸۱۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔ سفر سے واپسی پر سید صاحبؒ دہلی تشریف لائے۔ (۲۵) کچھ دنوں کے بعد انہوں نے رائے بریلی کا سفر فرمایا۔

دوسرا دعوتی سفر

سید صاحبؒ نے دعوتی اور اصلاحی مقاصد سے دوسرا عمومی سفر رائے بریلی کے مشرقی علاقے کا کیا جس میں انہوں نے سلون، اہلادگنج، الہ آباد، بنارس اور ان سے ملحقہ علاقوں کا دورہ کیا۔ سلون میں حضرت شاہ کریم عطاءؒ، جو ایک صاحب طریقت بزرگ اور ایک خانقاہ کے سربراہ تھے، حضرت سید صاحبؒ کے میزبان ہوئے۔ وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر توبہ کی اور بیعت سے مشرف ہوئی جن میں حضرت شاہ کریم عطاءؒ کے کئی اہل خانہ بھی شامل تھے۔ اہلادگنج میں کاظم بیگ جو والئی لکھنوء کی طرف سے وہاں تحصیلدار مقرر تھے، اپنے رفقاء کے ساتھ حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے۔ الہ آباد میں حضرت شاہ رحمٰنؒ، جو وہاں کے ایک بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے، سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے میزبان ہوئے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے سید صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں پر توبہ کی اور اسلام کی صحیح تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ یہیں شیخ غلام علی، جو شہر کے ایک نامور شخص تھے، سید صاحبؒ

---

(۲۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۷۲۔

(۲۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۲۵۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے صفحات ۱۲۴ تا ۱۳۰۔

سے ملے اوران کے دست حق پر توبہ کر کے بیعت سے مشرف ہوئے۔ وہ امیرانہ طرز زندگی کے عادی اور عیش وآرام کے دلدادہ تھے اور راگ ورنگ کے شوق میں انہوں نے بیش قیمت آلات موسیقی جمع کرر کھے تھے۔ بیعت کے بعد دل کی حالت ایسی بدلی کہ قیمتی سے قیمتی آلات موسیقی کو توڑ کر دریا برد کر دیا، کھانے پینے کے سارے سونے چاندی کے ظروف الگ کر دیئے اور نہایت سادہ زندگی اختیار کر لی۔

بنارس میں سید صاحبؒ اوران کے قافلہ نے شہر کی بادشاہی مسجد میں قیام کیا۔ مسجد غیر آباد اور نہایت خستہ حالت میں تھی۔ سید صاحبؒ اوران کے ساتھیوں نے مسجد کو اچھی طرح صاف کیا اور اسے خوب دھویا۔ ساکنان شہر نے قافلے کا خیر مقدم کیا۔ مسجد میں باقاعدہ نماز کا نظم ہو گیا۔ مسجد ہی میں مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کا وعظ ہوتا جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات پیش کی جاتیں۔ اہل شہر دین کی ضروری باتوں سے بھی ناواقف تھے۔ ان کے لئے سید صاحبؒ کا ورود ایک نعمت عظمیٰ ثابت ہوا۔ سید صاحبؒ نے بنارس کے اطراف کے کئی گاؤں کا بھی دورہ کیا اور ہر جگہ توحید وسنت کے اپنانے اور شرک وبدعت کے ترک کرنے پر لوگوں سے بیعت لی۔ اس سفر میں ان کے قافلہ میں ایک سوستر (۱۷۰) افراد شامل تھے۔ (۲۶)

تیسرا دعوتی سفر

اس کے بعد ہی سید صاحبؒ نے تیسرا دعوتی سفر لکھنؤ کا فرمایا جہاں انہوں نے توحید وسنت کی دعوت دیتے ہوئے لوگوں کو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی طرف پوری ہمت وقوت سے متوجہ کیا۔ ان دنوں نواب غازی الدین حیدر لکھنؤ کے حکمران اور نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم تھے۔ سید صاحبؒ کی شہر میں آمد نے غفلت میں ڈوبے لوگوں کو جگانے کا کام کیا۔ مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کے وعظ میں لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوتے۔ چند ہی دنوں میں نو، دس ہزار مسلمانوں نے سید صاحبؒ کے دست حق پر توبہ کی اور اسلامی طرز زندگی اختیار کی۔ لوگوں کے جوش وطلب کو دیکھ کر سید صاحبؒ نے لکھنؤ میں مزید قیام کا فیصلہ فرمالیا۔

سید صاحبؒ کو مختلف مقامات پر بلایا جاتا۔ وہ جہاں بھی جاتے مسلمانوں کو قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل کرنے اور شرک وبدعت کے اعمال سے بچنے کی دعوت دیتے۔ بعض مقامات پر

---

(۲۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۱۸۱ تا ۱۸۸۔

انہوں نے دیکھا کہ سُنّی مسلمان اپنے گھروں میں کھلونے اور آرائش کی ایسی چیزیں رکھتے ہیں جن پر تصویریں بنی ہوتی ہیں، تعزیہ بناتے ہیں، چبوترہ قائم کرتے ہیں اور ایسے دوسرے اعمال اس اعتقاد اور اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں جو صرف شرعی احکام کا حق ہیں۔ یہ دین سے انحراف تھا۔ سید صاحبؒ نے ضبط وحکمت کے ساتھ، لیکن صاف اور واضح طریقے سے ایسے سارے اعمال کے خلاف جن کی اصل شریعت میں نہیں تھی آواز بلند کی اور اخلاقی ومعاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کو یکسر چھوڑ دینے کی تلقین کی۔ مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانے پر اصلاح ہوئی۔ لکھنؤ کی فضا بدل گئی اور شریعت پر اعتماد اور اس کے احکام پر عمل کی لہر سی چل پڑی۔ جس مسجد میں مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کا جمعہ کو خطبہ ہوتا تھا، وہاں نمازیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جگہ نہ رہی۔ لوگ قریب قریب صف بناتے اور ایک دوسرے کے پشت پر سجدہ کرتے۔ (۲۷)

مولانا عبدالحیؒ کے خطبات میں شہر کے شیعہ حضرات بھی شامل ہوتے اور توجہ سے دین کی باتیں سنتے۔ نتیجتاً ان میں سے کچھ لوگ سنی عقیدے سے مطمئن ہوجاتے اور اسے اختیار کرلیتے۔ یہ بات شیعہ علماء کے لئے تشویش کا باعث بن گئی۔ ان کے ایک وفد نے لکھنؤ کے وزیر اعظم نواب معتمد الدولہ سے ملاقات کی اور زور دیا کہ سید صاحبؒ شیعہ حضرات کو سُنّی عقیدہ میں داخل کرنے کا سلسلہ فوراً روک دیں۔ نواب معتمد الدولہ نے اس مضمون پر مبنی ایک حکم نامہ سید صاحبؒ کے پاس بھیج دیا۔ سید صاحبؒ نے جواب دیا کہ جس عقیدے کو وہ صحیح سمجھتے ہیں، اس کی تعلیم دینا ایک دینی فریضہ ہے جسے بادشاہ وقت کے حکم کی وجہ سے ترک کرنا غیر شرعی عمل ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جس بات کو وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی تعلیم سمجھتے ہیں، اسے کسی شخص کو بتانے سے صرف اس لئے اجتناب کرنا کہ وہ شیعہ عقیدہ کا پیرو ہے، وہ غلط سمجھتے ہیں۔ نواب معتمد الدولہ نے طاقت کے استعمال کی دھمکی دی، لیکن سید صاحبؒ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ بعد میں جب نواب کو اپنے ذرائع سے سید صاحبؒ کی للّٰہیت کے بارے میں اطلاع ملی اور اسے احساس ہوا کہ سید صاحبؒ کا معاملہ مکمل طور پر اخلاص پر مبنی ہے تو اس نے کھوئے ہوئے باہمی اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کی، سید صاحبؒ کو اپنے یہاں دعوت پر مدعو کیا، ان سے نیازمندی کا اظہار کیا، اور نذرانہ پیش کیا۔ لکھنؤ سے روانگی کے قبل سید صاحبؒ نواب سے ملنے دوبارہ تشریف لے گئے۔ نواب نے سارے فواحش ومنکرات سے توبہ کی۔ سید صاحبؒ نے نواب کو ایک بیش قیمت گھوڑی تحفتاً عنایت فرمائی۔

(۲۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۰۱۔

لکھنؤ سے واپسی کے بعد سید صاحبؒ نے اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ میں تقریباً ایک سال قیام فرمایا۔ ان کے قیام کی اطلاع پا کر مسلمان مرد و عورتیں دور و نزدیک سے دائرہ آنے لگے۔ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ عورتیں سید صاحبؒ کے ذاتی مکان میں مہمان ہوتیں۔ اس مجبوری کی وجہ سے انہوں نے اپنے اہل خانہ کے لئے ایک چھوٹا سا سادہ مکان الگ بنالیا اور پہلا مکان مہمان خواتین کے قیام کے لئے وقف کر دیا۔ مردوں کے لئے مسجد میں قیام کا انتظام ہوتا تھا۔ سارے مہمانوں اور مستقل رفقاء کے قیام و طعام کا انتظام سید صاحبؒ خود فرماتے تھے۔ سید صاحبؒ شروع سے اپنے رفقاء کو ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی اس طرح تربیت کی جاسکے کہ وہ مستقبل میں اسلام کے مخلص کارکن ثابت ہوسکیں۔

حالات کا تجزیہ

سید صاحبؒ نے اپنے دعوتی اسفار میں اس بات کا بہت واضح طور پر مشاہدہ کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا تنزل اس سے زیادہ وسیع، گہرا اور مستقبل کے پیش نظر خوفناک تھا جو عمومی طور پر نظر آرہا تھا۔ مسلمان سیاسی طور پر اپنی طاقت کھو چکے تھے جس کی وجہ سے ان کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا اور خود اعتمادی بری طرح مجروح ہو چکی تھی۔ اب وہ اسی سرزمین پر ذلت و شرمندگی سے دوچار تھے جہاں انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ گرچہ ہندوستان میں اب بھی مغل بادشاہ شاہ عالم کی حکومت تھی جس کے دور میں سید صاحبؒ پیدا ہوئے تھے، لیکن وہ انگریزوں کے شکنجے میں بے بس تھا۔ ۱۷۶۵ء (۱۱۷۹ھ) میں بہار، بنگال اور اڑیسہ کی ریاستیں انگریزوں کے قبضہ میں جا چکی تھیں اور بنارس اور غازی پور بھی انگریزوں کو دیے جا چکے تھے۔ مغل تاجداروں کے جانشیں شاہ عالم کے پاس اب صرف الہ آباد رہ گیا تھا۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر نامی ایک روہیلہ سردار نے دہلی پر حملہ کر کے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، مغل بادشاہ کو دہلی کی گلیوں میں گھسیٹا اور اس کی آنکھیں نکلوادیں۔ انگریزوں نے غلام قادر کو دہلی سے نکالا اور حکومت وقت کے سرپرست کی حیثیت حاصل کر لی۔ انہوں نے شاہ عالم کو حکمراں کی حیثیت سے بحال رکھا اور اس کے لئے پنشن مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سیاسی اقتدار انگریزوں کی طرف منتقل ہو گیا اور شاہ عالم کی حکومت قلعہ معلّٰی کی چہار دیواری کے اندر محصور ہو کر رہ گئی۔

قوت پانے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک اپنا قبضہ جمانے کے لئے نہ صرف پوری کوشش شروع کر دی بلکہ ایک ایسا نظام لاگو کرنا شروع کیا جس سے

امت مسلمہ پوری طرح بے وقعت ہو کر رہ جائے۔ حالات یہاں تک بگڑے کہ بعض معاملات میں مسلمانوں کا اپنے دین پر عمل کرنا بھی انگریزوں کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا۔ مسلمانوں کو سیاسی اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے جاٹ، مرہٹہ اور سکھ بھی میدان میں آگئے۔ دکن سے دہلی تک مسلمانوں کی جان و مال مرہٹوں کے زد پر تھی اور پنجاب سے افغانستان کی سرحد تک سکھوں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا جو ہندوستان کے شمالی اور مرکزی علاقوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔

خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی اُن پر سکھ حکومت نے ایسی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جو دینی شعائر پر عمل کرنے میں براہ راست رکاوٹ تھیں۔ مساجد میں اذان دینے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی تا کہ اکالی سکھ کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ مشہور مورخ کنہیا لال لکھتے ہیں کہ مسجدوں کی بے حرمتی اور ان کو توڑنا، جن سے صرف چند مساجد ہی بچی ہوں گی، سکھ راج میں عام بات تھی۔ ہزاروں مسجدیں پنجاب میں اس دور میں توڑ دی گئیں اور مختلف مقاصد کے لئے ان کا استعمال کیا جانے لگا۔ لاہور کی بادشاہی مسجد جو حسن تعمیر کا شاہکار تھی، فوجی چھاونی میں تبدیل کر دی گئی۔ مستی گیٹ کے پاس کی مسجد کو بارود بنانے کے کارخانہ میں تبدیل کر دیا گیا اور اسی نسبت سے وہ بعد میں بارودی مسجد کے نام سے جانی جانے لگی۔ سنہری مسجد کو ایک سکھ عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ (۲۸)

پنجاب سے متصل علاقوں میں بھی پنجاب کی سکھ حکومت کی زیادتی کی وجہ سے مسلمان بدحال تھے۔ مثلاً صوبہ سرحد پشاور کے مسلمانوں کے بارے میں لے پل گریفن (Lapel Griffin) لکھتا ہے کہ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس علاقے پر حملہ لوگوں کے لئے تباہ کن ہوتا تھا۔ وہ مال و اسباب لوٹ لیتے، حتیٰ کہ گھروں کے چوکھٹ اور کھڑکیاں اکھاڑ لے جاتے۔ ان کے آمد کی خبر ملتے ہی عورتیں اور بچے علاقے سے نکل جاتے اور پورا ملک ایسا لگتا جیسے مہاجروں کی کوئی آبادی ہو۔ فوج کھڑی فصل کو بھی کاٹ لیتی یا برباد کر دیتی۔ وادی کے سرے سے دریائے سندھ تک شاید ہی مسلم آبادی کی کوئی ایسی بستی ہو جسے سکھ فوج نے لوٹا یا جلایا نہ ہو۔ (۲۹)

کشمیر (جو ان دنوں سکھ حکومت کا ایک حصہ تھا) کے مسلمانوں کی حالت بھی انتہائی اندوہناک اور درد انگیز تھی۔ کارمائیکل اسمتھ (Carmichael Smith) کشمیری مسلمانوں کے بارے میں دکھ کے ساتھ لکھتا ہے: ”جس نے بھی سنی ہے، اور آہ! کس نے وادی کشمیر کی فریاد نہیں

(۲۸) محی الدین احمد، سید احمد شہید (انگریزی)، ۱۴۹۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ یہاں اور دوسرے مقام پر میرا ہے۔ (مصنف)
(۲۹) محی الدین احمد، ۱۵۰–۱۵۱، بحوالہ A History of the Reigning Family of Lahore

سنی ہے؟ اس نے ضرور اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ ہر اس سیاح نے جسے اس علاقے کو رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں دیکھنے کا موقع ملا، وادی کے بدنصیب باشندوں کی فریاد ضرور سنی ہوگی جو سکھ حاکم کے ظلم و ستم کے خلاف تھی۔" (۳۰) سکھ مسلمان عورتوں، بچیوں اور کم عمر لڑکوں کو پکڑ کر لے جاتے اور انہیں اپنے گھروں میں بے آبروئی اور قید و غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتے۔ (۳۱)

ان سب علاقوں میں جس طرح مسلمانوں کو حکومت کی پالیسی کے تحت نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان کے دینی شعائر کو مٹایا جا رہا تھا، اس کا علم ہونے کے بعد سید صاحبؒ فطری طور پر نہایت متاثر تھے اور اس بات کو اپنا دینی فرض سمجھتے تھے کہ پنجاب اور سرحد و کشمیر کے علاقے کے مسلمانوں کی داد رسی کے لئے جو بن پڑے کریں۔ دائرہ شاہ علم اللہ میں اس قیام کے دوران یہ فکر ان کے دل و دماغ پر حاوی رہی۔ (۳۲)

چوتھا دعوتی سفر

سید صاحبؒ نے چوتھا دعوتی سفر کانپور اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں کی دعوت پر کیا۔ وہ کانپور، اکوڑا، جہان آباد، مجھاواں اور فتح پور گئے اور وہاں مسلمانوں تک اپنا دینی پیغام پہنچایا۔ ہر جگہ لوگ بڑی تعداد میں ان کے گرد جمع ہوئے، ان کے ہاتھ پر توبہ کی، بیعت سے مشرف ہوئے اور بے دینی کی زندگی چھوڑ کر شریعت کے احکام اختیار کیے۔ اپنے دعوتی اسفار میں سید صاحبؒ نے اپنے وقت کا ایک اچھا خاصا حصہ لوگوں سے ذاتی تعلق قائم کرنے اور ان کے دل و دماغ کو اپنے پیغام اور نصب العین سے مانوس کرنے میں صرف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ، جیسا ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے، ان کی تحریک ایک مقبول تحریک بن گئی اور شدید مخالفت کے باوجود ایک طویل عرصہ تک زندہ رہی۔ (۳۳)

حج کا سفر

جب سید صاحبؒ مسلمانوں کو اسلام کی سچی اور سادہ تعلیمات کو اپنانے کی دعوت دے رہے تھے، ہندوستانی مسلم معاشرہ میں حج کی فرضیت کے خلاف ایک سنگین دینی انحراف رونما ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان سے بذریعہ سمندری جہاز مکہ مکرمہ کا راستہ اس لئے مخدوش ہو گیا تھا کہ سمندر میں

---

(۳۰) بحوالہ محی الدین احمد، ۱۵۱۔

(۳۱) کنہیا لال: تاریخ پنجاب، ص ۱۸۲، بحوالہ ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۱۵۔

(۳۲) اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی حالات کے سلسلے میں ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، صفحات ۶۵ تا ۶۸ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (۳۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۵۴۔۲۵۵۔

پرتگالی اور انگریز لٹیرے حاجیوں کے جہاز پر حملہ کر دیتے تھے جس میں کبھی کبھی حاجیوں کے جہاز ڈوب بھی جاتے اور ان کی جانیں تلف ہو جاتیں۔ جہاز کبھی کسی دوسری وجہ سے بھی حادثہ کا شکار ہو جاتے۔ اس بناء پر ہندوستان کے بعض سطحی علم دین رکھنے والے علماء نے یہ فتوی دے دیا کہ چونکہ ہندوستان سے مکہ کا راستہ پر امن نہیں ہے (جو حج کی فرضیت کے لئے ایک شرط ہے)، اس لئے اب ہندوستانی مسلمانوں کے لئے حج فرض نہیں رہا۔ اس بات سے مسلمانوں میں غلط فہمی اور الجھن پیدا ہوگئی۔ مولانا عبدالحی بڈھانویؒ، مولانا شاہ اسماعیلؒ اور مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے اس فتویٰ کا رد کیا اور حج کی فرضیت ثابت کی، لیکن غلط فہمی جو پیدا کر دی گئی تھی، اس کا پورا تدارک نہ ہو سکا۔ سید صاحبؒ فطری طور پر اس صورت حال سے بہت متفکر ہوئے۔ ان کے سامنے اس کا حل یہ تھا کہ کوئی حوصلہ مند مسلمان اس طرح ہندوستان سے حج کرے کہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت کھل کر آ جائے کہ حج کے سفر میں جان و مال کے جس خطرے کی بات کہی جا رہی ہے وہ فرضی اور خیالی ہے۔

سید صاحبؒ نے اس بار گراں کو خود ہی اٹھانے کا فیصلہ فرمایا۔ انہوں نے آئندہ سال حج پر جانے کا اعلان کیا، مسلمانوں کو اپنے ساتھ حج کرنے کی دعوت عام دی، اور اس بات کا اعلان بھی فرمایا کہ اپنے سارے ہم سفر رفقاء کے اخراجات کے سید صاحبؒ ذمہ دار ہوں گے۔ اپنے پروگرام کو مشتہر کرنے کے لئے انہوں نے مختلف شہروں میں اپنے رفقاء کو خطوط لکھے کہ وہ لوگوں کو اس حج کے قافلہ میں شریک ہونے کی ترغیب دیں اور جہاں جتنے لوگ تیار ہو جائیں، انہیں ساتھ لے کر دائرہ شاہ علم اللہ آ جائیں جہاں وہ ان دنوں مقیم تھے۔ (۴۴) جب چند لوگوں نے اخراجات کے انتظام کا سوال اٹھایا تو سید صاحب نے انہیں پر سکون اور پر اعتماد لہجے میں جواب دیا: ”میں اگر عام مسلمانوں کو حج کی دعوت دیتا ہوں تو اسی رحیم و کریم خدا کے بھروسے پر دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی رحمت سے یہ کام پورا ہوگا۔“ (۴۵) ان دنوں سید صاحبؒ اپنے اہل خاندان سے فرمایا کرتے تھے: ”جب تک میں اس بریلی کے علاقے میں ہوں تب ہی تک ان سب پر تنگی و افلاس ہے۔ جس

(۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۵۴۔

(۴۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۸۲۔ اللہ والوں کے یہاں اس طرح اللہ پر توکل کی مثالیں بہ کثرت مل جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے سفر حج کے بارے میں حضرت شاہ اہل اللہ پھلتیؒ کو لکھتے ہیں: ”ہم نے دہلی سے اپنا قدم اس وقت تک نہیں نکالا جب تک کہ ہم نے یقینی طور پر یہ بات معلوم نہ کر لی کہ حضرت حق تعالیٰ جانے آنے میں پوری پوری آسانی اور آسودگی شامل حال کرے گا۔ اور اس بات کو یقین کے ساتھ جان لینا بار بار کے الہام اور مسلسل ذوق و شوق کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔“ نادر مکتوبات، جلد اول، ۱۶۸۔۱۶۹۔

وقت میں ان کو ساتھ لے کر باہر ہوا تب ان کا حال دیکھنے والے دیکھیں گے کہ پروردگار عالم بے سان وگمان اپنے بندے کے ہاتھوں (ان کو مدد) کیونکر پہنچاتا ہے اور خدمت کراتا ہے۔"(۳۶)

۳۰ رجولائی ۱۸۲۱ء (شوال ۱۲۳۶ھ) کو بروز سوموار سید صاحبؒ نے تقریباً چار سو لوگوں کے ساتھ دائرہ شاہ علم اللہ سے اپنا سفر حج شروع کیا۔ پہلی منزل پر رکنے کے بعد انہوں نے قافلہ کے خازن مولانا محمد یوسف پھلتی کو حکم دیا کہ ان کے پاس سفر کے خرچ کے لئے جو روپے ہوں، وہ لے کر آئیں۔ ان سے سب روپے لے کر آپ نے غریبوں میں تقسیم کر دیئے، اس کے بعد برہنہ سر ہو کر اللہ سے دل سوزی کے ساتھ مدد و نصرت کی دعاء کی۔ بعد کی ایک منزل پر آپ نے اپنے ایک ذمہ دار ساتھی سید زین العابدین سے فرمایا کہ اگر سفر کے خرچ میں سے کچھ رقم بچ گئی ہو تو لے کر آئیں۔ وہ پانچ روپے لے کر آئے کہ اس میں سے بس اتنی ہی رقم باقی بچی تھی۔ سید صاحبؒ نے وہ رقم بھی فقراء میں تقسیم کر دی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ اب سفر کے خرچ کے لئے قافلہ کے پاس ایک پیسہ بھی باقی نہیں بچا ہے تو انہوں نے پر یقین لہجے میں فرمایا، "پروردگار کا خزانہ بھرا ہوا ہے" اور قافلہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ (۳۷)

جیسا کہ سید صاحبؒ نے فرمایا تھا، جیسے ہی ان کا قافلہ تکیہ سے نکل کر عازم سفر ہوا، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے کھلے آثار نظر آنے لگے۔ قافلہ جدھر سے گزرتا اور جہاں قیام کرتا، لوگ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی والہانہ میزبانی کرتے اور خدمت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ سفر کے آغاز ہی میں راستے میں ڈلمو نامی ایک گاؤں پڑا۔ وہاں سے دو اشخاص نے اپنے پچاس رفقاء کے ساتھ دو میل آگے بڑھ کر قافلہ کا خیر مقدم کیا۔ دونوں حقیقی بھائی تھے اور ان میں وجہ نزاع یہ تھی کہ دونوں ہی سفر حج کے ان خوش نصیب مسافروں کو اس مبارک سفر میں پہلا کھانا کھلانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سید صاحبؒ نے دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کیا، دونوں کی دعوت قبول فرمائی اور چھوٹے بھائی کو ترغیب دی کہ وہ ایثار کی راہ اپنا کر اپنے بڑے بھائی کو قافلہ کی پہلی میزبانی کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیں۔ (۳۸)

ایک شام حجاج کی کشتیاں ایک ایسے مقام پر آ کر رکیں جہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔

---

(۳۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۵۶۔

(۳۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۵۸ اور ۲۶۴۔

(۳۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۵۸۔۲۵۹۔

ندی کے کنارے کی زمین بھیگی تھی جس میں کیچڑ ہو رہا تھا۔ ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ کھانا پکانے کا کوئی نظم کرنا ممکن نہ تھا۔ انہیں خیال ہوا کہ قافلہ کو بغیر کھائے پیٔے رات گزارنی پڑے گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی انہوں نے دور سے چند لوگوں کو روشنی لئے اپنی جانب آتے دیکھا۔ نزدیک آنے پر پتہ چلا کہ وہ نیل کا ایک انگریز سوداگر تھا جو اس علاقے میں تجارت کی غرض سے مقیم تھا۔ اسے جب سید صاحبؒ کے کاروان حج کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اپنے چند لوگوں کے ساتھ حاجیوں کے لئے کھانا لایا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کا ایک ایسا انتظام تھا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ سید صاحبؒ نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور اس کی ضیافت قبول کی۔ (۳۹)

جب سید صاحبؒ کا قافلۂ حج الہ آباد بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں شہر کے متعدد معزز حضرات استقبال کے لئے موجود تھے۔ لیکن شیخ غلام علی کو جو الہ آباد کے رئیس اعظم تھے، میزبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت تک حجاج کی تعداد سات سو پچاس (۷۵۰) ہو چکی تھی، لیکن شیخ غلام علی کے جذبہ میزبانی اور حوصلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ انہوں نے مہمانوں کے لئے بہترین کھانوں کا، جو نوع بہ نوع بھی تھے اور وافر بھی، جو اہتمام کیا وہ روایت میزبانی میں ایک یادگار باب بن گیا۔ انہوں نے سید صاحبؒ اور ان کی دونوں اہلیہ، دیگر اہل خاندان، اور علماء کی خدمت میں بیش قیمت تحفے پیش کئے، قافلہ کے ہر فرد کے لئے لباس، جوتے، چادریں، ٹوپی اور احرام کے کپڑے خریدے اور ہدیتاً رقم بھی پیش کی۔ انہوں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے پیش کئے جو حج کے سفر میں راحت و آرام کا باعث ہو سکتے تھے۔ دوسرے رؤساء شہر نے بھی سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کی دعوت کی اور ان کی خدمت میں روپے اور قیمتی ہدایا پیش کئے۔ اس طرح، جیسا کہ غلام رسول مہر نے لکھا ہے، "یہ سید صاحبؒ کے اخلاص و توکل کی برکت تھی کہ گھر سے خالی ہاتھ نکل پڑے اور الہ آباد سے روانگی کے وقت تک تمام اہل قافلہ کو ضرورت کی چیزیں مل گئیں۔ نیز سید صاحب کے پاس ہزاروں روپے جمع ہو گئے۔" (۴۰)

کاروان حج کے کلکتہ پہنچنے پر میزبانی میں منشی امین الدین سب پر سبقت لے گئے۔ وہ برطانوی حکومت میں ایک ممتاز وکیل تھے۔ ابھی سید صاحبؒ کا قافلہ بندرگاہ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ وہ ایک تیز رفتار کشتی پر سوار ہو کر دریائے ہگلی ہی میں ان سے جا ملے اور ان سے ان الفاظ میں اپنی میزبانی قبول کرنے کی درخواست کی: "شہر میں مختلف آدمیوں نے آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا

(۳۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۶۶-۲۶۷۔ (۴۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۹۴۔

ہے۔ میں سب سے پہلے پہنچا ہوں، لہذا میرے یہاں قیام کا عہد فرمائیں۔'' (۴۱)

یوں تو اور لوگوں نے بھی سید صاحبؒ اور قافلہ کے دیگر لوگوں کے قیام کے لئے مکانات خرید رکھے تھے، لیکن منشی امین الدین نے اس مقصد کے لئے ایک بہت کشادہ باغ خریدا تھا جس میں کئی رہائشی عمارتیں تھیں۔ اس باغ میں تین تالاب بھی تھے: ایک میٹھا پانی پینے کے لئے، دوسرا غسل کے لئے، اور تیسرا کپڑے دھونے کے لئے۔ میٹھے پانی کی کلکتہ میں بہت قلت تھی، اللہ تعالی نے یہاں یہ مشکل بھی آسان کردی۔ منشی امین الدین نے حجاج کے لئے تین سو روپئے کے جوتے اور ہزار روپئے کا کپڑا خریدا۔ شہر کے دوسرے معزز حضرات نے بھی کاروان حج کی بہت پذیرائی کی، خیر و برکت کے لئے سید صاحبؒ کو گھر لے گئے، دعوتیں کیں، ہدایا پیش کئے اور بیعت کا شرف حاصل کیا: ''دو مہینے تک روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے۔ کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دو ڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا۔ حضرت کو سوائے نماز پڑھنے اور ضروریات بشری کے فرصت نہ ملتی تھی۔'' اس زمانہ میں سلطان ٹیپو سلطان کے خاندان کے جلاوطن افراد کلکتہ ہی میں رہتے تھے۔ سید صاحبؒ نے ان سے ملاقات کی اور انہیں دین و آخرت کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سید صاحبؒ سے بیعت بھی ہوئے۔ اس طرح میسور کے اس باحوصلہ اور غیور فرمانروا کا کسی قدر حق بھی ادا ہوا جو انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں اسلامی غیرت و آزادی کا آخری نشان تھا۔ (۴۲)

اس کاروان حج میں شامل لوگوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے جو غیبی انتظام حرکت میں آیا، وہ ایک دل چھونے والی طویل داستان ہے۔ ان صفحات کی تنگ دامانی ان تفاصیل کی متحمل نہیں ہوسکتی، ورنہ ان میں زیادتیٔ ایمان کا جو سامان ہے اس کی بناء پر تو وہ کہانی اس لائق ہے کہ اس کا تفصیلی ذکر ہو۔ بہر حال، جو چند مختصر باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں، ان سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ سید صاحبؒ کا اتنی بڑی جماعت کے ساتھ حج کے اس طویل سفر پر بلا اسباب نکل جانا کوئی جذباتی قدم نہ تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک صاحب اخلاص کا وہ یقین و توکل کام کر رہا تھا جس کی بناء

---

(۴۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۶۔

(۴۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۶-۲۰۹۔ منشی امین الدین کی کوٹھی اسی مقام پر تھی جہاں اب مسجد ناخدا بنی ہوئی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھانجہ حسن علی نے وہاں پر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کردی جو آہستہ آہستہ ایک عظیم الشان مسجد میں تبدیل ہوگئی اور اب کلکتہ کی جامع مسجد ہے یہ ان کے اخلاص اور عنداللہ مقبولیت کا مظہر ہے۔ ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۳۱۲-۳۱۳۔

پر رب کائنات اس کی ضرورتوں کا خود کفیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایمان ویقین کی اس کیفیت کے ساتھ ایک بار انہوں نے حجاج سے فرمایا: ”مجھ سے تو اس شاہنشاہ دو عالم پناہ، قادر برحق، رازق مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ تیرے ساتھ اس سفر میں ہیں، ان کے کھانے کپڑے کا کچھ اندیشہ نہ کر، وہ سب میرے مہمان ہیں، اور وہ اپنے وعدے کا سچا ہے۔“ (۴۳)

اتر پردیش، بہار اور بنگال کے صوبے جو سید صاحبؒ کے راستے میں پڑتے تھے، ان دنوں ایک غیر معمولی اخلاقی، سماجی اور مذہبی انقلاب سے روشناس ہو رہے تھے۔ جہاں جہاں سید صاحبؒ کا قیام ہوا، وہاں وہاں سے شرک و بدعت کے رسوم کا خاتمہ ہو گیا اور اخلاقی اور سماجی بے راہ روی مٹ گئی۔ مساجد، مدارس اور خانقاہ پھر سے آباد ہو گئے اور ان سے شریعت کی بالاتری کی دعوت دی جانے لگی۔ مسلمان ۔۔ جوان و عمر رسیدہ، مرد و خواتین، غریب و امیر۔۔ اسلام کی عملی تعلیمات کے جیتے جاگتے نمونے بن گئے۔ غیر مسلم حضرات میں سے جن کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے تھاما، وہ اسلام سے مشرف ہوئے۔

کلکتہ میں تین مہینے قیام کے بعد سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے جن کی تعداد سات سو ترپن (۷۵۳) تھی، پانی کے جہازوں سے سمندر کے راستے سفر شروع کیا۔ (۴۴) روانگی کے وقت اتنے زیادہ لوگ خدا حافظ کہنے کو سڑکوں پر نکل آئے کہ راستے بند ہو گئے۔ لوگ اپنے مکانات کے بالائی حصوں پر کاروان حج کی روانگی کا روح پرور نظارہ دیکھنے کو کھڑے تھے۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے اپنے مقام سے بندرگاہ کا رخ کیا اور راستے میں ایک وسیع میدان میں رک کر جماعت سے عصر کی نماز ادا کی۔ انہوں نے فقراء میں صدقہ تقسیم کیا، حاضرین کو بلند آواز سے ”السلام علیکم“ کہا، اور ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز کی طرف جو گہرے پانی میں کھڑا تھا، روانہ ہوئے۔ خدا حافظ کہنے کے لئے جمع ہونے والے شائقین و محبین از راہ محبت اس وقت تک سمندر کے کنارے ٹھہرے رہے جب تک سید صاحبؒ کی کشتی نظر سے اوجھل نہ ہو گئی۔ (۴۵)

کئی مقامات پر رکتے ہوئے سید صاحبؒ ۱۶ رمئی ۱۸۲۲ء (۲۴ رشعبان ۱۲۳۷ھ) کو جدہ پہنچے۔ وہاں پانچ دن کے قیام کے بعد ۲۰ رمئی ۱۸۲۳ء کو وہ مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے اور ۲۱ رمئی کو وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کیا۔ انہوں نے رمضان المبارک کا پورا مہینہ مکہ مکرمہ میں گزارا اور

---

(۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۶۱۔ (۴۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۱۲۔۲۱۳۔

(۴۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۳۴۴۔

نہایت اہتمام کے ساتھ عمرہ، تراویح اور دوسرے نیک اعمال میں مشغول رہے۔ آخری عشرہ میں انہوں نے حرم شریف میں مسنون اعتکاف کیا۔ مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران وہاں کے علماء نے سید صاحبؒ کے ساتھ نہایت عزت واکرام کا معاملہ کیا۔ عوام بھی بڑی تعداد میں سید صاحبؒ سے ملنے آئے۔ حتیٰ کہ حج کا موقعہ جس کے لئے یہ طویل سفر اختیار کیا گیا تھا آپہنچا۔ ۷/ ذی الحجہ ۱۲۳۷ھ کو سید صاحب نے اپنے رفقاء کے ساتھ حطیم میں طویل دعاء کی اور منیٰ کے لئے روانہ ہوئے۔ انہوں نے پورا حج انتہائی ذوق وشوق کی کیفیت کے ساتھ مکمل کیا۔ ان کے مکہ مکرمہ میں قیام کی مدت تقریباً پانچ ماہ تھی۔

حج کے اختتام کے بعد سید صاحبؒ نے مدینہ منورہ کے سفر کی تیاری شروع کردی اور اس سفر کے لئے محبت وادب کو خاص طور پر اپنا زادراہ بنایا۔ اگرچہ راستہ میں بدو قزاقوں کے حملے کا خطرہ تھا، لیکن انہوں نے ازراہ ادب اپنے سارے ہتھیار مکہ مکرمہ میں چھوڑ دیئے۔ انہوں نے ۵/ صفر کو سفر شروع کیا اور مدینہ پہنچنے کے بعد ۲۸/ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ تک وہاں قیام کیا۔ وہ ۲۹ ربیع الاول کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوکر مکہ مکرمہ پہنچے اور عمرہ ادا کیا۔ اس بار بھی مکہ مکرمہ کے علماء وفضلاء سید صاحبؒ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ سید صاحبؒ نے دوسرا رمضان بھی مکہ مکرمہ میں گذارا۔

ہندوستان کی واپسی

۲۵/ جون ۱۸۲۳ء (۱۵/ شوال ۱۲۳۸ھ) کو سید صاحبؒ نے ہندوستان کی واپسی کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ سفر کی تیاری شروع کردی گئی۔ پہلی ذی القعدہ ۱۲۳۸ھ کو سید صاحبؒ اپنے قافلے کے ساتھ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن جدہ پہنچے۔ پھر وہاں سے بمبئی ہوتے ہوئے کلکتہ تشریف لائے۔ شائقین اور معتقدین نے ہر مقام پر بڑی تعداد میں حاضر ہوکر قافلے کا استقبال کیا اور سید صاحبؒ کے ارشادات اور مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کے مواعظ سے مستفیض ہوئے۔ مرشدآباد میں قافلے نے دیوان غلام مرتضیٰ کے بنگلے میں قیام کیا۔ دیوان کی کوٹھی سے قریب ایک بازار تھا۔ انہوں نے بازار میں اعلان کرادیا کہ سید صاحبؒ کے رفقاء وہاں سے جو چیز بھی خریدیں، اس کی قیمت وہ ادا کریں گے۔ انہوں نے سید صاحبؒ کے رفقاء اور اطراف واکناف سے زیارت واستفادہ کے لئے آنے والے سب لوگوں کو ایسے قیمتی کھانے کھلائے کہ وہ لکھنؤ، الہ آباد اور اطراف

کے علاقوں میں موضوع سخن بن گئے۔ الہ آباد سے شیخ غلام علی کی ہدایت پر ان کے صاحبزادے نے آگے بڑھ کر مرزا پور میں سید صاحبؒ کا استقبال کیا اور مرزا پور سے الہ آباد کے سفر کے دوران اور پھر الہ آباد کے قیام میں اس حوصلہ کے ساتھ حجاج کی خدمت کی کہ اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی لوگوں کے ذوق وشوق کا یہی عالم تھا۔ (۴۶)

رائے بریلی میں

۲۹/اپریل ۱۸۲۴ء (۲۹/شعبان ۱۲۳۹ھ) کو تقریباً دو سال دس مہینے کے بعد سید صاحب اپنے آبائی مستقر دائرہ شاہ علم اللہ پہنچے۔ غلام رسول مہر کے مطابق تقریباً ایک لاکھ روپیہ سفر میں خرچ ہوا تھا اور واپسی کے بعد بھی خازن کے پاس دس ہزار روپیہ بچ رہا تھا۔ (۴۷) سید صاحبؒ کے کاروان حج کی حفاظت و کامیابی کے ساتھ واپسی کی خبر دور دور تک پھیل گئی۔ لوگوں نے تہنیت کے جذبات کے ساتھ کاروان حج اور سالار کاروان کی مدح میں نظمیں لکھیں جو بہت جلد زبان زد عام ہو گئیں اور دور دور تک مشہور ہوئیں۔ (۴۸) اس طرح اس عملی قدم کے اثر سے راستے کی بدامنی کی بناء پر حج کی فرضیت کو منسوخ کرنے کی تحریک اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی کہ اس کا ذکر تاریخ کے صفحات میں بھی مشکل سے ملتا ہے۔

سید صاحبؒ نے دائرہ شاہ علم اللہ میں مئی ۱۸۲۴ء سے جنوری ۱۷/ ۱۸۲۶ء (رمضان ۱۲۳۹ھ سے جمادی الآخر ۱۲۴۱ھ) تک قیام کیا۔ ان کے ساتھ کئی سو رفقاء اور احباب بھی وہاں مقیم تھے جو اپنے اپنے علاقے کے منتخب حضرات تھے۔ ان اللہ والوں کے قیام سے دائرہ کے شب وروز میں وہ نورانیت پیدا ہو گئی جسے دوبارہ دیکھنے کو چشم فلک ترسے گی۔

فکر جہاد کا غلبہ

دائرہ کے اس قیام کے دوران سید صاحبؒ پر سب سے زیادہ غلبہ جہاد کے خیال کا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ پنجاب میں سکھ حکومت اور دہلی اور دیگر ریاستوں میں انگریزوں کے تسلط کا سیدھا اثر ملت اسلامیہ میں احساس عدم تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی آزادی پر پڑ رہا تھا۔

---

(۴۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۳۳۹۔۳۶۶۔ (۴۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۳۱۔

(۴۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۳۸۰۔ مولانا ندوی نے اپنی کتاب کے صفحات ۳۷۶ سے ۳۸۰ پر ایک طویل قصیدہ تہنیت نقل کیا ہے جو قافلہ حج اور سید صاحب کی منقبت میں لکھا گیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ؒ کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک فتویٰ میں صراحتاً صورت حال کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے: "شہر (دہلی) میں اسلامی شریعت پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کی جگہ پر عیسائی حکمرانوں کے قانون کو بلا روک ٹوک نافذ کیا جاتا ہے۔۔۔۔اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک عیسائی قانون کی بالادستی قائم ہے۔" (۴۹)

ان حالات کے پیش نظر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو شرعی نقطہ نظر سے دارالحرب قرار دیا۔ سید صاحبؒ بھی ہندوستان میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مسلمانوں کے دین ومذہب کے لئے ایک سنگین خطرہ سمجھتے تھے۔ (۵۰) سید صاحبؒ کے لئے یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ اور ناقابل قبول تھی۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنے

---

(۴۹) محی الدین احمد، ۱۱۵۔۱۱۶۔

(۵۰) سید صاحبؒ نے جو اسلام کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشنری نیت اور ارادوں کی نشاندہی کی تھی، وہ بعد میں کھل کر سامنے آگئیں۔ انیسویں صدی میں جو صورت حال سامنے آئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کے خدشات بے بنیاد نہ تھے۔ حال ہی میں چھپی ایک کتاب (The Last Mughal; The Fall of A Dynesty, Delhi, 1857 by William Dalrymple) جو ایک انگریز محقق کے قلم سے ہے، سے مندرجہ ذیل اقتباسات صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریز حکومت درپردہ اپنا مشنری ایجنڈہ رکھتی تھی اور اس کے سامنے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کا ایک اہم مشن تھا۔ انگریزی سے اردو ترجمہ میرا ہے۔

۱۔ "[مغل شہزادہ] جوان بخت کی شادی (۱۸۵۲ء) سے تین ماہ قبل جب جے ننگز [The Reverend Midgelay John Jennings] دہلی پہنچا تو وہ دہلی کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے اپنے پلان پر کام کر رہا تھا۔۔۔۔ جے ننگز کا پلان تھا کہ وہ ہندوستان کے مذاہب کو، جنہیں وہ باطل سمجھتا تھا، توڑ دے، اور اگر ضروری ہو تو اس کے لئے طاقت کا استعمال کرے۔" (ص ۵۹)

۲۔ "جب جے ننگز ہندوؤں کے ایک بہت بڑے میلہ، کمبھ میلہ، گیا اور وہاں اس نے ان لاکھوں (millions) مذہبی [ہندو] تیرتھیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش شروع کی جو گنگا ندی کے کنارے جمع ہوئے تھے اور اس مقصد سے ان کی شیطانی بت پرستی کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو گزٹ [The Delhi Gazette] کو یہ کہنا پڑا کہ جے ننگز اور اس کے دو ماتحتوں کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ وہ کچھ ضبط کا رویہ اختیار کرتے"۔ (ص ۶۰)

۳۔ "جے ننگز کی جو بھی ذاتی خامیاں رہی ہوں، اس کے خیالات ورجحان میں ہندوستان میں مقیم انگریزوں کی بڑھتی ہوئی تعداد شریک تھی"۔ (ص ۶۰)

۴۔ "کلکتہ میں جے ننگز کا رفیق کار مسٹر اڈمنڈز (Mr. Edmunds) تھا جو اس بات کا برملا اور کھل کر اظہار کرتا تھا کہ [ایسٹ انڈیا] کمپنی کو زیادہ قوت کے ساتھ اپنے اثر ورسوخ کو ہندوستان میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دینی شعائر پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے اور ان کو اگر اس سے محروم کیا

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) تبدیلیٔ مذہب [عیسائیت کے حق میں] کے لئے استعمال کرنا چاہیے"۔ (ص ۶۱)

۵۔"ہربرٹ اڈورڈز (Herbert Ddwards)، جو دہلی کے شمال مغرب میں پشاور کا کمشنر تھا، اس بات میں مضبوط یقین رکھتا تھا کہ برطانیہ کو [ہندوستان کی] مملکت انگریز پروٹسنٹ فرقہ کے لوگوں کی نیکی کی وجہ سے دی گئی ہے۔۔۔۔ اسی جذبے کے ساتھ رابرٹ ٹکر (Robert Tucker) نے، جو فتح پور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھا، بڑے بڑے پتھر کے ستونوں پر یہودیوں اور عیسائیوں کی مشہور تعلیمات (The Ten Commandments) کو فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی میں کندہ کرا کے [عام مقامات پر] نصب کرا دیا تھا۔ مزید برآں، ہفتہ میں دو، تین بار وہ ان مقامی لوگوں کے سامنے ہندوستانی زبان میں بائبل پڑھا کرتا تھا جو احاطے میں اسے سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔" (ص ۶۱۔۶۲)

۶۔"یہ عیسائی مذہبی جوش ہندوستان کے برٹش فوج تک پھیل گیا تھا۔ ڈریگونز گارڈز [DragoonsGuards] کے ایک سپاہی کے مطابق، ایک مذہبی جنون ابل پڑا تھا اور چھا گیا تھا۔۔۔۔ [ایسٹ انڈیا] کمپنی کی ذاتی فوج میں بھی یہی حال تھا، جہاں کرنل اسٹیون ویلر (Colonel Steven Wheler) جو چونتیسویں مقامی پیادہ دستہ (The 34th Native Infantry) میں کمانڈنگ آفیسر تھا، اور اس جیسے دوسرے افسروں کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو [جمع کر کے] بائبل سناتے اور ہر طبقہ کے مقامی لوگوں کو جو انہیں سڑکوں، شہروں، بازاروں اور گاؤں میں ملتے عیسائیت میں داخل کرنے کی کوشش کرتے۔" (ص ۶۲)

۷۔"ایسے ہی خیالات کی بازگشت عیسائیت کے اس بڑھتے ہوئے مبلغ گروہ کے یہاں سنائی دے رہی تھی جو [ایسٹ انڈیا] کمپنی کے ڈائرکٹروں میں شامل تھے جن میں سب سے پہلا اور سب سے آگے چارلس گرانٹ (Charles Grant) تھا جس کا یقین تھا کہ ان [ہندوں] کے علاوہ کسی ایسی قوم کا جو اپنی توہم پرستی کی زنجیر میں اس طرح مکمل طور پر جکڑی ہوئی ہو، گمان میں آنا بھی مشکل تھا۔ گرانٹ کا یہ مشورہ تھا کہ مشنری کوششوں کو بڑے پیمانے پر پھیلا دیا جائے تا کہ ان [ہندوں] سے عیسائیت کے حق میں تبدیلیٔ مذہب کرالیا جائے جو، اس کے الفاظ میں، مکمل طور پر خراب اور بگڑے ہوئے تھے۔۔۔۔ اخلاقی طور پر بدحال ایسے کہ جیسے ان کی آنکھیں نہ ہوں، اور ذلیل ایسے جیسے کہ وہ بڑے ہیں۔" (ص ۶۲)

۸۔ مشنریوں کا خاص معاون ہندوستان میں کلکتہ کا بشپ ریجینالڈ ہیبر (Bishop Reginald Heber) تھا۔۔۔ ہیبر ہی وہ شخص تھا جس کا کام اس پورے پروگرام (regime) کی نگرانی تھا۔ اس نے کئی نظمیں بھی لکھی تھیں جو اس مشن کے لئے کام کرنے والے جارح اور پر اعتماد لوگوں کے لئے نعرے کا کام دیتی تھیں۔ اس کی جوش دلانے والی نظمیں، جو اب بھی گائی جاتی ہیں، مذہبی جنگ اور عیسائی جنگی استعارے سے بھری ہوئی ہیں۔۔۔۔ ایک نظم اس طرح شروع ہوتی ہے: 'خدا کا بیٹا جنگ کے لئے آگے بڑھ رہا ہے/اس کا خونی سرخ رنگ کا جھنڈا دور تک لہرا رہا ہے۔' (The Son of God goes forth to war/ His blood-red banner streams afar)۔" (ص ۶۲۔۶۳۔)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جاتا ہے تو انہیں حق ہے کہ وہ اس کی مخالفت کریں، اور اگر مجبوری ہو تو اپنے دفاع میں قوت کا استعمال کریں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انگریز ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی اقدار کو ایک باقاعدہ پالیسی کے تحت برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے اصل دشمن کی حیثیت سے انگریز ان کے سامنے تھے۔ پنجاب میں سکھ حکومت کی مسلمان دشمن پالیسی سے وہ سخت دل گرفتہ تھے مگر انگریزوں کے مقابلہ میں وہ سکھوں کو ثانوی درجہ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی مناسب جگہ کو مرکز کے طور پر اختیار کر کے مسلمانوں کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کی فکر و کوشش کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے شمال مغربی سرحدی خطے کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں سے حالات کے مطابق تیاری کر کے اپنی جدوجہد کا آغاز کر سکیں۔ ایسے کسی مرکز کے قیام کے لئے اس وقت ہندوستان کا کوئی صوبہ مناسب نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے علاقے سے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کرتے تو انگریز نہایت آسانی کے ساتھ ان کی تنظیم میں اپنے کرائے کے مخبر داخل کر دیتے اور اندرونی خلفشار پیدا کر دیتے اور پھر جنگ کی صورت میں اپنی حلیف ریاستوں کی مدد سے سید صاحبؒ کے علاقے کی ناکہ بندی کر دیتے، جیسا کہ انہوں نے سلطان ٹیپو سلطان شہید اور امیر خان کے ساتھ کیا تھا۔ حقیقتاً صوبہ سرحد کا شمالی مغربی علاقہ سید صاحبؒ کے جہاد کے عزائم کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس علاقہ میں ایسے مسلمان بستے تھے جو شجاعت و حریت کے لئے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ وہاں شمال و مغرب میں آزاد مسلم ریاستوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)

۹۔ "اپنی پہلی رپورٹ میں جو جے ننگز نے Society for the Propagation of the Gospel (SPG) کو پیش کی تھی، اس نے نہایت مزہ لے کر دہلی کی دو سو اکسٹھ (۲۶۱) مساجد اور دو سو (۲۰۰) مندر پر قبضہ کر لینے کی بات کہی تھی اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے اپنے ارادے کا کھل کر بغیر کسی ابہام کے اظہار کیا تھا۔۔۔۔ دہلی کے Chaplin کی حیثیت سے اس کا ماہانہ مشاہرہ اور اس کے اسفار کے اخراجات بھی [ایسٹ انڈیا] کمپنی دیتی تھی۔" (ص ۶۷)

۱۰۔ "ایسے دوسرے واقعات بھی تھے جہاں [ایسٹ انڈیا] کمپنی نے اہم مندروں اور مسجدوں کو سڑک کی تعمیر کے لئے توڑ دیا۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے خاص طور پر شاہ عبدالعزیزؒ جیسے با اثر فقیہ کو بہت متاثر کیا۔ بعض موقعوں پر مساجد سے زمین لے کر مشنریوں کو دے دی گئی تاکہ وہ وہاں چرچ بنائیں۔ ایسے دوسرے موقعوں پر اس طرح کی تعجب خیز بے حسی کا ثبوت دیتے ہوئے [ایسٹ انڈیا] کمپنی نے عیسائی پادریوں (clergy) کو ایسے مساجد رہائش کے لئے دے دیں جنہیں یا تو ضبط کر لیا گیا تھا یا جو شکستہ ہو گئی تھیں۔" (ص ۶۹)۔

تھا۔ اگر وہ ریاستیں ایک مرکز کے ماتحت اپنا ایک وفاق بنا لیتیں تو وہ ایک نہایت مضبوط مسلم طاقت ثابت ہوسکتا تھا۔ پھر اس علاقے کی قدرتی ساخت پہاڑوں اور وادیوں کے سلسلے کی وجہ سے ایسی تھی کہ مجاہدین کے خلاف جنگ کی صورت میں کسی دشمن حملہ آور کا کامیاب ہونا مشکل تھا۔

سید صاحبؒ نے صوبہ سرحد میں ایک مرکز قائم کر کے وہاں سے اپنی جدوجہد کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ سرحد میں دعوت اسلام کو عام کر کے مقامی خوانین اور سرداروں کو اسلام کی حمایت کے لئے تیار کریں اور انہیں ساتھ لے کر پنجاب کی سکھ حکومت پر دباؤ ڈالیں جہاں مسلمانوں پر ہر ظلم روا رکھا جا رہا تھا۔ پھر بہتر تیاری کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت کے خلاف جنگ چھیڑ دیں جو ان کا اصلی مقصد تھا۔ بے شک پنجاب کی سکھ ریاست مضبوط تھی، لیکن افغانستان و سرحد کے حکام کو یکجا کر کے اگر ایک پلیٹ فارم قائم کیا جاتا تو وہ پنجاب کی ریاست سے زیادہ طاقتور ثابت ہوسکتا تھا۔ پھر ان سرداروں کو متحد کرنا ممکن بھی تھا۔ وہ سب سردار جو افغانستان سے پشاور تک حکومت کر رہے تھے، نہ صرف مسلمان تھے بلکہ ایک ہی قبیلہ، بارک زئی کے افراد تھے اور آپس میں خونی رشتہ رکھتے تھے۔ انہیں یکجا کرنا غیر متعلق سرداروں کو یکجا کرنے کے مقابلہ میں یقیناً نسبتاً آسان تھا۔ اس کے علاوہ ان میں جہاد کی دعوت کی قبولیت کی امید بھی تھی۔ ماضی قریب میں بارک زئی خاندان کے ایک حوصلہ مند شخص محمد عظیم خان، جو پشاور کا حکمران تھا، اور اس کے بھائی عبدالصمد خان نے راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک بڑی جنگ لڑی تھی جس میں انہوں نے خٹک کے پہاڑی علاقوں میں بسنے والوں اور یوسف زئی قبیلے کے لوگوں کو جہاد کا نعرہ دے کر بیس ہزار لڑاکے جمع کر لئے تھے۔ اگرچہ بارک زئی سردار جنگ ہار گئے تھے لیکن ان کی ہمت و شجاعت کی یاد اس وقت بھی علاقے کے لوگوں کے دلوں میں زندہ تھی۔ (۵۱) ان سب باتوں کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سید صاحبؒ کا شمالی مغربی سرحد کا انتخاب نہایت دانشمندانہ اور عملی تھا۔

سرحد کو ہجرت

غور و خوض کے بعد سید صاحبؒ نے ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء (۷ جمادی الآخر ۱۲۴۱ھ) کو اپنا آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ چھوڑا اور صوبہ سرحد کی طرف ہجرت کی۔ سید صاحبؒ نے اپنی تحریک کے ہر موڑ پر جس طرح سنت پر عمل کرنے کا غیر معمولی اہتمام کیا، اس کی جھلک یہاں بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے جہاد سے پہلے ہجرت کی سنت بھی زندہ کی۔ سید صاحبؒ کے اعزہ، احباب اور

(۵۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۲۴ اور ۴۲۷۔۴۲۸۔

علاقے کے عام مسلمان بڑی تعداد میں انہیں رخصت کرنے آئے۔ دائرہ سے نکل کر انہوں نے سئی ندی عبور کیا اور دوسرے کنارے پہنچ کر شکرانے کی نماز ادا کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دین کی حمایت کے لئے ہجرت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس وقت ان کا کل سرمایہ پانچ ہزار روپے اور پانچ سو سے چھ سو رفقاء تھے۔ یہ رفقاء جو تاریخ میں مجاہدین کے نام سے جانے گئے، برسوں سید صاحبؒ کی صحبت میں رہے تھے اور ان کے مشن میں دل و جان سے شریک تھے۔ سید صاحبؒ کے سفر ہجرت کا قدرے تفصیل سے نیچے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ان کی مقبولیت، ان کی دعوت کے اسلوب اور علاقے کے حالات کا اندازہ ہو سکے۔

رائے بریلی سے سرحد کا سفر بہت طویل اور انتہائی دشوار گزار تھا، لیکن سید صاحبؒ اپنے قافلے کے ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ راستے میں پڑنے والے علاقوں میں اصلاح و جہاد کی دعوت دیتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ کئی منازل پر مختصر قیام کے بعد ان کا قافلہ گوالیار پہنچا جہاں راجہ دولت راؤ سندھیا کی حکومت تھی۔ راجہ بیمار تھا اس لئے ریاست کے نظم و نسق کی ذمہ داری اس کے برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو راؤ نے خود حاضر ہو کر راجہ کی طرف سے سید صاحبؒ کو خوش آمدید کہا اور کھانے کی دعوت دی۔ جب سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء محل پہنچے تو راجہ کی جانب سے ان کا نہایت شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ کھانے میں بھی غیر معمولی اہتمام تھا۔ راجہ دولت راؤ نے سید صاحبؒ کی خدمت میں بیش قیمت تحائف پیش کئے۔ ایک نجی نشست کا بھی انتظام کیا گیا جس میں سید صاحبؒ اور راجہ دولت راؤ سندھیا کے ساتھ مہارانی بیجا بائی بھی شریک ہوئی اور پردے کے پیچھے سے گفتگو میں حصہ لیا۔ سید صاحبؒ نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرات کے بارے میں جو ہندوستان کو غلامی کی طرف لے جا رہے تھے تفصیل سے گفتگو کی۔ راجہ اور مہارانی نے ان کے خیالات سے پورا اتفاق کیا اور سید صاحبؒ کو بحیثیت مہمان ایک سال کے لئے گوالیار میں قیام کی دعوت دی تاکہ مجاہدین کے لئے ہتھیار اور ضروری سامان کا ریاست کی طرف سے انتظام کیا جا سکے۔ سید صاحبؒ نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے وہاں رکنے کے بجائے سرحد کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ (۵۲)

گوالیار سے سید صاحبؒ نے ٹونک کا رخ کیا جہاں نواب امیر خان (جن کی فوج میں انہوں نے نوکری کی تھی) کی حکومت تھی۔ امیر خان نے اپنے منتخب رؤساء کے ساتھ آگے بڑھ کر سید

(۵۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۳۹۔

صاحبؒ کا خیر مقدم کیا۔ ٹونک میں سید صاحبؒ کا قیام تقریباً ایک ماہ رہا۔ نواب امیر خان نے سید صاحبؒ اوران کے قافلے کی خدمت وخبر گیری کا بہت اہتمام کیا اور اپنے لڑکے، صاحبزادہ وزیر محمد خان اور بہو کے ساتھ سید صاحبؒ سے بیعت کی۔ روانگی کے وقت امیر خان جھلانا نامی مقام تک اپنے امراء ورفقاء کے ساتھ سید صاحبؒ کو خدا حافظ کہنے آیا اور از راہ محبت درخواست کی کہ سید صاحبؒ کسی بھی مشکل وقت میں انہیں یاد کرنا نہ بھولیں۔

ٹونک سے نکل کر سید صاحبؒ اجمیر ہوتے ہوئے پالی پہنچے۔ وہاں سے آگے امر کوٹ تک (جو سندھ کی سرحد پر تھا) مارواڑ کا خطرناک ریگستان تھا۔ یہ ریگستان تقریباً دوسواسّی (۲۸۰) میل لمبا ایک بنجر علاقہ تھا جہاں مسافروں کے لئے نہ معروف راستے تھے اور نہ ہی سایہ دار مقامات جہاں تھکا ہارا مسافر تھوڑی دیر آرام کر لے۔ صاف پانی کے کنویں بھی کم یاب تھے۔ لیکن سید صاحبؒ اوران کے رفقاء کا صبر وتحمل لائق صد آفریں ہے کہ گرچہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی گذشتہ زندگی عیش وآرام میں گذری تھی، ایک شخص کی زبان پر بھی کبھی کوئی حرف شکایت نہ آیا۔ سوراہا نامی مقام پر ان لوگوں نے عید الفطر کا چاند دیکھا۔ دوسرے دن صبح میں اللہ کی راہ کے ان مسافروں نے اپنے وطن اور اعزہ سے دور ایک ریگستان میں نماز عید ادا کی اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ (۵۳)

کئی مقامات پر مختصر قیام کرتے ہوئے سید صاحبؒ حیدرآباد پہنچے جو سندھ کا دارالسلطنت تھا۔ چونکہ ریاست سندھ کو خود ہی پنجاب کی سکھ حکومت اور انگریزوں کی ملک گیری کی پالیسی سے خطرہ تھا، اس لئے اس کے حکمرانوں کو سید صاحبؒ کے مشن کی قدر کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گرچہ سید صاحبؒ کی ملاقات سندھ کے حکمرانوں ـــــ میر مکرم علی، میر مراد علی اور میر محمد ـــــ سے سندھ کے قلعہ میں ہوئی اور سید صاحبؒ نے ان کو سکھ اور انگریز کے خطرات سے خبردار کرنے کی

---

(۵۳) اس طرح کی جذباتی قربانی کی مثالیں اس تحریک کے بعد کے قائدین میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً، جب مولانا نصیر الدین دہلویؒ نے سرحد جا کر تحریک کو مضبوط کرنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے اپنی عمر رسیدہ والدہ سے ہجرت کے لئے اجازت لی اور ۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۱۲ر اپریل ۱۸۳۵ء) کو سفر پر دلی سے نکل پڑے۔ اس طرح وہ اپنے رفقاء کے ساتھ عید الاضحیٰ سے صرف چند دن قبل عرب سرائے نامی مقام پر چلے گئے جو دلی سے صرف چار میل دور تھا۔ اگر وہ صرف چند دنوں کے لئے اپنا سفر مؤخر کردیتے اور وطن میں اعزہ کے ساتھ عید کر لیتے تو انہیں بھی خوشی ہوتی اور ان کے اعزہ کو بھی جن سے انہیں اس دنیا میں پھر ملنا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن، جیسا کہ غلام رسول مہر نے لکھا ہے، اپنے مشن کے دھن نے انہیں صرف چند دن کے لئے بھی اپنا سفر مؤخر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ (سرگزشت مجاہدین، ۱۳۳)۔

کوشش کی، لیکن ان حکمرانوں نے ان کے پیغام میں ذرا بھی دلچسپی نہ لی۔ (۵۴)

حیدر آباد سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ رانی پور پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات صبغت اللہ راشدی سے ہوئی جو علاقے کے مشہور روحانی پیشوا اور حُر پارٹی کے بانی تھے۔ صرف بلوچ قبائل میں ان کے تین لاکھ مرید تھے۔ وہ نہ صرف ایک شیخ طریقت تھے بلکہ نہایت دور اندیش اور دردمند مسلمان تھے۔ انہوں نے غیر اسلامی طاقتوں کے علاقے پر قبضہ کرنے کے عزائم کا اندازہ کر لیا تھا اور پیش بندی کے طور پر اپنے مریدین کی فوجی نہج پر تربیت شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اس سفر دعوت اصلاح و جہاد میں سید صاحبؒ کے ساتھ ہو جانے کا فیصلہ کیا لیکن سید صاحبؒ نے انہیں اپنے علاقے میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا اور تاکید کی کہ وہ وہاں لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کریں اور وقت آنے پر سکھوں پر دباؤ کی نیت سے انہیں اپنی طرف فوجی مہم میں الجھالیں۔ (۵۵) رانی پور سے نکل کر پیر کوٹ ہوتے ہوئے سید صاحبؒ شکار پور پہنچے جو سندھ کا ایک بڑا شہر اور تجارتی مرکز تھا۔ وہاں کے حاکم آغا محمد کاظم اور عوام نے سید صاحبؒ کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ سید صاحبؒ اور مجاہدین نے وہاں عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی۔

سید صاحبؒ کی اگلی منزل شال تھی جہاں پہونچنے کے لئے انہیں ایک سو بیس کوس کا طویل پہاڑی علاقہ پار کرنا تھا۔ یہ پورا خطہ انتہائی دشوار گزار تھا۔ راستے میں پانی کم یاب تھا اور راستے کا تعین تو بس ستاروں کی مدد سے کیا جا سکتا تھا۔ سب سے مشکل مسئلہ گرمی کا تھا جس نے اس پورے پہاڑی علاقے کو ایک ناممکن رہ گزر بنا دیا تھا۔ مقامی لوگوں نے سید صاحبؒ کو وہاں ٹھہر کر برسات کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا لیکن انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور شکار پور سے نکل کر جاگن پہنچے جہاں ان کی ملاقات سید انور شاہ امرتسری سے ہوئی جو ایک معروف شخصیت کے حامل تھے اور سکھوں کے مضبوط مخالف تھے۔ (۵۶) مختلف مقامات پر لوگوں نے سید صاحبؒ اور مجاہدین کی پذیرائی کی، سید صاحبؒ سے بیعت کی اور جہاد شروع ہوتے ہی آملنے کا عہد کیا۔

مزید چند مقامات پر قیام کرنے کے بعد سید صاحبؒ ڈھاڈر اور وہاں سے درہ بولان پہنچے یہ درہ

---

(۵۴) صوبہ سندھ کو انگریزوں نے ۵ مارچ ۱۸۴۳ء میں سید صاحبؒ کی ہجرت کے صرف سترہ برس کے بعد اپنی ریاست میں ملا لیا۔ (ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۵۵)۔

(۵۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۵۷۔۴۵۹۔

(۵۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۶۷۔۴۶۸۔

پہاڑوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی ایک قدرتی گھاٹی ہے جو ہندوستان سے افغانستان تک راستہ بناتی ہے۔اس کی لمبائی تقریباپچپن (۵۵) میل ہے جو کئی مقامات پر بہت تنگ اور نہایت خطرناک ہوگئی ہے۔سید صاحبؒ اور مجاہدین نے چار پانچ دنوں میں اسے قطع کیا اور شال پہنچے۔شال کا حاکم ایک باعمل مسلمان اور مضبوط حکمراں تھا۔ وہ سید صاحب سےؒ اس قدر متاثر ہوا کہ ساتھ ہو جانے کے اجازت چاہی۔لیکن سید صاحبؒ نے اسے اپنے مقام پر ٹھہرنے اور ہدایت کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔

جب سید صاحبؒ قندھار پہنچے تو وہاں کے حاکم کے پیغام بروں اور رؤساء شہر نے آگے بڑھ کر قافلے کا خیر مقدم کیا اور حاکم شہر پر دل خان اور عوام نے بڑے جوش و محبت کا اظہار کیا۔گرچہ وہاں سید صاحبؒ کا صرف چار، پانچ دن قیام رہا لیکن لوگوں میں جہاد میں شمولیت کا ایسا جذبہ دیکھنے میں آیا جو اس سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آیا تھا۔بڑی تعداد میں لوگ جہاد میں شرکت کی غرض سے سید صاحبؒ کے ساتھ ہو جانے کے لئے تیاری کرنے لگے۔پر دل خان اس صورت حال سے فکر مند ہو گیا۔اس نے سید صاحبؒ کو آگے کی منزل کا سفر جلد اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور درخواست کی کہ قندھار کے لوگوں کی معیت کی درخواست قبول نہ کی جائے۔ چونکہ سید صاحبؒ علاقے کے کسی مسلمان حکمراں سے رشتہ بگاڑنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے انہوں نے قندھار سے پشاور کی طرف پیش قدمی کی اور قندھار کے کسی شخص کو ساتھ نہیں لیا۔لیکن پر دل خان کے حکم سے مقامی لوگوں کو روکنے کے لئے شہر کے دروازے بند کر دئے جانے کے باوجود تقریبا چار سو قندھاری کسی طرح شہر سے نکل آئے اور قلعہ آعظم خان میں سید صاحبؒ سے آملے۔پر دل خان کی رائے اور اجازت سے سید صاحبؒ نے دو سو ستر (۲۷۰) لوگوں کو اپنے ساتھ لے لیا اور ان کا ایک علیحدہ دستہ قائم کیا۔ باقی لوگوں کو سید صاحبؒ نے سمجھا کر رخصت کیا اور فرمایا کہ جہاد شروع ہو جانے کا انتظار کریں اور اس وقت آکر شریک ہوں۔

قلعہ آعظم خان سے نکل کر سید صاحبؒ قلعہ رمضان خان پہنچے، جہاں سے غلزئی قبیلہ کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔غلزئی قبیلہ کے سرداروں نے سید صاحبؒ کا خیر مقدم کیا اور ہر طرح کی مدد کی پیش کش کی۔سید صاحبؒ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ مناسب موقعہ پر ان سے جہاد میں شرکت کی درخواست کی جائے گی۔سید صاحب کے آمد سے غلزئی قبیلے میں جہاد کی دعوت پہنچ گئی اور پورے قبیلے میں اسلام کی خدمت وحمایت کا جوش وجذبہ پیدا ہو گیا۔غلزئی قبیلے کے ایک بڑے سردار خان خانان نے پیش کش کی کہ جب بھی اسے بلایا گیا، وہ چالیس ہزار سے پچاس ہزار

جوانوں کے ساتھ رفاقت اختیار کرے گا۔ ایک دوسرے سردار شہاب الدین خان نے بھی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ جہاد میں شرکت کا وعدہ کیا۔ (۵۷)

قندھار کے بعد بعض مقامات پر مختصر قیام کرتے ہوئے سید صاحبؒ غزنی پہنچے۔ عوام و خواص نے شہر سے باہر آ کر قافلے کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ حاکم شہر میر محمد خان نے اپنے لڑکے اور نائب کو سید صاحبؒ کے استقبال کے لئے بھیجا۔ بعد میں وہ خود حاضر خدمت ہوا اور بیعت سے مشرف ہوا۔ سید صاحبؒ چوتھے دن وہاں سے نکل کر عازم کابل ہوئے۔

کابل میں پچاس گھوڑ سوار اور پیادہ سپاہیوں کی ایک اچھی تعداد نے شہر سے باہر نکل کر حاکم شہر کی طرف سے سید صاحبؒ کا خیر مقدم کیا۔ رؤساء، علماء اور عوام بھی بڑی تعداد میں شہر سے باہر نکل آئے۔ حصار کے دروازے پر سلطان محمد خان، حاکم کابل، اپنے تینوں بھائیوں اور پچاس سواروں کے ساتھ خوش آمدید کہنے کو موجود تھا۔ کابل میں ڈیڑھ مہینہ قیام کرنے کے بعد سید صاحبؒ نے پشاور کا قصد کیا اور ہشت نگر پہنچے۔ وہاں عوام کا جوش استقبال قابل دید تھا۔ سلطان محمد خان کا چھوٹا بھائی سردار سید محمد خان بالا حصار سے سید صاحبؒ کے زیارت و ملاقات کو پشاور آیا اور اپنے ساتھیوں اور مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ان تفصیلات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر سرحد میں سید صاحبؒ کے لئے حالات اس طرح ناسازگار نہ ہو گئے ہوتے جن کی تفصیل آگے آتی ہے تو وہ پورا علاقہ جس سے سید صاحبؒ کا قافلہ گزرا، احیاء اسلام کے لئے ان کی قیادت میں ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا۔ سید صاحبؒ نے احیاء اسلام کا جو عظیم الشان مقصد سامنے رکھا تھا، اس کے لئے انہوں نے بھرپور اور قابل اعتماد بنیاد اپنے عوامی رابطہ کے ذریعہ ہندوستان کے دوروں میں اور اس کے بعد سرحد کے سفر کے دوران عملی طور پر ڈال دی تھی۔ یہ خیال کہ ان کی تحریک میں زمینی محنت کی کمی تھی، حقائق پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

سکھوں سے مقابلہ

سید صاحبؒ جیسے ہی چارسدہ پہنچے، ایک ایسا واقعہ سامنے آیا جس سے صورت حال یکسر بدل گئی۔ اطلاع ملی کہ سردار بدھ سنگھ ایک سکھ لشکر کے ساتھ علاقے میں داخل ہو گیا ہے اور اکوڑہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسے خواص خان اپنی مدد کے لئے لایا تھا جو والیٔ اکوڑہ امیر خان خٹک کے

(۵۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۲۸۸۔۲۸۹۔

خلاف اکوڑہ کی حکومت کا دعویدار تھا۔ سکھوں کی فوج کی آمد سے علاقے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ امیر خان خٹک جو اس وقت اکوڑہ کا حاکم تھا، سید صاحبؒ کے پاس حاضر ہوا اور مدد چاہی۔ اس نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، علاقے میں جہاد کے نظم ونسق کرنے میں پورا تعاون کرنے کا وعدہ کیا اور عرض گزار ہوا کہ اگر بدھ سنگھ کو نہ روکا گیا تو سمہ کے معصوم شہریوں کی بربادی یقینی ہے۔ (۵۸)

سید صاحبؒ نے صورت حال پر گہرائی سے غور خوض کیا۔ اولاً، اگر علاقے میں سید صاحبؒ اور مجاہدین کی موجودگی کے باوجود سردار بدھ سنگھ کو سمہ کو لوٹنے اور برباد کرنے کا موقع دے دیا جاتا تو یقیناً علاقے کے مسلمانوں کی نگاہ میں سید صاحبؒ کی حیثیت سکھ کے مظالم کو روکنے اور ان کا مقابلہ کرنے والی ایک مسلم قیادت کے طور پر مجروح ہو جاتی۔ دوئم، حالات نے امیر خان خٹک، والیٔ اکوڑہ کو سید صاحبؒ کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا جس سے جہاد میں اس کے تعاون کا امکان پیدا ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ ایک ایسا موقع تھا جس کی مدد سے علاقے کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کیا جا سکتا تھا۔ سید صاحبؒ نے امیر خان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

سید صاحبؒ نے پیش قدمی کی اور ۱۸ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ پہنچے۔ اس وقت تک بدھ سنگھ اکوڑہ میں داخل ہو چکا تھا۔ سید صاحبؒ کا علاقے میں ورود سکھوں کے لئے ایک عسکری چیلنج تھا اور وہ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ سات ہزار سے دس ہزار سکھوں کی فوج اکوڑہ میں تھی اور پندرہ سو مسلمانوں کی فوج نوشہرہ میں۔

جہاد کا آغاز

مسلمانوں نے سکھوں پر اچانک شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا اس لئے کہ شب خون میں مسلمانوں کی فوج کا ایک حصہ ہی استعمال ہوتا اور باقی سپاہی محفوظ اور تازہ دم رہتے جب کہ دشمن کی پوری فوج حملے سے متاثر ہو جاتی۔ مزید، مجاہدین کو مقامی ساتھیوں کی ہمت اور ثابت قدمی کا بھی تجربہ ہو جاتا اور سکھوں کے جنگ کرنے کے انداز کا بھی۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ مجاہدین کا پہلا معرکہ تھا اس لئے ضروری تھا کہ انہیں اس میں فتح حاصل ہوتا کہ وہ علاقے کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکیں۔

(۵۸) سمہ وہ علاقہ ہے جو دریائے سندھ سے سرحدی پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔ پشاور اور مردان اسی علاقے میں ہیں۔ (ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۴۹۷، فوٹ نوٹ ۱)۔

شب خون کے لئے نو سو (۹۰۰) افراد پر مشتمل ایک دستہ تیار کیا گیا جس کی قیادت اللہ بخش مورانی کو دی گئی۔ اس میں ایک سو چھتیس (۱۳۶) ہندوستانی مجاہدین، اسّی (۸۰) قندھاری اور باقی مقامی مسلمان تھے۔ ۲۰ ردسمبر ۱۸۲۶ء (۲۰ جمادی الاولی ۱۲۴۲ء) کو رات کی تاریکی میں مجاہدین نے کشتی سے ندی پار کیا اور سکھ فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ چونکہ سکھ اس حملہ کے لئے تیار نہ تھے، وہ منظم ہو کر مدافعت نہ کر سکے اور بہت جانی نقصان اٹھایا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے صف میں ایک بڑی بے اصولی دیکھی۔ جو مقامی مسلمان اس معرکہ میں شریک ہوئے تھے، وہ لوٹ مار میں لگ گئے اور مال غنیمت سمیٹ کر میدان سے نکل گئے۔ اس طرح لڑائی کا سارا بوجھ ہندوستانی اور قندھاری مجاہدین پر پڑ گیا۔ ادھر سکھوں نے سنبھالا لیا اور مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ مسلم کمانڈر اللہ بخش خان نے بڑھتے ہوئے سکھوں پر جوابی حملہ کیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس جدوجہد میں وہ شہید ہو گئے۔ اکبر خان بھیلدار نے کمان سنبھالی اور چونکہ شب خون کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے مجاہدین کو واپسی کا حکم دیا۔ تقریباً سات سو سکھ اور بیاسی مجاہدین اس معرکہ میں کام آئے۔ یہ جنگ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو لڑی گئی۔ (۵۹)

مجاہدین کے اس حملہ سے سکھوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔ بدھ سنگھ نے اکوڑہ چھوڑ دیا اور شیدو منتقل ہو گیا۔ وہ دریا پار کر کے سکھ کے علاقہ اٹک میں داخل ہو جانا چاہتا تھا لیکن اٹک کے قلعہ دار نے اسے یہ کہہ کر روکا کہ سرحدی علاقے سے سکھ فوج کے پیچھے ہٹ جانے پر اٹک پر جو سکھوں کی عمل داری میں تھا مجاہدین کے براہ راست حملہ کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ اٹک کے حاکم نے راجہ رنجیت سنگھ سے فوجی مدد بھی طلب کی۔ رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ یوسف زئی کے قبیلے کے سردار اور عوام سید صاحبؒ کے گرد جمع ہو رہے ہیں، اس لئے اس نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ایک فوجی دستہ روانہ کیا جس کی کمان اس نے اپنے بیٹے کو دی اور اس کی مدد کے لئے تجربہ کار اور آزمودہ کمانڈر بھی ساتھ کر دیئے۔ سکھ فوج ہتھیار، توپ اور ضروری سامان سے لیس تھی۔ (۶۰)

اکوڑہ کی جنگ میں مجاہدین کی کامیابی سے مقامی لوگوں میں سید صاحبؒ کی قیادت اور عسکری قوت پر اعتماد پیدا ہوا۔ مقامی سرداروں میں سب سے پہلے سردار خادی خان، والئی ہنڈ نے حاضر ہو کر سید صاحبؒ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور نیاز مندانہ عرض کیا کہ سید صاحبؒ اس کی ریاست

---

(۵۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، ۵۰۸۔

(۶۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۴۳۔۳۴۴۔

ہُنڈ چلیں اور اسے جہاد کے مرکز کے طور پر استعمال کریں۔ چونکہ ہنڈ میں ایک مضبوط قلعہ تھا اور والئی ریاست میزبانی کا خواہش مند تھا، سید صاحبؒ نے یہ مشورہ قبول کیا اور اپنے مجاہدین کے ساتھ ہنڈ منتقل ہو گئے، جو اٹک سے سترہ میل کی دوری پر دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ منتقلی کے دوران وہ بازار نامی مقام پر ٹھہرے جو ہنڈ سے ایک میل شمال میں واقع ہے، اس جگہ نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی جہاں مقامی مسلمانوں نے بڑی تعداد میں سید صاحبؒ کی طرف رجوع کیا۔

حضرو پر چھاپہ

کچھ دنوں کے بعد سکھوں پر دوسرا حملہ کیا گیا۔ اس بار نشانہ حضرو نامی ایک تجارتی شہر تھا جو دریائے سندھ کے کنارے سے تقریباً سات میل کی دوری پر آباد تھا اور سکھوں کی عملداری میں تھا۔ یہ مہم ہر طرح سے کامیاب رہی لیکن اس موقعہ پر بھی مقامی مسلمانوں میں وہی اخلاقی کمزوری دیکھنے میں آئی جو اکوڑہ کی جنگ میں سامنے آئی تھی۔ انہوں نے قیمتی اشیاء لوٹنے پر ہی اپنی توجہ صرف کی اور مال غنیمت ملتے ہی میدان جنگ سے نکل آئے۔ واپسی کے بعد انہوں نے مال غنیمت پر اپنا حق سمجھا اور اسے شرعی احکام کے مطابق تقسیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا جب سید صاحبؒ نے محسوس کیا کہ جہاد کی مہم میں حصہ لینے والوں کو مقصد جہاد سے مانوس کرنے اور انہیں ایک مضبوط نظم و نسق کا پابند کرنے کی اشد اور فوری ضرورت تھی۔ اب سید صاحبؒ بازار سے، جہاں ان کا قیام تین ماہ رہا، ہنڈ منتقل ہو گئے۔

سید صاحبؒ کا بحیثیت امیر المومنین انتخاب

یہ بات عام طور سے محسوس کی گئی کہ جہاد میں حصہ لینے والوں کے لئے جہاد کے اعلیٰ مقاصد سے واقفیت اور جنگ میں اسلامی اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد سے علاقے کے اہم سردار مثلاً ہنڈ کے حاکم خادی خان، پنجتار کے حاکم فتح خان اور زیدہ کے حاکم اشرف خان نے اس مسئلہ پر علماء سے تبادلۂ خیال کیا اور خصوصاً حضرت شاہ اسماعیلؒ سے راہنمائی چاہی۔ مشورے میں یہ بات سامنے آئی کہ تحریک کو صحیح رخ پر رکھنے کے لئے مسلمانوں کو اپنے لئے ایک امام کا انتخاب کرنا چاہیئے جو جہاد کی تنظیم اور نگہداشت کا ذمہ دار ہو۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہوا کہ امامت کے سارے شرعی شرائط حضرت سید صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس لئے ۱۱/

جنوری ۱۸۲۷ء (۱۲ ر جمادی الاخری ۱۲۴۲ء) کو علاقے کے رؤسا، علماء، سید اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ہنڈ میں جمع ہو کر مکمل اتفاق رائے سے حضرت سید صاحبؒ کو امام منتخب کیا اور ان کے ہاتھوں پر بیعتِ امامت کی۔ دوسرے دن جمعہ کے خطبہ میں بہ حیثیت امیر المؤمنین سید صاحبؒ کا نام شامل کیا گیا۔ (۶۱)

سید صاحبؒ کے امیر المؤمنین کی حیثیت سے انتخاب نے سرحد کے مسلمانوں میں خود اعتمادی، جوش اور اتحاد کا جذبہ پیدا کر دیا اور دور ونزدیک سے مسلمان آ آ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ ان کے امیر المؤمنین منتخب کیے جانے کی اطلاع ہندوستان کے علماء وخواص کو بھیجی گئی اور اس مضمون کے خطوط سرحد کے علماء، رؤساء، سید اور بااثر اشخاص کو بھی بھیجے گئے۔ سب نے اس اطلاع کا پر جوش خیر مقدم کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ پشاور کے حکمراں سردار یار محمد خان اور سردار سلطان محمد خان نے اطاعت اور مسرت کے اظہار کے طور پر پانچ سو سواروں اور توپوں کے ساتھ پشاور سے پیش قدمی کی اور سرمئی نامی مقام پر سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے آپ کو اسلام کی ہر خدمت کے لئے پیش کیا۔

شیدو کی جنگ

کچھ ہی دنوں کے بعد ہنڈ میں علاقے کے بارسوخ حضرات کا ایک اہم اجتماع ہوا جس میں سرداران سمہ خادی خان حاکم ہنڈ، اشرف خان حاکم زیدہ، فتح خان حاکم پنجتار اور یار محمد خان اور سلطان محمد خان حاکم پشاور بھی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں سمہ کے علاقے میں رنجیت سنگھ حاکم لاہور کی بے جا سیاسی دخل اندازی، فوج کشی اور سرداران سمہ کو جبراً اپنی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کرنے کے مسئلہ پر غور وخوض کیا گیا۔ سب ہی پنجاب کی سکھ حکومت کے استحصال سے نالاں تھے اور اسے سمہ علاقے کے حق آزادی کے خلاف سمجھتے تھے۔ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ متحد ہو کر سکھ ریاست کے ظلم وزیادتی کا مقابلہ کیا جائے اور اس کی حاکمیت کو چیلنج کرنے کی غرض سے رنجیت سنگھ کی فوج کے اس دستے پر جو شیدو میں سردار بدھ سنگھ کے ماتحت ٹھہرا ہوا تھا، حملہ کیا جائے۔ شیدو،

(۶۱) جو بیعت سید صاحبؒ سے پہلے کی جاتی تھی وہ بیعت طریقت ہوتی تھی جو لوگ توبہ اور تزکیۂ نفس کی نیت سے کرتے تھے۔ بیعت امامت کا مقصد امت مسلمہ کی طرف سے ایک ایسے اہل شخص کو اپنے مذہبی رہنما کی حیثیت سے منتخب کرنا ہوتا ہے جو اسلامی شریعت کے مطابق اپنے ماتحت مسلمانوں کی راہنمائی کرتا ہے اور جس کے فیصلے کی شرعی حیثیت ہوتی ہے۔ ایسے شخص کو اسلام کی اصطلاح میں ''امام'' یا ''امیر المؤمنین'' کہا جاتا ہے۔

اکوڑہ سے کوئی چار میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس جنگ کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوئیں اور دو ماہ کی مدت میں اسی ہزار (۸۰،۰۰۰) مسلمان سید صاحبؒ کے جھنڈے تلے سکھوں سے جنگ کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ یہ ایک تاریخی موڑ تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں مسلمان اس علاقے میں سکھوں سے لوہا لینے کے لئے ایک قیادت کے ماتحت پہلے کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ میسن (Charles Masson) لکھتا ہے: ''سید صاحب کا ساتھ دینے والے بے شمار گروہ تھے۔ ان کی فیروزمندی گرچہ یقینی نہ تھی، تاہم غیر اغلب بھی نظر نہیں آتی تھی۔''(۶۲)

دونوں فوجیں شیدو کے نزدیک ایک دوسرے کے مقابل آگئیں۔ (۶۳) بدھ سنگھ کی فوج پینتیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جو ہتھیار سے لیس بھی تھی اور تربیت یافتہ بھی۔ اس کے علاوہ کئی تجربہ کار کمانڈر بھی بدھ سنگھ کے ساتھ تھے۔ لیکن اس کے باوجود سکھوں کو زبردست خطرہ درپیش تھا، اس لئے کہ ان کا سامنا اسی ہزار ایسے جوانوں سے تھا جن کی ہمت بلند تھی۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر سردار بدھ سنگھ نے پوشیدہ طور پر سردار یار محمد خان سے رابطہ قائم کر کے اسے رنجیت سنگھ کی انتقامی کاروائی سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً وہ سردار یار محمد خان کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ یار محمد خان میدان جنگ میں سید صاحبؒ کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس طرح ایک سازش تیار کی گئی جسے یار محمد خان کو دو حصوں میں انجام دینا تھا۔ پہلے اسے سید صاحبؒ کو زہر دینا تھا، دوسرے میدان جنگ میں انہیں تنہا چھوڑ دینا تھا تاکہ سکھوں کی فتح یقینی ہو جائے۔

جنگ شیدو سے ایک رات قبل یار محمد خان کی طرف سے معمول کے مطابق سید صاحبؒ کے لئے کھانا بھیجا گیا۔ کھانا کھاتے ہی ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی۔ انہیں شدید متلی اور قے کی شکایت ہو گئی اور تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ بار بار بیہوش ہو جاتے تھے۔ سارے آثار بتا رہے تھے کہ انہیں زہر دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کے علاج کا مناسب انتظام کیا جاتا، رات گزر گئی اور جنگ کا دن آپہنچا۔ صبح جب دونوں فوجیں صف آرا ہونے لگیں تو یار محمد خان نے سید صاحبؒ کے لئے ایک ہاتھی بھیجا تاکہ وہ میدان جنگ میں تشریف لائیں۔ سید صاحبؒ کی طبیعت بہت خراب تھی اور بار بار ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی، لیکن وہ ہاتھی پر سوار ہوئے اور میدان جنگ کا رخ

(۶۲) میسن Charles Masson، Narrative of Various Journies (1842), vol. 3, بحوالہ غلام رسول مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۶۱۔

(۶۳) کسی مورخ نے اس جنگ کی تاریخ نہیں لکھی ہے۔ (مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۷۲)

کیا۔ صورت حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے حضرت شاہ اسماعیلؒ بھی ہاتھی پر سوار ہو گئے تا کہ وہ اپنے بیمار سالار کی ضرورت پڑنے پر مدد کر سکیں۔

سکھ فوج نے شیدو گاؤں کے نزدیک ایک خشک نہر میں مورچہ بنایا تھا۔ ان کے سامنے مسلمان فوج ہلال کی شکل میں پہاڑی کے دامن سے لنڈے ندی کے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ سکھوں نے مسلم فوج پر گولیاں برسا کر جنگ کا آغاز کیا۔ مسلم فوج نے بھی مختلف سمتوں سے سکھ مورچوں پر حملہ کیا۔ ان کے گھوڑ سوار دستے نے سکھوں کے اس مورچہ پر حملہ کیا جو انہوں نے نہر میں قائم کیا تھا۔ امیر احمد خان باجوری پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ سکھوں کے اگلے دستے پر حملہ آور ہوا۔ سکھ فوج کے مورچے ان حملوں سے بری طرح متاثر ہوئے اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی۔ نتیجتاً سکھوں نے پسپائی اختیار کی اور نہر سے پیچھے ہٹ کر نئے مورچے قائم کئے۔ مسلمان سپاہیوں نے پیچھے ہٹتے ہوئے سکھوں پر حملہ کیا اور انہیں مزید پیچھے دھکیل دیا۔ پھر سکھوں پر گذری شاہزادہ نے جو علاقے کے ایک جلیل القدر پیر زادہ تھے نہایت شدید حملہ کیا۔ گذری شاہزادہ کے حملہ نے خاص طور پر سکھوں کی دفاعی طاقت کو توڑ دیا اور میدان جنگ میں مسلمانوں کا غلبہ صاف نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے سکھوں کے توپ خاموش ہو گئے اور سکھ فوج نے منظم طور پر پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہ مسلمانوں کے فتح کی کھلی علامت تھی۔ ایک مجاہد نے سید صاحبؒ کو فتح کی خوش خبری بھی سنا دی۔ (۶۴)

لیکن اس وقت جب سکھوں کی شکست یقینی ہو گئی تھی، سردار یار محمد خان نے جو پوری لڑائی میں ایک طرف اپنے سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، میدان جنگ سے اپنے سپاہیوں کے ساتھ فرار اختیار کیا۔ (۶۵) اس کے ساتھ اس کے بھائی سلطان محمد خان اور پیر محمد خان نے بھی میدان چھوڑ دیا۔ انہیں دیکھ کر سمہ کے دوسرے مقامی سپاہی بھی بھاگ کھڑے

---

(۶۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۷۰۔۳۷۱۔

(۶۵) سوہن لال اپنی کتاب عمدۃ التواریخ میں لکھتے ہیں: ”اٹک پار کے لوگوں کا بیان ہے کہ جب جنگ کی آگ بھڑکی تو یار محمد خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحبؒ کو زہر دے دیا اور خود بھاگ نکلنے کی ٹھان لی۔ اس کا لشکر بھی ساتھ ہی فرار ہو گیا۔“ (مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۷۳۔۳۷۴)۔ ولیم ہنٹر نے بھی یار محمد خان اور سکھوں کی اس سازش کی ان الفاظ میں تصدیق کی ہے: ”وہاں [پشاور] کے صوبہ دار [یار محمد خان] نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے دغابازی سے امام صاحب [سید احمد شہیدؒ] کو زہر دینے کی کوشش کی۔“ (ہمارے ہندوستانی مسلمان، ۲۹۔۳۰)۔ یار محمد خان کے میدان جنگ میں سید صاحبؒ کا ساتھ چھوڑ جانے کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ہنٹر آگے لکھتا ہے: ”ایک موقع پر تو ان سرحدی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوئے۔اس طرح میدان میں صرف مجاہدین باقی بچ گئے یا گڈری شاہزادہ اور اس کے رفقاء۔ گڈری شاہزادہ اور اس کے ساتھیوں نے آخری دم تک سکھوں سے جنگ کی اور شہادت پائی۔

ہندوستانی اور قندھاری مجاہدین سید صاحبؒ کے گرد جمع تھے۔سید صاحبؒ کی طبیعت بہت خراب تھی۔حضرت شاہ اسماعیلؒ نے میدان جنگ کا جائزہ لینے کے بعد سید صاحبؒ کے ساتھ مراجعت اختیار کی۔اس وقت ان کا اولین مقصد اپنے بیمار سالار کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانا تھا۔کچھ دیر تک تو وہ سید صاحبؒ کے ساتھ ہاتھی پر سوار رہے لیکن تعاقب کے پیش نظر انہوں نے سید صاحبؒ کو اپنے چند معتمد مجاہدین کی حفاظت میں ایک گھوڑے پر بابرا نامی ایک گاؤں بھیج دیا اور خود ہاتھی پر سوار رہے اور اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تاکہ تعاقب کی صورت میں سکھ دھوکہ کھا جائیں۔بابرا پہنچ کر سید صاحبؒ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔چنانچہ جب انہیں وہاں سے چھنگلئی لے جانے کا مشورہ ہوا تو وہ گھوڑے پر سفر کرنے کے لائق نہ تھے۔اس لئے انہیں چارپائی پر چار آدمیوں کی مدد سے وہاں لے جایا گیا۔چھنگلئی پہنچنے کے بعد بھی آٹھ دنوں تک وہ خاصے بیمار رہے لیکن اس کے بعد ان کی طبیعت سنبھلنے لگی۔انہوں نے ان مجاہدین کو جو تورو اور پنجتار میں مقیم تھے، چھنگلئی بلالیا اور ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کی۔پھر سب نے سید صاحبؒ کی قیادت میں دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اپنی جانی، انجانی غلطیوں کے لئے اللہ تعالی سے معافی طلب کرنے کے ساتھ اس بات کے لئے خصوصی دعاء کی کہ ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئے۔

دوبارہ میدان میں

صحت مند ہونے کے بعد سید صاحبؒ دوبارہ عزم وہمت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر کسی خوف ومرعوبیت کے چملہ، بونیر اور سوات کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو اسلام کے سیدھے اور سچے اصولوں کے اپنانے اور سکھوں کے ظلم وزیادتی اور استحصال کی خلاف متحد ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس سلسلے میں علاقے کے مختلف قبائل کو دعوتی خطوط بھی لکھے۔جہاں جہاں سید صاحبؒ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) قبائل میں سے ایک نے عین لڑائی کے وقت غداری کی۔" (۲۹)۔پھر اسی صفحہ پر فوٹ نوٹ (۱) میں وہ اس قبیلہ کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے: "بارک زئی پٹھانوں نے شیدو کے مقام پر جب سکھوں سے لڑائی ہوئی تھی۔" بعد میں یار محمد خان کے دونوں نوکروں کو جنہوں نے اس کے حکم سے سید صاحبؒ کو زہر دیا تھا، گرفتار بھی کرلیا گیا تھا۔(مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۹۸)

تشریف لے گئے، لوگوں نے گرم جوشی کا اظہار کیا اور تعاون کا یقین دلایا۔ کئی بڑے قبائل نے بھی حمایت کا وعدہ کیا۔

اس دوران میں ایسی چند اہم باتیں ہوئیں جن کا تحریک پر گہرا اثر پڑا۔ اولاً، مولانا محمد یوسف پھلتی، جو سید صاحبؒ کے معتمد رفیق، مسلم فوج کے خازن، اور رسد کے ذمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت برگزیدہ شخص تھے، اوچ نامی مقام پر بیمار پڑے اور اسی علالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا انتقال سید صاحبؒ کے لئے ایک ذاتی صدمہ اور سارے مجاہدین کے لئے ایک خسارہ تھا۔ دوئم، اسی دورے کے درمیان ہندوستان سے مجاہدین کی پہلی جماعت جہاد میں شرکت کی نیت سے سرحد پہنچی۔ اس کے بعد ایسی کئی اور جماعتیں آئیں۔ یہ ایک پیغام تھا کہ ہندوستان کے علماء اور عام مسلمان سید صاحبؒ کی سرحد میں احیاء اسلام کی کوشش کی تائید کرتے ہیں اور اس میں عملی طور پر شریک ہیں۔ سوئم، مولانا عبدالحی بڈھانویؒ بھی ہندوستان سے تشریف لائے اور سید صاحبؒ سے آملے۔ سید صاحبؒ نے خود آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ان کی آمد سے سید صاحبؒ اور مجاہدین کو، جن کے دلوں میں مولانا محمد یوسفؒ کی جدائی کا غم تازہ تھا، انتہائی خوشی اور تقویت حاصل ہوئی۔

ہزارہ مہم

سید صاحبؒ نے شاہ اسماعیلؒ کو ہزارہ اس خاص مہم پر روانہ کیا کہ وہ وہاں کے مسلمان سرداروں سے رابطہ قائم کریں اور انہیں سکھوں کے خلاف جہاد کی دعوت دیں۔ شاہ اسماعیلؒ ایک سو پچاس مجاہدین کے ساتھ ہزارہ تشریف لے گئے اور وہاں مختلف قبائل کے سرداروں سے مل کر انہیں سید صاحبؒ کے مشن سے مانوس کرنے کی کوشش کی، لیکن انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اول تو وہ لوگ سکھوں کے خلاف سید صاحبؒ کا ساتھ دینا اس وقت تک مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے جب تک کہ سید صاحبؒ کی کامیابی یقینی نہ ہو۔ دوسرے، ان کے درمیان اختلافات تھے جنہیں سلجھانا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی ان سے متحد ہو کر کام کرنے کی امید کی جا سکتی تھی۔

ڈمگلا پر شب خون

ہزارہ کے سفر نے شاہ اسماعیلؒ کو سکھوں سے جنگ کا ایک موقعہ فراہم کیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی خود اعتمادی مضبوط ہوئی۔ ڈمگلا میں کئی ہزار سکھ مقیم تھے۔ شاہ اسماعیلؒ نے ان پر حملہ کا حکم دیا اور میاں سید محمد مقیم کو اس مہم کا سالار بنایا۔ اگرچہ مجاہدین کو تعداد مختصر تھی، لیکن ان کے ساتھ

پندرہ سو مقامی مسلمان بھی شریک ہو گئے۔ شاہ اسماعیلؒ نے خود شنکیاری نامی مقام پر مجاہدین کے ایک مختصر دستہ کے ساتھ قیام کیا۔ یہ چھاپہ بہت کامیاب رہا۔ میاں مقیم بہت شجاع، مہم جو اور خطرات سے کھیلنے والے شخص تھے۔ چونکہ یہ حملہ اچانک تھا اس لئے سکھ سنبھل نہ سکے اور بے نظمی کی وجہ سے ان کے تین سو سپاہی مارے گئے۔ ادھر صرف چند مجاہدین شہید اور دو تین لوگ زخمی ہوئے۔ (۶۶)

شنکیاری کا معرکہ

میاں محمد مقیم کی واپسی سے قبل شنکیاری میں شاہ اسماعیل کو ایک دوسرا معرکہ پیش آیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، میاں محمد مقیم کو شب خون پر روانہ کرنے کے بعد شاہ اسماعیلؒ شنکیاری میں مقیم تھے کہ اچانک شنکیاری کے قلعہ سے سکھوں کا ایک فوجی دستہ باہر آیا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ گرچہ یہ جھڑپ محدود پیمانے پر ہوئی، لیکن دو سو سے ڈھائی سو سکھ مارے گئے۔ مجاہدین میں سے چھ، سات شہید اور نو، دس زخمی ہوئے۔ (۶۷) شاہ اسماعیل کی ایک انگلی بھی بری طرح زخمی ہو گئی۔ ڈمگلا اور شنکیاری کے معرکے ۱۸۲۷ء کے ستمبر یا اکتوبر میں ہوئے۔ (۶۸) جب شاہ اسماعیلؒ پنجتار پہنچے تو سید صاحبؒ نے آبادی سے باہر آ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ شاہ اسماعیلؒ نے محبت اور عقیدت کے ساتھ سید صاحبؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ان معرکوں میں مسلمانوں کی کامیابی سے علاقے میں مجاہدین کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس دور میں ہندوستان کے علماء سے تعلقات میں بھی نظم پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا شاہ محمد اسحٰق نے دہلی سے کئی بار سید صاحبؒ کی خدمت میں رقوم ارسال کیے۔ (۶۹)

درانیوں کی دشمنی

لیکن جب سید صاحبؒ نے علاقے میں سکھوں کے خلاف جہاد کی فضا ہموار کر لی تو پشاور کے حاکم درانیوں نے ان کے خلاف ایک نیا مورچہ کھول دیا۔ انہوں نے جنگ شیدو کے موقع پر سید صاحبؒ کو دھوکہ دیا تھا اور ایک سازش کے تحت فرار اختیار کر کے مسلمانوں کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا، لیکن اب وہ کھل کر سید صاحبؒ کی مخالفت کرنے لگے۔ اولاً، انہوں نے ہندوستان سے سرحد آنے والے ان لوگوں کو جو جہاد میں شرکت کی نیت سے آئے تھے، روکنا اور تنگ کرنا

(۶۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۴۸۔۵۰۔ (۶۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴۲۶۔
(۶۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴۲۷۔ (۶۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۵۷۔

شروع کیا۔ دوئم، انہوں نے مقامی ساہوکاروں پر پابندی لگادی کہ سید صاحبؒ کے لئے ہندوستان سے آنے والی رقوم کی ہنڈی پر یہاں پیسہ نہ دیں۔ سوئم، انہوں نے مقامی لوگوں کو سید صاحبؒ کے خلاف ابھارنا شروع کیا اور ان سرداروں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا جو سید صاحبؒ کے وفادار تھے۔ اور آخر آجہاں موقعہ ملا، انہوں نے سید صاحبؒ کے خلاف فوجی کاروائی بھی کرنی شروع کردی۔ ایک بار جب سید صاحبؒ خمر جارہے تھے، انہوں نے ایک فوجی دستہ ان کی راہ روکنے کے لئے بھیجا۔ سید صاحبؒ نے راستہ تبدیل کرکے ٹکراؤ کو ٹال دیا۔ انہوں نے درانی سرداروں کو ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ دو مسلم طاقتوں کا ٹکراؤ اسلامی نقطۂ نظر سے ناروا اور علاقے کے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لئے سم قاتل تھا، لیکن بدقسمتی سے درانیوں کی دشمنی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد سید صاحبؒ کو یہ اطلاع ملی کہ درانیوں کی ایک فوج نے لنڈے ندی پار کرلی ہے اور اتمان زئی کے حاکم عالم خان پر حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھ رہا ہے۔ عالم خان سید صاحبؒ کا حلیف تھا اس طرح یہ حملہ دراصل سید صاحبؒ کے اثر ورسوخ کو توڑنے کے لئے تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ فوج براہ راست مجاہدین کے خلاف ہی صف آرا ہو جاتی۔ سید صاحبؒ نے ایک ذمہ دار مذہبی رہنما کی حیثیت سے علاقے کے خوانین اور علماء کا ایک اجتماع منعقد کیا اور ان کے سامنے ساری صورت حال رکھ کر ان سے شرعی راہنمائی چاہی۔ علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ پشاور کے درانی سرداروں نے سکھوں کے ساتھ مل کر جنگ شیدو میں مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا تھا اور اب کھل کر اسلامی تحریک کے خلاف صف آرا ہوگئے تھے اور علاقے میں مسلمانوں کے منتخب امام سید صاحبؒ کے خلاف بغاوت کی فضا قائم کررہے تھے، اس لئے شریعت ان کے خلاف جنگ کی اجازت دیتی ہے۔

درانی فوج پر شب خون

اس وقت درانی فوج جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، اتمان زئی میں مقیم تھی۔ سید صاحبؒ نے فیصلہ کیا کہ ضروری اقدام کرکے ان منفی اثرات کو روکا جائے جو درانی فوج کے علاقہ میں موجود ہونے کی وجہ سے پیدا ہورہے تھے۔ انہوں نے اپنے معتمد رفیق ارباب بہرام خان اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خان کو خیبر بھیجا تاکہ وہ اس علاقے کے قبائل کو درانیوں کی مدد نہ کرنے پر آمادہ کریں۔ بہرام خان کی خیبر کے قبائل میں رشتہ داری اور یگانگت تھی۔ ان کا مشن کامیاب رہا۔ اس

طرف سے اطمینان کر کے سید صاحبؒ نے پیش قدمی کی اور ٹوپئی نامی مقام پر قیام کیا۔ وہاں سے انہوں نے درانیوں پر شب خون مارنے کا انتظام کیا اور اس مہم کی کمان شاہ اسماعیلؒ کو سونپی۔ سید صاحبؒ نے خود اتمان زئی کے قریب مورچہ قائم کیا تا کہ جنگ کے وقت درانی پیچھے ہٹ کر اتمان زئی میں اپنا نیا مورچہ نہ بنا سکیں۔

شب خون کامیاب رہا۔ درانی میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مجاہدین نے ان کے دو توپوں پر قبضہ کر لیا۔ (۷۰) درانی اتمان زئی میں بھی جمع نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ سید صاحبؒ نے اس کے قریب مورچہ بنا رکھا تھا۔ اس لئے بھاگتے ہوئے وہ ایک پہاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور وہاں سے مجاہدین پر گولہ باری کرنے لگے۔ چونکہ سید صاحبؒ کا مشن ایک باقاعدہ جنگ کے بجائے درانیوں کی گوش مالی تھی، اس لئے انہوں نے لڑائی کو طول دینا ضروری نہیں سمجھا اور مزید کاروائی ملتوی کر کے پنجتار واپس ہو گئے۔

شریعت کا نفاذ

سید صاحبؒ نے پنجتار واپس ہونے کے بعد علاقے میں اصلاح عام پر دوبارہ توجہ دینے کا فیصلہ کیا تا کہ اسلامی بنیادوں پر سماج کی تشکیل نو کی جا سکے۔ اس وقت بھی سرحدوں میں بہت سی غیر اسلامی رسوم جاری تھیں جنہیں قبائلی روایات کی حمایت حاصل تھی اور لوگوں کی عملی زندگی اسلامی تعلیمات سے بہت دور تھی۔ سید صاحبؒ کی خواہش تھی کہ لوگوں کو اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گذارنے پر آمادہ کیا جائے تا کہ سماج افراط و تفریط سے بچے، امن و انصاف قائم ہو اور اللہ کی رضا حاصل ہو۔ چنانچہ انہوں نے پورے علاقے کا دورہ کیا اور عوام، حاکموں اور علماء سے مل کر انہیں اپنے اپنے علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کی دعوت دی۔ بنیادی طور پر ذہن سازی کے بعد انہوں نے ۶ رفروری ۱۸۲۹ء (ار شعبان ۱۲۴۴ھ) کو ایک جلسہ عام بلایا۔ اس اجتماع میں لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی جس میں دو ہزار علماء اور تقریباً اتنے ہی ان کے شاگرد شامل تھے۔ اپنے افتتاحی خطبہ میں سید صاحبؒ نے لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی دعوت دی۔ سب سے پہلے پنجتار کے حاکم فتح خان نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے اپنی ریاست میں شریعت کے نفاذ کی پیش کش کی۔ اس کے بعد وہاں موجود سارے والیان ریاست نے

---

(۷۰) حسین حسنی، شہید بالاکوٹ، ۱۳۲۔

اپنے اپنے علاقے میں شریعت کے نفاذ کا وعدہ کیا اور اس بات پر سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان لوگوں نے، جن میں زیدہ کے اشرف خان اور ہنڈ کے خادی خان بھی شامل تھے، اسی مضمون پر مشتمل ایک عہد نامہ بھی تحریر کر کے سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کے بعد بھی وہاں کے خوانین پہلے ہی کی طرح وہاں کے حاکم رہے۔ جو نیا نظام چلنا تھا، انہیں کی نگرانی میں چلنا تھا۔ سید صاحبؒ کی ذمہ داری مجموعی طور پر صرف شرعی احکام کے نفاذ کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ ۲۰/ فروری ۱۸۲۹ء (۱۵/شعبان ۱۲۴۴ھ) بروز جمعہ فتح خان پنجتاری نے اپنے قبیلے کے سارے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں اپنے علاقے میں شرعی نظام اپنانے کی ترغیب دی۔ سب نے بخوشی اس بات کو قبول کیا۔ جلد ہی شرعی نظام کے نفاذ کی ضروری تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ سید محمد میر کو پنجتار اور متعلقہ علاقے کا شرعی قاضی مقرر کیا گیا۔ سید محمد حبان کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دیا گیا۔ مُلّا قطب الدین ننگرہاری کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ اسلامی شریعت پر علاقے میں عمل کی نگرانی کریں۔ تیس (۳۰) مسلح سپاہی ان کی ماتحتی میں دیئے گئے۔ علاقہ میں شریعت کے نفاذ کی خیر و برکت بہت جلد نظر آنے لگی۔ وہ جرائم جو قبائلی رسم و رواج کے نام پر کیے جاتے تھے، بہت کم ہو گئے۔ لوگوں کی زندگی، مال اور عزت محفوظ ہو گئی، علاقے میں اللہ کے حکم کو سب سے اونچا درجہ دیا جانے لگا، اور پنجتار نے، جو مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر تھا، ایک مثالی مسلم سوسائٹی کی حیثیت حاصل کر لی۔ (۷۱)

خادی خان کی دشمنی

لیکن احیاءِ اسلام کا یہ کام جاری نہ رہ سکا۔ بد قسمتی سے خادی خان حاکم ہنڈ، جس نے سرحد میں مجاہدین کی میزبانی میں سب پر سبقت کی تھی، سید صاحبؒ کا مخالف ہو گیا اور اس نے ان کے خلاف دشمنانہ قدم بھی اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے خیالات میں اچانک تبدیلی کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ چونکہ دفاعی وجوہات کے پیشِ نظر مجاہدین کا مرکز ہنڈ سے پنجتار منتقل کر دیا گیا، اس لئے فتح خان حاکم پنجتار علاقے میں خادی خان سے زیادہ مشہور ہو گیا جسے خادی خان نے اپنا ذاتی نقصان سمجھا۔ اس کے علاوہ علاقے میں شریعت کے نفاذ سے اس کی حاکمانہ حیثیت پر بھی اثر پڑا اور وہ قبائلی نظام بھی باطل اور نا قابلِ قبول قرار پایا جس پر اس کی حاکمیت کا انحصار تھا۔ سید صاحبؒ نے

---

(۷۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۸۵۔۸۷۔

اس کی غلط فہمی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن اس کی مخالفت بڑھتی ہی گئی۔ جلد ہی وہ کھل کر مخالفانہ کاروائیوں پر اتر آیا۔ اس نے ان مجاہدین کو لوٹنا اور ستانا شروع کر دیا جو سید صاحبؒ کے پاس ہندوستان سے آتے تھے اور جنہیں اس کے علاقے سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے زیدہ کے حاکم اشرف خان پر، جو اس کا خسر تھا، صرف اس لئے حملہ کر دیا کہ اشرف خان سید صاحبؒ کا معتمد اور حلیف تھا۔ جب اسے اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ تنہا سید صاحبؒ کا کچھ زیادہ نقصان نہیں کر سکے گا تو اس نے سکھوں کی معاونت جیسا اسلام مخالفانہ قدم اٹھالیا۔

اس نے رنجیت سنگھ کے مشہور سپہ سالار وینٹورا (Ventura) [۷۴] سے رابطہ قائم کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ علاقے کے سرداروں کو جو سید صاحبؒ کی وجہ سے باغی ہو رہے تھے، قابو میں رکھنے کے لئے سید صاحبؒ کے خلاف فوجی کاروائی ضروری ہے۔ اس نے وینٹورا کو اپنے کھل تعاون کا یقین دلایا اور ضمانت کے طور پر اپنے بھائی امیر خان کو سکھوں کی نگرانی میں دے دیا۔ وینٹورا ایک فوج کے ساتھ دریائے سندھ عبور کر کے سمہ کے علاقے میں داخل ہو گیا اور وہاں کے مسلم خوانین سے راجہ رنجیت سنگھ کی ماتحتی کی علامت کے طور پر تحائف کی مانگ کی جو وہ ہر سال رنجیت سنگھ کو دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ امید تھی، سرداران سمہ نے اس کی مانگ پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے وینٹورا کے سامنے عملی طور پر یہ بات آگئی کہ علاقے کے سرداروں نے سید صاحبؒ کا ساتھ اختیار کر لیا ہے اور اب وہ حکومت پشاور کی ماتحتی قبول کرنے کو آمادہ نہیں ہیں۔ اس نے سید صاحبؒ کو ایک خط لکھا اور علاقہ میں ان کی فوجی موجودگی پر سوال اٹھایا اور کہا کہ وہ رنجیت سنگھ کے ماتحت سرداروں کو اس کی مخالفت پر اکسا رہے ہیں۔ سید صاحبؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ علاقے کے مسلمان سردار اس بات کا آزادانہ حق رکھتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں، مصالحت کریں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ مہاراجہ کا اپنی طاقت کی بناء پر سمہ کے خوانین کو اپنی اطاعت اور محکومی پر مجبور کرنا ناانصافی اور ظلم ہے۔

(۷۴) وینٹورا (Jean Baptiste Ventura) اٹلی یا فرانس میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اٹلی کی اس فوج سے منسلک تھا جسے جوزف بوناپارٹ (Joseph Bonapart) نے نپولین کی حمایت کے لئے تیار کیا تھا۔ اس نے کئی مشہور جنگوں میں حصہ لیا تھا جن میں ۱۸۱۲ء کی روسی مہم اور واٹرلو کی جنگ (Battle of Waterloo) بھی شامل ہے۔ ۱۸۲۲ء میں وہ الارڈ (Allord) نامی ایک فوجی کے ساتھ ہندوستان آیا اور راجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک اونچے عہدے پر ملازم ہو گیا۔ سکھ فوج میں اسے شیر سنگھ کے بعد سب سے بااثر شخص تصور کیا جاتا تھا۔ (محی الدین احمد، ص ۲۱۳، فوٹ نوٹ ۳)

اطلاع ملی کہ وینٹورا نے مجاہدین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اس طرح علاقے میں مجاہدین اور سکھوں کے درمیان جنگ کی صورت ناگزیر ہوگئی۔جب سکھ پنجتار کی طرف بڑھے تو سید صاحبؒ نے تین سو مجاہدین کو اس پہاڑی کی حفاظت کے لئے تعینات کردیا جو پنجتار تک پہنچنے کا راستہ تھا۔مجاہدین نے سکھوں کی فوج سے تقریباً چار کلومیٹر کی دوری پر خیمے ڈال دیئے۔وینٹورا نے مجاہدین کے اس طرح میدان میں آجانے کو ان کے سکھوں سے جنگ کرنے کے عزم وحوصلہ پر مبنی خیال کیا۔شام ہوتے ہی کسی طرح یہ بات سکھوں کی فوج میں پھیل گئی کہ مجاہدین ان پر شب خون ماریں گے۔وینٹورا نے حوصلہ کھودیا اور سکھ فوج کو ناگہانی نقصان سے بچانے کے لئے واپسی کا حکم دے دیا۔چنانچہ وہ جلدی جلدی دریائے سندھ عبور کرکے پنجاب کی سرحد میں داخل ہوگیا۔عجلت میں اس نے خیمے اور اس جیسے بھاری سامان پیچھے چھوڑ دیئے۔دراصل اب تک کا وینٹورا کا تجربہ یہ تھا کہ جیوں ہی سکھ فوج سمہ میں داخل ہوتی تھی، وہاں کے لوگ اپنی جان ومال کو بچانے کے لئے پہاڑوں میں بھاگ جاتے تھے۔اب جب کہ وہ سکھوں کے مقابلہ میں میدان میں آگئے تو وینٹورا کے لئے غیر یقینی حالات پیدا ہوگئے۔

خادی خان نے مجاہدین کے خلاف سکھوں کا فوجی حلیف بن جانے پر اپنی ندامت کا کوئی اظہار نہیں کیا اور مجاہدین کے خلاف مخالفت کی روش پر برقرار رہا۔ایک بار سید صاحبؒ نے اٹک کے قلعہ پر، جو سکھ کے قبضہ میں تھا، ایک دستہ بھیجا۔یہ ایک خفیہ مہم تھی۔اٹک کے مسلمانوں نے مجاہدین سے تعاون کا وعدہ کیا تھا اور اس طرح اس مہم میں کامیابی یقینی تھی۔خادی خان کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا اور اس نے قلعہ کے سکھ ذمہ دار لالہ خزانہ مل کو اس کی اطلاع دے دی۔اس طرح یہ مہم ناکام ہوگئی۔لالہ خزانہ مل نے ان مسلمانوں کو جنہوں نے سید صاحبؒ کو مدد کا وعدہ کیا تھا قتل کرادیا۔اس طرح خادی خان ان سارے مسلمانوں کے خون ناحق کا سبب بنا۔(۷۴)

سید صاحبؒ خادی خان یا کسی دوسرے مسلمان سردار سے ٹکراؤ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔انہوں نے خادی خان کو اس کی دشمنانہ کاروائیوں سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن خادی خان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔مجبور ہوکر سید صاحبؒ نے مجلس شوریٰ کے مشورے سے علاقے کے علماء اور خوانین کا اجتماع منعقد کیا اور ان سے (خادی خان کا نام لئے بغیر) امام وقت کے خلاف غیر مسلموں کا ساتھ اختیار کرنے والے ایک باغی مسلمان سردار کی شرعی حیثیت پر فتویٰ طلب کیا۔اس اجتماع میں تقریبا

(۷۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴۸۵۔۴۸۹۔

تین ہزار اہم افراد شریک تھے جن میں علماء کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان سب نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا مسلمان شریعت کی نگاہ میں باغی ہے اور اس سے جنگ جائز ہے۔ خادی خان بھی اس اجتماع میں موجود تھا۔ اس نے علماء کے اتفاق رائے سے کئے گئے فیصلہ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اختلاف کے اظہار کے طور پر اجتماع ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر باہر چلا گیا۔

رات میں سید صاحبؒ نے اسے اپنے پاس بلا کر ہر طرح سمجھایا لیکن اس نے بے رخی اختیار کی۔ دوسرے دن صبح میں سید صاحبؒ نے اس سے پھر بات کی اور درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان نہ پہنچائے، لیکن وہ مخالفت پر اڑا رہا اور متکبرانہ پنجتار سے رخصت ہوا۔

سکھ فوج کا پنجتار پر حملہ

تقریباً ایک مہینہ بغیر کسی قابل ذکر واقعہ کے گزر گیا، لیکن یہ طوفان سے قبل کی خاموشی ثابت ہوئی۔ سکھوں نے پنجتار پر، جو مجاہدین کا مرکز تھا، حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وینٹورا سکھ فوج کے ساتھ آگے بڑھا، خادی خان اس سے جا ملا۔ سید صاحبؒ کو ان کے مقامی حلیفوں نے مشورہ دیا کہ وہ پنجتار کو خالی کر کے پیچھے ہٹ جائیں اور طاقتور سکھ کے ہاتھوں نقصان اٹھانے سے محفوظ رہیں، لیکن انہوں نے پنجتار میں ٹھہر کر سکھوں سے لڑنے کو ترجیح دی۔ انہوں نے علاقے کے علماء اور خوانین کو خطوط لکھ کر پنجتار میں جمع ہو کر سکھوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور واضح کیا کہ اگر سکھ پنجتار کو برباد کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ یقیناً دوسرے شہروں کو بھی تاراج کر دینگے۔ مقامی لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور سکھوں سے لڑنے کے لئے پنجتار میں جمع ہو گئے۔

پنجتار تک آنے کے دو راستے تھے۔ سید صاحبؒ نے دونوں راستوں کے سامنے سکھوں کا راستہ روکنے کی خاطر پنجتار کے گرد دو اونچی اور مضبوط دیواریں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دیوار بن جانے کے بعد انہوں نے وہاں پہرے کے لئے چار فوجی چوکیاں قائم کیں۔ جب سکھ فوج کے قریب آجانے کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجاہدین اور مقامی مسلمانوں کو تین حصے میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ پنجتار کے راستہ (جس طرف سے سکھ فوج آگے بڑھ رہی تھی) کے دائیں جانب پہاڑی پر اور دوسرا دستہ بائیں جانب پہاڑی پر متعین کیا گیا اور تیسرے دستے کو سکھ فوج کو سامنے سے روکنے کی ذمہ داری دی گئی۔ مقامی لوگوں کو لے کر مجاہدین کی مجموعی تعداد ڈھائی ہزار سے تین ہزار تھی جب کہ سکھ فوج میں دس ہزار تربیت یافتہ اور مسلح سپاہی تھے۔ صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت

شاہ محمد اسماعیلؒ نے قرآن کی ان آیات کی تلاوت فرمائی جن میں بیعت رضوان کا ذکر ہے اور سارے مجاہدین کے ساتھ سید صاحبؒ کے ہاتھ پر موت تک ثابت قدم رہنے کی بیعت کی۔

سکھ فوج کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے خادی خان نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ تو تالی نامی گاؤں پر حملہ کر دیا اور اسے آگ لگادی۔ سکھ فوج نے دو گاؤں منیری اور سوابی میں آگ لگادی۔ ونیٹورا نے آگے بڑھ کر پنجتار پر سامنے سے حملہ کرنا چاہا اور دیوار کو توڑنا شروع کیا۔ مسلم گھوڑسواروں کے دستہ نے سکھوں پر حملہ کیا اور شاہین سے گولہ باری کی۔ ادھر دائیں اور بائیں پہاڑی پر تعینات مسلمان فوجیوں نے نیچے اترنا شروع کیا۔ اس طرح سکھ فوج تین طرف سے گھر گئی ونیٹورا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ جارحانہ حملہ کرنے کے بجائے اپنی مدافعت میں لڑنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے تینوں دستے محفوظ مقام پر تھے۔ اس کے برخلاف سکھ فوج کھلے میدان میں تھی۔ اس کے علاوہ ونیٹورا کو مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ بھی نہیں ہو پارہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سکھ فوج جتنے زیادہ عرصہ کے لئے میدان میں رہے گی، تنا ہی اس کا نقصان ہوگا۔ اس نے خادی خان کو مسلمان فوجیوں کی تعداد کے بارے میں غلط اطلاع دینے کے لئے الزام دیا اور سکھ فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اس کی فوج نے دریائے سندھ عبور کیا اور پنجاب کے حدود میں داخل ہو گئی۔ خادی خان ہنڈ واپس چلا گیا۔ (۷۴)

مجاہدین کا ہنڈ پر حملہ

اب اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ خادی خان نے سکھوں کے ساتھ اپنی تقدیر وابستہ کر لی ہے اور کھل کر مجاہدین کے خلاف دشمنی پر اتر آیا ہے۔ اگرچہ اب اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ دشمنی کی روش ترک کرے گا، پھر بھی سید صاحبؒ اس سے ملنے خود سلیم خان نامی مقام پر گئے اور اس سے ساتھ دینے، ورنہ کم از کم غیر جانبدار رہنے کی درخواست کی، لیکن اس نے درشتگی کے ساتھ ان کی درخواست ٹھکرادی اور ان الفاظ کے ساتھ شاہ اسماعیلؒ سے رخصت ہوا:

""مولانا! خفا نہ ہونا۔ ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، سید بادشاہ کی طرح مُلا مولوی نہیں۔ ہمارا طریقہ جدا ہے، ان کا راستہ جدا۔ سید بادشاہ کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کیوں کر چل سکتے ہیں؟"" (۷۵)

جب ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو سید صاحبؒ نے خادی خان کے خلاف ایک تادیبی قدم

---

(۷۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴۹۳۔۵۰۰۔ (۷۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۰۲۔

اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ہنڈ پر لشکر کشی کا حکم دیا۔ ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ خادی خان کی سرکشی سے علاقے کے دوسرے سرداروں کو بھی شہ مل سکتی تھی۔ چنانچہ ایک روز صبح کے وقت مجاہدین نے شاہ اسماعیلؒ کی قیادت میں ہنڈ کے قلعہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ خادی خان جو اپنے گھر کی چھت پر بدحواسی میں بھاگتا پھر رہا تھا، کسی مجاہد کی گولی کا شکار ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ کوئی گولی اسے اچانک لگ گئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ (۷۶)

اس مہم میں خادی خان اور ایک کسان کے علاوہ اور کسی کا جانی نقصان نہیں ہوا اور نہ ہی کسی کا کوئی مالی نقصان۔ قلعہ پر قبضہ ہوتے ہی ہر شخص کو جانی اور مالی تحفظ دینے کا اعلان کیا گیا۔ خادی خان کی لاش اس کے رشتہ داروں کو سونپ دی گئی جنہوں نے اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا۔

سید صاحبؒ نے یہ اعلان کیا کہ اگر خادی خان کا بھائی پر امن رہے اور ہنڈ میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کا وعدہ کرے تو وہ اسے ہنڈ کا قلعہ واپس کر دیں گے۔ خادی خان کے بھائی امیر خان نے ان شرائط کو ماننے پر آمادگی ظاہر کی اور ہنڈ کے قلعہ کی واپسی کی درخواست کی۔ سید صاحبؒ اس اطلاع سے خوش ہوئے اس لئے کہ وہ ریاست ہنڈ سے پنجتار کے دوستانہ تعلق کے خواہش مند تھے۔

جنگ زیدہ

بات یہیں پر ختم ہو جاتی، لیکن خادی خان کے بھائی امیر خان نے ریاکاری کی روش اختیار کی۔ اس نے ایک طرف تو سید صاحبؒ کے پاس اطاعت کا پیغام بھیجا اور دوسری طرف خادی خان کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے سازش شروع کر دی۔ اس کا قیام ہریانہ میں تھا۔ مجاہدین سے اس کی دشمنی جلد ہی کھل کر سامنے آ گئی۔ ایک موقعہ پر تو اس کے لوگوں نے مجاہدین کے ایک دستہ پر اچانک

---

(۷۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۰۷۔۵۱۱۔ مہر نے ایک انگریز مصنف بیلیو (Bellew) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے "خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ سید صاحبؒ نے خادی خان پر حملہ کیا۔ جب کامیاب نہ ہوئے تو اخوند سوات کے ذریعہ سے صلح کی کوشش شروع کر دی۔ اخوند سوات نے اسے بلا لیا۔ جب وہ محافظوں سے الگ ہوا تو سید صاحبؒ نے اسے قتل کرا دیا اور خود پنجتار چلے گئے۔ یہ بیان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔" (ص ۵۱۱، فٹ نوٹ ۴)۔ مہر نے بیلیو کا صرف آخری نام لکھا ہے۔ میں نے ویکی پیڈیا (Wikipedia) پر جب اس مصنف کا پورا نام تلاش کرنے کی کوشش کی تو مجھے کئی ناموں میں سے ایک نام ہنری والٹر بیلیو (Henry Walter Bellew: 1834-92) کا ملا جس نے ایک کتاب (A General Report on the Yusufzais) لکھی ہے۔ قرین قیاس ہے کہ مہر نے جس مصنف کا حوالہ دیا ہے وہ یہی ہے۔

حملہ بھی کر دیا جس میں بارہ، چودہ مجاہدین شہید ہو گئے۔ (۷۷) اس کے علاوہ اس نے پشاور کے حاکم یار محمد خان سے مجاہدین کے خلاف فوجی مدد کی درخواست کی۔ یار محمد خان بڑے پیمانے پر مجاہدین کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ اس درمیان میں اس نے ایک مختصر فوج حاجی کاکڑ کی ماتحتی میں امیر خان کی مدد کے لئے ہریانہ روانہ کی۔ حاجی کاکڑ کے ساتھ مل کر امیر خان نے مجاہدین کے خلاف فوجی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ان پر کئی بار حملے کئے۔ مجاہدین ہر معرکہ میں کامیاب رہے، لیکن انہیں امیر خان سے ایک فیصلہ کن جنگ یار محمد کی آمد کے بعد لڑنا تھا جو بس پہنچنے ہی والا تھا۔

یار محمد نو، دس ہزار سپاہیوں، چھ توپوں کئی شاہینوں (جو چھوٹی توپیں تھیں)، گھوڑے، اونٹ اور ایک ہاتھی کے لاؤ لشکر کے ساتھ ہریانہ پہنچا۔ مجاہدین کی محدود تعداد اور کمزور وسائل یار محمد کی پر شکوہ قوت کے سامنے بے حقیقت معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی مدد پر یقین نے ان کے دلوں کو تھام رکھا تھا۔ زیدہ کے پاس دونوں فوجیں آمنے سامنے خیمہ زن ہو گئیں۔ مجاہدین نے درانیوں پر شب خون مارا۔ درانی ہوشیار تھے اور ان کے گھوڑ سوار پہرے پر موجود تھے، لیکن مجاہدین نے پرزور حملہ کر کے درانیوں کے توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال نے درانیوں کو بدحواس کر دیا۔ یار محمد کو ایک گولی لگی اور اسے زخمی حالت میں میدان جنگ سے باہر لے جایا گیا۔ سردار کے بغیر درانی فوج زیادہ دیر تک میدان جنگ میں ٹھہر نہیں سکی۔ تین سو درانی فوجی، جن میں سات بڑے افسر تھے، مارے گئے۔ یار محمد خان نے جسے اس کے سپاہی زخمی حالت میں پشاور لے جا رہے تھے، راستے میں دم توڑ دیا۔ درانی فوج نے انتہائی بدنظمی کی حالت میں میدان جنگ چھوڑ دیا اور سارا ساز و سامان چھوڑ کر نکل گئی۔ مجاہدین نے میدان جنگ سے ایک ہاتھی، ساٹھ، ستر اونٹ، تین سو گھوڑے، چھ توپ، پندرہ، سولہ شاہین مال غنیمت کے طور پر جمع کئے۔ تلوار اور بندوق کی تعداد گنتی سے باہر تھی۔ یہ جنگ ۴ یا ۵ ستمبر ۱۸۲۹ء (۵ یا ۶ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ) کو لڑی گئی۔ (۷۸)

دوبارہ شریعت کے نفاذ کی کوشش

خادی خان اور یار محمد کے انتقال کے بعد جب علاقے میں ان کا منفی اثر ختم ہوا تو لوگوں میں شریعت کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی طلب پھر سے پیدا ہونے لگی۔ پنجتار کے حاکم فتح خان اور زیدہ کے حاکم فتح خان مل کر سید صاحبؒ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ان کی

(۷۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۱۵۔

(۷۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۲۷۔۵۲۹۔

ریاستوں میں شرعی قاضی مقرر کیئے جائیں تا کہ لوگوں کے اختلافات اسلامی احکام کے مطابق حل کیئے جا سکیں۔ ان دونوں سرداروں نے سمہ علاقے کے دوسرے سرداروں کو بھی خطوط لکھ کر انہیں اپنے اپنے علاقے میں شریعت کے نفاذ کی دعوت دی۔ چنانچہ کئی ریاستوں کے خوانین نے بھی اپنے علاقے میں شرعی نظام کے نفاذ پر آمادگی ظاہر کی اور سید صاحبؒ کو مسلمانوں کے امام کی حیثیت سے عُشر دینا قبول کیا۔ (۷۹) سید صاحبؒ نے ان علاقوں میں اسلامی قاضی مقرر کر دیئے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ خوانین خود مناسب مقامی علماء کو قاضی کے عہدہ کے لئے تجویز کرتے تھے اور سید صاحبؒ انہیں منظوری دے دیتے تھے۔ دوسری فصل کے موقعہ پر سرداران سمہ نے پنجتار عشر کا غلہ بھیجا۔ اس طرح علاقے میں لوگوں کی زندگی شرعی سانچے میں ڈھلنے لگی۔

اسلامی لشکر کی فوجی تربیت

اب سید صاحبؒ کو لشکر اسلام کی تنظیم نو کا موقعہ ملا اور انہوں نے مجاہدین کے لئے ایک فوجی تربیتی نظام بھی قائم کیا۔ انہوں نے عبدالحمید خان کو، جو ایک باقاعدہ فوجی افسر رہ چکے تھے، مجاہدین کی فوجی تربیت کے لئے مقرر کیا۔ چنانچہ اس مقصد سے مختلف مراکز قائم کیئے گئے جن میں مجاہدین کو گھوڑ سواری، نیزہ بازی، نشانہ بازی اور شمشیر زنی کے علاوہ دوسرے جنگی فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فتح خان پنجتاری اور اس کے سپاہی بھی ان فوجی مشقوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود سید صاحبؒ بھی اس میں شرکت کرتے تھے۔ دیگر جنگی فنون اور جسمانی کسرت کے لئے بھی کئی مراکز قائم کیئے گئے جو اہل فن کی نگرانی میں چلائے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ دو مہینے تک چلا۔ سید صاحبؒ نے عبدالحمید خان کو گھوڑ سوار دستہ کا سالار بھی مقرر کیا جس کی وجہ سے وہ لشکر میں ''رسالدار'' کے لقب سے معروف ہوئے۔ عبدالحمید خان نے اس دستہ کو منظم کر کے اسے اسلامی لشکر کا ایک اہم حصہ بنا دیا۔

ترُبیلا مہم

اب سید صاحبؒ نے سکھوں کے خلاف مہم چھیڑنے کا فیصلہ کیا اور ضلع ہزارہ میں تربیلا نامی مقام پر جو سکھوں کی عملداری میں تھا، حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ سکھ سپاہی ایک چھوٹے سے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ فوراً ہی ہری سنگھ نلوہ پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سکھوں کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔

(۷۹) عُشر زراعتی فصل میں اسلامی حکومت کا ایک حصہ ہوتا ہے جس سے حکومت اپنے اخراجات پورا کرتی ہے۔ تفصیل کے لئے کوئی معتبر کتاب دیکھیں۔

اسلامی لشکر ایک سو پچاس گھوڑ سوار اور تین سو پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جنگی مصلحت کے پیش نظر مجاہدین نے واپسی اختیار کی، لیکن اس مہم کا یہ فائدہ ہوا کہ مقامی سرداروں میں آپسی اختلافات بھلا کر سکھوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جانے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

سید اکبر شاہ ستھانوی کی بیعت وارادت

اسی زمانے میں سید اکبر شاہ ستھانوی کھبل میں سید صاحبؒ سے ملنے آئے اور انہیں ستھانہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ جب سید صاحبؒ وہاں گئے تو سید اکبر شاہ اور ان کے پورے خاندان نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چونکہ یہ سید خاندان علاقے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے سید صاحبؒ کے ساتھ ان کے نیاز مندانہ تعلق قائم کرنے سے سید صاحبؒ کی تحریک کا علاقے میں وقار بڑھا۔ جیسا کہ مہر نے لکھا ہے: ''سرحد میں یہی ایک خاندان ہے جس کے ہر فرد کا ایک ایک لمحہ سید صاحبؒ کے ابتدائی تعلق سے لے کر ان کی شہادت تک بے توقف اخلاص و محبت کے ساتھ تمام دینی مقاصد کی اعانت کے لئے وقف رہا اور یہی ایک خاندان ہے جس نے سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد اپنی جانوں اور مالوں کو بالکل بے غرضانہ اور بے دریغ مجاہدین کی خدمت کے لئے وقف کیا۔'' (۸۰)

پائندہ خان کے ساتھ معاہدہ

انہی دنوں حاکم امب سردار پائندہ خان کی طرف سے سید صاحبؒ کی خدمت میں سفیر آئے۔ خان نے سید صاحبؒ کے لئے نیاز مندی کا اظہار کیا اور ان سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پائندہ خان تنولی قبیلے کا سب سے طاقتور سردار تھا اور اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے ایک عرصہ سے سکھوں کے ساتھ برسرپیکار تھا۔ سید صاحبؒ نے اس کی دعوت قبول کی اور اس سے ملاقات کی خاطر مقررہ مقام پر تشریف لے گئے۔ اس ملاقات میں انہوں نے پائندہ خان کو ایک ہاتھی اور ایک توپ تحفے کے طور پر دیا۔ پائندہ خان نے وعدہ کیا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقے سے گزر کر ہزارہ اور کشمیر جانے کی اجازت دے گا۔ درحقیقت یہ سہولت مجاہدین کے لئے انتہائی ضروری تھی، اس لئے کہ امب کی ریاست سے گزرے بغیر مجاہدین کے لئے ہزارہ اور کشمیر جانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ (۸۱)

---

(۸۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۴۷۔

(۸۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۴۰۔۵۴۵۔

سلطان محمد خان کا مجاہدین پر حملہ

اب صورت حال اس بات کے لئے سازگار ہوگئی تھی کہ مجاہدین سکھوں کے خلاف صف آرا ہوکران پر دباؤ ڈالیں تاکہ پنجاب کے مسلمانوں کے غم واندوہ کا مداوا ہواور سرحد کے علاقے کے مسلمانوں کو بھی امن وآزادی نصیب ہو۔لیکن ابھی سید صاحبؒ کوئی عملی قدم نہیں اٹھا پائے تھے کہ اچانک انہیں اطلاع ملی کہ حاکم پشاور سلطان محمد خان نے ایک فوج کے ساتھ حملہ کر کے ہنڈ کے قلعہ پر جو مجاہدین کے قبضے میں تھا، قبضہ کرلیا ہے اور اب پنجتار پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ایک بار پھر سید صاحبؒ کے سکھوں سے مقابلہ کے لئے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور انہیں ایک مسلمان باغی سردار سے مقابلہ کے تیار ہونا پڑا۔

اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے سید صاحبؒ نے ایک انتہائی دانش مندانہ قدم اٹھایا اور اپنی فوج کے پانچ سو گھوڑ سواروں کو فوراً پشاور پر حملہ کے لئے تیار ہونے کا حکم دیا جو درانی ریاست کا مرکز تھا۔درانیوں کے مخبروں نے فوراً یہ اطلاع ان تک پہنچادی۔یہ صورت حال درانیوں کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔سلطان محمد خان نے پشاور کے حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا تھا۔وہ اور اس کے سپاہی اپنے گھروں اور اعزہ کے لئے پریشان ہوگئے اور انہوں نے فوراً پشاور واپس ہونے کا فیصلہ کیا۔سلطان محمد خان نے خادی خان کے بھائی امیر خان کو ہنڈ کا قلعہ سونپا اور انتہائی عجلت میں پشاور کی طرف روانہ ہوگیا۔اس طرح سید صاحبؒ کی حکمت عملی سے یہ جنگ ٹل گئی جس میں مسلمانوں کا ناحق خون بہنا تھا۔واضح ہو کہ سید صاحب کی جانب سے پشاور پر حملہ نہیں کیا گیا۔اس حملہ کی اطلاع کو عام کرنے سے سید صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ درانی فوج ہراساں ہوکر اپنا گھر بچانے کے لئے پشاور لوٹ جائے۔سلطان محمد خان کی واپسی کے بعد امیر خان نے سکھوں سے سازباز کرلی اور سات سو سکھ سپاہیوں کو ہنڈ لاکر قلعہ کی حفاظت کا انتظام کیا۔

کشمیر مہم

سید صاحبؒ نے دوبارہ مقامی مسلمانوں کو ساتھ لے کر سکھوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد سے کشمیر کی طرف پیش قدمی کا ارداہ کیا۔ان دنوں کشمیر سکھوں کی عملداری میں تھا۔علاقے کے کئی بااثر خوانین نے سید صاحبؒ کو کشمیر پر حملہ کرنے میں اپنی مدد کا یقین دلایا تھا۔چترال کے حاکم سلیمان شاہ اور کاغان کے والی سید ضامن شاہ سے بھی اس سلسلے میں رابطہ

قائم کیا جا چکا تھا۔ سید صاحبؒ نے مجلس شوریٰ میں کشمیر پر یورش کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ مشورے میں یہ طے پایا کہ پہلے شاہ اسماعیلؒ کو ایک مختصر جماعت کے ساتھ مظفر آباد جسے کشمیر کا دروازہ کہا جاتا تھا، بھیجنا چاہیئے تاکہ صورت حال کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ اس کے بعد کشمیر پر پیش قدمی کا فیصلہ کیا جائے۔

پائندہ خان کی مخالفانہ روش

حضرت شاہ اسماعیلؒ کو مظفر آباد جانے کے لئے ریاست امب میں ایک ندی کو پار کرنا تھا، لیکن پائندہ خان، حاکم امب، نے جس نے سید صاحبؒ سے خود پہل کر کے دوستانہ رشتہ استوار کیا تھا اور بیعت کی تھی، شاہ اسماعیلؒ اور مجاہدین کو اپنی ریاست سے ندی عبور کرنے کی اجازت نہیں دی اور کہا کہ اس سے سکھ اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس کی یہ دلیل اس لئے قابل قبول نہیں تھی کہ وہ سکھوں سے پہلے سے جنگ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اور سید صاحبؒ کے درمیان خیر سگالی کے اس نئے رشتے کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ مجاہدین کو ہزارہ و کشمیر کی طرف پیش قدمی کے لئے اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دے گا کہ مجاہدین کے کشمیر پر پیش قدمی کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پائندہ خان نے سختی کے ساتھ شاہ اسماعیلؒ کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے منع کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر اس کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی تو مجاہدین اور تنولیوں کے درمیان جنگ چھڑ سکتی ہے۔ شاہ اسماعیلؒ نے مہم روک دی اور ستھانہ سے سید صاحبؒ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ سید صاحبؒ کسی مسلمان سردار سے جنگ کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے شاہ اسماعیلؒ کو واپسی کا حکم دیا اور مجلس شوریٰ منعقد کر کے اس مسئلہ پر اپنے مشیروں کی رائے طلب کی۔

مجلس شوریٰ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ مجاہدین کے لئے امب ہو کر کشمیر جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اور پائندہ خان کے حکم کے مطابق امب کا راستہ اختیار نہ کرنے کا مطلب کشمیر مہم سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جانا تھا، اس لئے انہیں امب ہو کر ہی کشمیر کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے اور اگر پائندہ خان مخالفت میں میدان میں آجائے تو اس سے مجبوراً جنگ کرنی چاہیئے۔ سید صاحبؒ نے پھر بھی پائندہ خان کو ایک خط لکھا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی مہم سکھوں کے خلاف ہے جن سے پائندہ خان خود بھی برسرپیکار ہے اور دوسرا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً امب سے گزرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، لیکن پائندہ خان نے اجازت دینے سے انکار کر دیا

اور مجاہدین کے امب کا راستہ اختیار کرنے پر ان سے لڑنے کی دھمکی دی۔ اس نے جنگ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ اب پائندہ خان اور سید صاحبؒ میں جنگ ناگزیر ہو گئی۔

پائندہ خان کے خلاف لشکر کشی

سید صاحبؒ کے حکم سے مجاہدین نے امب کی طرف پیش قدمی کی اور پائندہ خان کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیا کہ اس کے لئے نہ فرار کی کوئی راہ باقی رہی اور نہ ہی جنگ کر کے کامیابی حاصل کرنے کا کوئی امکان۔ اس صورت حال کے پیش نظر اس نے مجاہدین کو امن و مصالحت کی گفتگو میں الجھا کر ان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے شاہ اسمٰعیلؒ کے پاس اپنا سفیر بھیج کر اپنی غلطی کا اقرار اور ندامت کا اظہار کیا اور دوسرے دن باندہ نامی مقام پر مصالحت کی خاطر ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ شاہ اسمٰعیلؒ نے اس کی اس پیش کش کا خیر مقدم کیا اور اپنے مورچوں کے ذمہ داروں کو ہر قسم کی جنگی پیش قدمی روک دینے کی ہدایت دی۔ اس طرح مجاہدین کو اعتماد میں لینے کے بعد پائندہ خان نے مجاہدین کے کوہ کنیر ڑی کے مورچہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ لیکن مجاہدین کے حوصلہ اور ان کے فروسہ میں قائم کردہ مورچہ سے بروقت مدد مل جانے کی وجہ سے پائندہ خان کو شکست فاش ہوئی اور وہ ہزیمت زدہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مجاہدین نے پیش قدمی کر کے عشرہ، کوٹلہ اور امب کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ پائندہ خان اپنی حفاظت کے خیال سے چھتر بائی اور پھر بروٹی چلا گیا۔ (۸۲)

پھولڑا کی جنگ

امب اور عشرہ کی فتح کے بعد سید صاحبؒ نے کشمیر کی مہم کی طرف دوبارہ توجہ کی تا کہ کشمیر پر

(۸۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۵۲ اور ۵۶۳۔۵۶۴۔ سید صاحبؒ مسلمان سرداروں سے کبھی لڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان سے اسی وقت لڑے جب جنگ ان پر تھوپ دی گئی۔ مجاہدین نے بھی ہمیشہ اسی اصول پر عمل کیا۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ایک موقعہ پر سکھ سردار ہری سنگھ نلوہ نے مجاہدین کے قائدین شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین کو ایک وسیع علاقے میں ان کے حاکمانہ حق کو تسلیم کرنے کے ساتھ پندرہ ہزار (۱۵،۰۰۰) روپیہ نقد کی پیش کش اس شرط پر کی کہ مجاہدین پائندہ خان کے خلاف جنگ میں سکھوں کا ساتھ دیں۔ ہری سنگھ نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ پائندہ خان مجاہدین کے ساتھ غداری کر چکا ہے۔ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے بلا تردد اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور سفیر کو جواب دیا کہ وہ "سکھوں کی حمایت میں کسی مسلمان پر فوج کشی نہیں کر سکتے خواہ وہ کیسا ہی مکار اور غدار ہو۔" (مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۱۴۔۱۱۵)۔

یورش کا سامان کیا جا سکے۔ انہوں نے اپریل ۱۸۲۸ء (شوال ۱۲۴۵ھ) میں پہلے تو مظفر آباد کے علاقے میں آباد کھکھا بمبا نامی قبیلے کو سکھوں سے لڑنے کے لئے آمادہ کیا، اس کے بعد پیش قدمی کر کے پھولڑا کو جو تنولی ریاست کا ایک اہم فوجی مقام تھا فتح کر کے قبضے میں لے لیا۔ پائندہ خان جو بروٹی میں مقیم تھا شیر گڑھ اور پھر اگرور چلا گیا۔ وہاں سے اس نے سکھ سردار ہری سنگھ نلوہ سے رابطہ قائم کیا اور مجاہدین کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ اس نے اپنے بیٹے جہاں دار کو بھی ہری سنگھ کے پاس ضمانت کے طور پر بھیج دیا کہ وہ سکھوں کے ساتھ اپنا اتحاد نہیں چھوڑے گا۔

سید احمد علیؒ کی فوج نے پھولڑا کی فتح کے بعد قلعہ سے باہر کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا جہاں وہ چاروں طرف سے کسی بھی ناگہانی حملہ کی زد پر تھی۔ ہری سنگھ نلوہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن طلوع آفتاب سے قبل مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ چونکہ سکھ گھوڑوں پر آئے تھے، اس لئے وہ تیز رفتار سے آئے اور اچانک مجاہدین پر حملہ آور ہو گئے۔ مجاہدین اس اچانک حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو منظم نہیں کر سکے اور سکھوں کے مقابلہ میں انفرادی طور پر سامنے آئے یا پھر چھوٹی چھوٹی ٹولی کی شکل میں۔ مجاہدین نے ہمت کے ساتھ صورت حال کا مقابلہ کیا لیکن سکھوں نے انہیں خاصا جانی نقصان پہنچایا۔ بہت سے مجاہدین نے شہادت پائی اور سپہ سالار سید احمد علی بھی شہید ہو گئے۔ (۸۴) چونکہ سکھوں کا ارادہ مجاہدین کو پھولڑا سے بے دخل کرنے کا نہیں تھا، اس لئے وہ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے واپس چلے گئے۔ سید احمد علی کی شہادت مجاہدین کے لئے ایک بڑا خسارہ اور خود سید صاحبؒ کے لئے ایک اندوہناک واقعہ تھا۔ سید احمد علی نہ صرف ان کے حقیقی بھانجے تھے، بلکہ وہ ان کی پوری زندگی کے رفیق، بے لوث معاون اور دور اندیش مشیر کار تھے۔ لیکن سید صاحبؒ کے لئے فخر اور تسکین کی بات یہ تھی کہ سید احمد علی نے جتنے بھی زخم میدان جنگ میں کھائے تھے، وہ سب ان کے جسم کے سامنے کے حصوں پر تھے۔

---

(۸۴) اس جنگ کے لئے سید صاحبؒ نے سید احمد علی کو اژدر نامی اپنا ایک گھوڑا اعطا فرمایا تھا۔ سید احمد علی کی شہادت کے بعد سکھوں نے گھوڑے کو پکڑ لیا اور لے جانے لگے۔ محمد خان نامی ایک مجاہد نے یہ دیکھ کر مجاہدین کو آواز دی: ''یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے۔ اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے تنہا سکھوں پر حملہ کر دیا اور سکھوں سے گھوڑا چھین لیا۔ سکھوں نے گھوڑا حاصل کرنے کے لئے دوبارہ حملہ کیا۔ اس جدوجہد میں گھوڑا مارا گیا اور محمد خان بھی شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ اور ایسے دوسرے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ مجاہدین سید صاحبؒ سے کیسی والہانہ محبت کرتے تھے۔

(مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۷۲)۔

رنجیت سنگھ کو سمہ کے علاقے میں سید صاحبؒ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا پورا اندازہ تھا اور وہ اسے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتا تھا۔ اس نے سیاسی حکمت کی راہ اختیار کی اور اپنے دو معزز سفیر حکیم فقیر عظیم الدین دہلوی اور وزیر سنگھ کو اپنے ایک ذاتی خط کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں اسب بھیجا۔ مہاراجہ نے دریائے سندھ کے پار کا ایک وسیع علاقہ جس کی آمدنی نوے لاکھ (۹۰,۰۰۰۰۰) سالانہ تھی، سید صاحبؒ کو پیش کیا اور سمہ سے حاصل ہونے والی لگان کی آمدنی پر بھی ان کا حق تسلیم کیا اور اس کے بدلے اپنے خلاف ہر قسم کی فوجی کاروائی روک دینے کی درخواست کی۔ سید صاحبؒ نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پیش کش کی طرف توجہ نہ دی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ان کا مقصد پنجاب میں مسلمانوں کی دادرسی اور روئے زمین پر بسنے والوں کو خدائے بزرگ و برتر کے پیغام سے روشناس کرانا تھا، نہ کہ زمین کے کسی حصے کا حکمراں بن کر مطمئن ہو جانا۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اگر مہاراجہ اسلام قبول کر لے تو وہ بہ رضا و رغبت وہ سارا علاقہ اس کے حوالے کر دیں گے جو ان کے زیر اثر تھا۔ انہوں نے سفارت کا اکرام کیا اور مہاراجہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی یہ باتیں دہرائیں۔ (۸۴)

سکھ فوج کی سمہ میں دوبارہ آمد

جب مذکورہ بالا مشن ناکام ہو گیا تو بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک سکھ فوج سمہ کے علاقے میں سردار رنجیت سنگھ کے لئے سالانہ لگان کی وصولی کے لئے داخل ہو گئی۔ یہ دستہ ونٹورا (Ventura) اور الارڈ (Allord) کی کمان میں تھا۔ انہوں نے سید صاحبؒ سے رابطہ قائم کیا اور گفت و شنید کے ذریعہ باہمی مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ سید صاحبؒ کی طرف سے مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور حاجی بہادر خان نے نمائندگی کی۔ لیکن اس کوشش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس مشن کی تفصیلات سے سید صاحبؒ کو باخبر کر دیا گیا۔ اب یہ بات یقینی ہو گئی کہ سکھ پنجتار پر حملہ کریں گے۔

سکھ فوج نے پنجتار کی طرف پیش قدمی کی اور پنجتار سے بارہ میل کی دوری پر واقع زیدہ نامی مقام پر خیمہ زن ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے اچانک سکھ فوج میں یہ خبر پھیل گئی کہ مجاہدین رات میں سکھ فوج پر شب خون ماریں گے۔ سکھوں کو اپنی حفاظت کے لئے ضروری انتظامات کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لئے ان میں مجاہدین کے حملہ کی خبر سے بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے کسی محفوظ

(۸۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۲۱۸-۲۲۰۔

مقام کی طرف واپسی کا تقاضہ کرنا شروع کر دیا۔ وینٹورا اور الارڈ نے ان کا حوصلہ بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے چینی اور بد دلی کی شکار سکھ فوج نے حوصلہ ہار دیا اور لنڈے ندی کو ایک پل کے ذریعہ پار کر کے سکھ علاقے میں داخل ہو گئی۔ سکھ فوج کی اس طرح پسپائی سے علاقے میں مجاہدین کی طاقت تسلیم کی جانے لگی۔

سمہ کا حاکمانہ دورہ

چونکہ اب سکھوں سے براہ راست ٹکراؤ شروع ہو چکا تھا، اس لئے سید صاحبؒ نے ضروری سمجھا کہ علاقے کا دورہ کر کے ان سرداروں کو تقویت پہنچائیں جنہوں نے سکھوں سے جنگ کے موقعہ پر ان سے وفاداری نبھائی تھی اور ان سرداروں کی گوشمالی بھی کریں جنہوں نے ان کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ ضروری تھا کہ سرداروں سے تعلقات بحال کئے جائیں اور علاقے میں مجاہدین کا فوجی دبدبہ قائم ہو۔ چنانچہ انہوں نے قاضی سید حبان کو اس دورے کے لئے منتخب کیا، ان کی ماتحتی میں تین سو گھوڑ سوار اور دو سو پچاس پیدل سپاہی دیئے، اور ان کی رہنمائی کے لئے شاہ اسماعیلؒ کو ساتھ کر دیا۔ اس مہم کی سربراہی کے لئے قاضی حبان کا انتخاب نہایت موزوں تھا۔ وہ ایک عالم دین، خدا ترس انسان اور نڈر سپاہی ہونے کے علاوہ اسی علاقے کے باشندہ تھے اور مقامی رسم و رواج اور لوگوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے پنجتار میں علاقے کے خوانین کو جمع کر کے انہیں ترغیب دی کہ سب مل کر سکھوں کے ظلم و تعدی کا مقابلہ کریں اور ان زمینوں کو جو سکھوں نے ان سے چھین لئے تھے، واپس لینے کی کوشش کریں۔ علاقے کے خوانین نے بخوشی اس تجویز کو قبول کیا اور یہ نیت بھی کر لی کہ اپنی زمین واپس مل جانے کے بعد اس کی پیداوار پر سید صاحبؒ کو عشر ادا کریں گے۔ فتح خان پنجتاری نے عشر ادا کرنے کا اعلان کیا اور علاقے کے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔

عشر کے نفاذ کا فیصلہ ایک اہم قدم تھا۔ اس سے سمہ کے سرداروں اور پنجتار کے اسلامی مرکز میں باہمی مدد، اتحاد اور خیر سگالی کا ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا۔ قاضی حبان نے پنجتار سے خروج کیا اور پیش قدمی کر کے کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کاولی اور پنج پیر پر از سر نو کنٹرول قائم کیا۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر ہنڈ پر دوبارہ قبضہ کر لیا جسے خادی خان کے بھائی نے سکھوں کی مدد سے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ تو اکلی اور شیخ جاناں کے لوگوں نے اپنی گزشتہ باغیانہ روش پر معذرت کی اور عشر ادا

کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن ہوتی کے حاکم سردار احمد خان نے مجاہدین کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہوتی کا قلعہ اپنے بھائی رسول خان کو سونپا اور خود پشاور کے لئے روانہ ہو گیا تا کہ درانی سردار سلطان محمد خان سے معاہدہ کر کے وہاں سے فوجی مدد لا سکے۔ مجاہدین نے آگے بڑھ کر ہوتی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مردان کے لوگوں نے بھی مجاہدین سے لڑنے کی ٹھانی اور ان کے قلعہ سے قریب آنے پر ان پر گولیاں برسانا شروع کر دیا۔ مجاہدین نے سخت گولہ باری میں بھی پیش قدمی جاری رکھی اور مردان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس یورش میں قاضی حبان کو گولی لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد شاہ اسماعیلؒ نے کمان سنبھالی۔ وہاں سے مجاہدین آگے بڑھے اور امان زئی، سدّم اور شیوہ کو قبضے میں لے کر وہاں عشر کی وصولی کا انتظام کیا۔ اس طرح سمہ کے خوانین کی اطاعت پر بھی اطمینان ہو گیا، ساتھ ہی سمہ کا پورا علاقہ شرعی نظام کے تحت ایک اکائی بن گیا۔

مایار کی جنگ

ابھی علاقے میں باغیوں کی سرکوبی اور شرعی نظام سے لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش شروع ہی ہوئی تھی کہ سید صاحبؒ کو اطلاع ملی کہ حاکم پشاور سلطان محمد خان ہوتی کے حاکم سردار احمد خان کی مدد کے لئے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہو چکا ہے تا کہ ہوتی کے قلعہ سے مجاہدین کو بے دخل کرنے کے لئے ان سے جنگ کرے۔ اب سید صاحبؒ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ سکھوں سے معرکہ آرائی اور سمہ میں دینی اور اصلاحی کوششوں کو چھوڑ کر سلطان محمد خان سے مقابلہ کی فکر کریں۔ انہوں نے مجاہدین کے ساتھ چارسدّہ کے لئے پیش قدمی کی۔ درانی فوج نے مردان میں قیام کیا۔ سید صاحبؒ نے سلطان خان کے پاس خیر سگالی کا وفد بھیجا اور ہر قسم کی غلط فہمی کے ازالہ کی پیش کش کی تا کہ دو مسلمان طاقتوں میں جنگ کو روکا جا سکے۔ لیکن سلطان خان مصر تھا کہ سید صاحبؒ ہوتی کا قلعہ سردار احمد خان کو واپس کریں جس کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ سمہ کے اطاعت گزار ریاستوں کے درمیان سید صاحبؒ ایک باغی سردار کی آزادانہ حیثیت قبول کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ اس طرح صلح کی کوشش ناکام ہو گئی اور ایک بار پھر سید صاحبؒ پر جنگ تھوپ دی گئی۔

دونوں فوجیں مایار نامی مقام پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ درانی فوج بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی جس میں آٹھ ہزار گھوڑ سوار تھے اور چار ہزار پیدل۔ ان کے پاس چھ توپ

بھی تھے۔ مجاہدین کی تعداد تین ہزار پانچ سو تھی جن میں تین ہزار پیدل سپاہی تھے اور صرف پانچ سو گھوڑ سوار۔ ان کے پاس کوئی توپ نہیں تھا۔ لیکن مجاہدین کا حوصلہ بہت بلند تھا اس لئے کہ خود سید صاحبؒ اس جنگ میں شرکت فرما رہے تھے۔ جنگ شباب پر تھی کہ مجاہدین کا گھوڑ سوار دستہ بے نظمی کا شکار ہو گیا اور اس کے سالار رسالدار عبدالحمید خان زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ مقامی مسلمان جو مجاہدین کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے، آغاز ہی میں میدان سے الگ ہو گئے۔ ان دو وجوہات سے مجاہدین پر بہت دباؤ پڑ گیا اور انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ کو مجاہدین کو درپیش خطرے کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ اور شیخ ولی محمد ایک سو مجاہدین کے ساتھ درانیوں کے توپوں پر حملہ آور ہوئے اور سخت دو بدو جنگ کے بعد توپوں پر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ فوراً ہی انہوں نے توپوں کا رخ میدان کے اس حصے کی طرف کر دیا جہاں درانی فوجی تھے اور گولہ باری شروع کر دی۔ درانی اس اچانک حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور جسے جس طرف موقعہ ملا، میدان جنگ سے نکل گیا۔ فتح مجاہدین کی ہوئی لیکن ان کے شہداء اور زخمیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ رسالدار عبدالحمید خان نے جنہیں زخمی حالت میں پنجتار لے جایا جا رہا تھا، راستہ ہی میں شہادت پائی۔ وہ مجاہدین کو بہت عزیز تھے اس لئے ان کی شہادت سے مجاہدین بہت متاثر ہوئے۔ سلطان محمد خان نے جنگ کے بعد میدان چھوڑ دیا اور پشاور کو واپسی اختیار کی۔ (۸۵)

پشاور کی فتح

سلطان محمد خان کی شرانگیزی سارے حدود پار کر چکی تھی۔ اب اسے اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ آرام سے پشاور لوٹ جائے، جنگ میں ہوئے نقصانات کی تلافی کرے، اور نئی تیاری کے ساتھ پھر مجاہدین پر حملہ آور ہو۔ سید صاحبؒ نے فیصلہ کیا کہ تادیبی کاروائی کے طور پر وہ اس کا پیچھا کریں اور پشاور پر لشکر کشی کریں۔ سمہ کے اور کئی سردار اس مہم میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ سید صاحبؒ کے ساتھ ہو لئے۔ اس طرح مجاہدین کی تعداد چھ، سات ہزار ہو گئی۔ جب سید صاحبؒ پشاور کے نزدیک پہنچے تو سلطان خان نے پشاور چھوڑ دیا اور اپنی فوج کے ساتھ کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو گیا۔ وہاں سے اس نے ارباب فیض اللہ خان کو، جو ارباب بہرام خان کا حقیقی بھائی تھا، صلح کا پیغام لے کر سید صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا اور معافی کا طلب گار ہوا۔ اس نے سید

---

(۸۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۲۴۹۔۲۵۹۔

صاحب ؒ کی مہم کے اخراجات کے پیش نظر چالیس ہزار روپیہ پیش کرنے کی پیش کش کی۔اس کی درخواست تھی کہ سید صاحب ؒ پنجتار لوٹ جائیں اور اسے اپنے اطاعت گزار ماتحت کے طور پر بدستور پشاور پر حکومت کرنے دیں۔سید صاحب ؒ نے ان سب باتوں کا مناسب جواب دیا لیکن انہوں نے پشاور پر قبضہ کرنے کا اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔

سلطان محمد خان کی بحالی

سلطان محمد خان کے سفیر کے طور پر ارباب فیض اللہ خان نے سید صاحب ؒ سے پشاور میں کئی ملاقاتیں کیں اور پیغام لایا کہ سلطان محمد خان خود سید صاحب ؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گذشتہ غلطیوں کی تلافی کے طور پر اظہار ندامت کرنا اور تجدید بیعت کرنا چاہتا ہے۔سلطان خان کی یہ دلیل تھی کہ جب سید صاحب ؒ ایک غیر مسلم کی توبہ اور اظہار ندامت قبول کر کے اسے معاف فرما دیتے ہیں تو اس کی توبہ بھی قبول ہو اور اسے بھی ایک بار پھر نئے سرے سے صحیح اسلامی زندگی گزارنے کا موقعہ عطا ہو۔ پشاور کے تاجروں میں سے کئی لوگوں نے جن میں چند ہندو سیٹھ بھی شامل تھے،سید صاحب ؒ سے ملاقات کی اور درخواست کی کہ پشاور سلطان خان کو کسی بھی صورت میں واپس نہیں کیا جائے۔انہوں نے سید صاحب ؒ کو ہر مالی تعاون کا یقین بھی دلایا۔سید صاحب ؒ کے رفقاء میں سے کئی اصحاب کو بھی اس بات کا اطمینان نہیں تھا کہ سلطان محمد خان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔سید صاحب ؒ ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے لیکن وہ شریعت کے حکم کے مطابق فیصلہ اور عمل کرنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ چونکہ سلطان خان تائب ہونے کا اقرار کر رہا ہے، اس لئے وہ شریعت کی نگاہ میں معافی کا مستحق ہے۔انہوں نے اس سلسلے میں فرمایا:

> اب سلطان محمد خان تائب ہے۔دل کا حال خدا جانے۔حکم شریعت کا مدار تو ظاہر پر ہے۔ ہم کیوں اس کا عذر نہ مانیں؟ ہمارے پاس اس پر کون سی دلیل اور حجت ہے؟ اگر کوئی دیندار اور خدا پرست عالم دلیل شرعی سے سمجھا دے کہ ہماری رائے غلط ہے تو ہم مان لیں گے۔(۸۶)

مقامی صورت حال اور اس کی پیچیدگیوں کا بھی یہی تقاضہ تھا کہ سید صاحب ؒ سلطان محمد خان کی معذرت قبول فرما لیں۔پشاور کو اپنے قبضے میں لے لینے سے سید صاحب ؒ اور سلطان محمد خان میں ٹکراؤ کا ایک ایسا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا جس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔سلطان محمد خان کا علاقے میں اثر تھا اور اس کے ساتھ اب بھی ایک وفادار فوج تھی۔اس کے علاوہ سابق والئ امب پائندہ خان مجاہدین کے خلاف سلطان محمد خان کو ہر مدد دینے کو تیار ہو جاتا۔ان سب سے بڑھ

---

(۸۶) مہر، سید احمد شہید ؒ، ۶۵۱۔۶۵۲۔

کر خطرہ اس بات کا تھا کہ سید صاحبؒ سے ناامید ہو جانے کے بعد سلطان خان سکھوں سے معاہدہ کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سید صاحبؒ کی تحریک کے مقصدِ جلیل کے خلاف ہوتا کہ ان کی کوئی پالیسی ایک مسلمان سردار کو سکھوں کی صف میں شامل ہونے پر مجبور کر دے۔ اگر سلطان خان کو معاف کر دینے کے کچھ نقصانات ہو سکتے تھے تو اسے ہمیشہ کے لئے اپنا اور مسلمانوں کا دشمن بنا لینے کے زیادہ سنگین نتائج سامنے آ سکتے تھے۔ مسئلہ کو شوریٰ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر سلطان محمد خان کے اخلاص کے ساتھ تائب ہونے کا پورا اطمینان ہو جائے تو اسے پشاور کے حاکم کی حیثیت سے دوبارہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ غلام رسول مہر اس فیصلے کے حق میں لکھتے ہیں:

جب سلطان محمد خان اور اس کے بھائی توبہ کا اقرار کر رہے تھے اور سید صاحبؒ کی تمام شرطوں کو قبول کرنے پر آمادہ تھے تو مصالح قومی کا تقاضہ یہی تھا کہ انھیں ساتھ ملا کر قدم آگے بڑھایا جاتا۔ حق و انصاف کا حکم بھی یہی تھا۔ قرآن مجید کی رہنمائی بھی یہی تھی: وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله۔ (۸۷)

ان سب باتوں کے باوجود سید صاحبؒ نے سلطان محمد خان کے متعلق اطمینان کرنے کے لئے ہر ممکن عملی تدبیر بھی اختیار کی۔ اولاً، انہوں نے ارباب فیض اللہ خان (جو سید صاحبؒ کا ارادت مند اور معتمد تھا) کو ذمہ داری دی کہ وہ سلطان محمد خان کے متعلق ذاتی طور پر بھی اطمینان کر لے کہ وہ جو وعدے کر رہا ہے اس میں سنجیدہ اور مخلص ہے اور سید صاحبؒ کو بتائے۔ ارباب فیض اللہ خان نے سلطان محمد خان سے کئی ملاقاتوں کے بعد سید صاحبؒ کو اطمینان دلایا کہ سلطان محمد خان مخلصانہ طور پر مصالحت کا خواہاں ہے اور زبان دیا کہ اگر اب سلطان خان نے عہد شکنی کی تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کا ساتھ چھوڑ کر سید صاحبؒ سے آ ملے گا۔ (۸۸) دوئم، سید صاحبؒ نے مولانا شاہ اسماعیلؒ کو مقرر کیا کہ پہلے وہ سلطان محمد خان سے ملیں اور اپنا اطمینان کریں۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ بھی سلطان محمد خان سے دوبار ملے اور ضروری باتوں پر گفتگو کی۔ دوسری ملاقات میں انہوں نے سلطان خان سے سید صاحبؒ کے لئے غائبانہ بیعت بھی لی۔ سوئم، آخر میں سید صاحبؒ نے خود اس سے ملاقات کی تا کہ نجی گفتگو کے ماحول میں وہ اس کی نیت اور ارادوں کا حتی الامکان اندازہ لگا سکیں۔

سلطان محمد خان نے سید صاحبؒ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ وہ ہندوستان سے بھیجے گئے ایک خط کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے وہ خط بھی سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ خط ہندوستان کے چند سجادہ نشیں پیرزادوں نے سرحد کے خوانین کو لکھا تھا اور اس پر ان کی مہریں

(۸۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۵۴۔ (۸۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۴۷۔

ثبت تھیں۔ وہ خط مندرجہ ذیل مضمون پر مشتمل تھا:

سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن یہ ان کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین انہوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے۔ سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے انھیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ ان کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں کہ تمہارا ملک چھڑا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، انہیں تباہ کر دو۔ اگر اِس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔ (۸۹)

سلطان خان نے اقرار کیا کہ وہ اس خط کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی، پشاور میں شرعی نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا، سید صاحبؒ کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم کرنے والی طاقتوں کے خلاف جہاد کی نیت کی، اور ان کے ہاتھوں پر تجدید بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ ظاہراً سلطان خان کی دلیل میں وزن تھا جس کا مضبوط ثبوت وہ خط تھا جو اس نے پیش کیا تھا۔ سید صاحبؒ نے اس کا عذر قبول کیا اور اسے پشاور کی حکومت سونپنے کا وعدہ فرمایا۔ (۹۰)

سید صاحبؒ اس خط کو پڑھ کر بہت رنجیدہ ہوئے کہ چند نفس پرست لوگوں نے جن کی روزی

(۸۹) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۵۹۔

(۹۰) بعض مصنفین نے سید صاحبؒ کے پشاور سلطان محمد خان کو دوبارہ سونپ دینے کے فیصلے پر تنقید کی ہے۔ مثلاً مولانا عبید اللہ سندھیؒ اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" کے صفحہ ۱۶۹ پر لکھتے ہیں: "اس موقعہ پر جماعت مجاہدین کے خواص و عوام سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ مولانا اسماعیل اور ہندوستانی و افغانی اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید [سید احمد شہیدؒ] یہ غلطی نہ کریں، مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی۔" (بحوالہ مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۵۵۔۶۵۶)۔ غلام رسول مہر مولانا سندھیؒ کے اس بیان کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ بالکل غلط ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل یا افغانی و ہندوستانی اہل الرائے یا جماعت مجاہدین کے خواص و عوام سید صاحبؒ کے فیصلہ کو غلط قرار دینے میں متفق الکلمہ تھے۔" (سید احمد شہیدؒ، ۶۵۶)۔ مہر دوسری جگہ لکھتے ہیں: "میں جس حد تک تحقیق کر سکا ہوں، ہندوستانی غازیوں میں سے حافظ امام الدین رام پوری کے سوا کسی کو اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ سید صاحبؒ کا نقطۂ نگاہ سنتے ہی سب مطمئن ہو گئے۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے اس وقت اپنی رائے ظاہر کی اور نہ بعد میں کچھ فرمایا۔" (سید احمد شہیدؒ، ۶۵۴)۔ قمر احمد عثمانی مولانا سندھیؒ کی مذکورہ بالا رائے کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ بالکل غلط اور حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے کی بدترین کوشش ہے۔ تاریخی شواہد سے واقعات کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ارباب بہرام خان اور چند دوسرے مخلصین کو ابتداء میں پشاور کی حوالگی کے فیصلے سے اختلاف تھا، جس کا اظہار انہوں نے سید صاحبؒ سے کر دیا تھا۔ لیکن آپ سے گفتگو کرنے کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے اور مولانا اسماعیلؒ نے تو کسی موقعہ پر بھی اظہار اختلاف نہیں کیا۔" (بریلی سے بالاکوٹ، ۲۵۹۔۲۶۰)۔

روٹی بس اپنے خاندانی بزرگوں کے نام پر سجادہ نشینی سے وابستہ تھی نہ صرف ان پر پیچھے سے وار کیا تھا، بلکہ اسلامی تحریک کو نہایت سنگین نقصان پہنچایا تھا۔ سلطان محمد خان کی درخواست پر سید صاحبؒ نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو پشاور کا قاضی مقرر کیا، ان کی مدد کے لئے دس مجاہدین کو ان کے ساتھ چھوڑا، اور امان زئی ہوتے ہوئے پنجتار واپس ہو گئے۔

سوات کے باشندوں کی مخالفت

پشاور کی فتح سے ایک بار پھر علاقے میں سید صاحبؒ کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ امان زئی کے لوگوں نے سید صاحبؒ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور شرعی نظام قبول کرتے ہوئے انہیں امام المسلمین کی حیثیت سے عشر دینے کا وعدہ کیا۔ باجوڑ کے حکمراں میر عالم خان نے بھی سید صاحبؒ کو باجوڑ تشریف لانے اور وہاں نظام شرعی قائم کرنے میں رہنمائی کی دعوت دی۔ سید صاحبؒ نے اس مقصد کے لئے مولانا شاہ اسماعیلؒ کو سو مجاہدین کے ساتھ باجوڑ روانہ کیا۔ مولانا راستے میں لنڈ خور اور کاٹلنگ نامی مقامات پر رکے اور وہاں عشر کے قیام کا انتظام کیا۔ اس کے بعد انہوں نے سوات کے راستے باجوڑ پہنچنے کے لئے پیش قدمی کی۔ لیکن سوات کے لوگوں نے مجاہدین کو باجوڑ جانے سے روکا اور لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ چونکہ سوات اور باجوڑ میں لڑائی تھی، اس لئے سوات کے لوگوں کو اس بات کا خطرہ ہوا کہ باجوڑ کے باشندے اور مجاہدین مل کر بعد میں سوات پر حملہ آور ہوں گے اور انہیں سوات میں شرعی نظام اور عشر کے نفاذ کے لئے مجبور کریں گے۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے ان کے اس بے بنیاد اندیشے کو دور کرنے کی کوشش کی اور وضاحت کی کہ سید صاحبؒ کسی بھی ریاست میں زبردستی شرعی نظام کا نفاذ نہیں فرما رہے ہیں، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ جب سوات کے لوگوں سے جنگ کے بغیر باجوڑ پہنچنا ممکن نہیں رہا تو سید صاحبؒ نے جو مسلمانوں سے لڑنا ہرگز نہیں چاہتے تھے، مولانا شاہ اسماعیلؒ کو پنجتار واپس بلا لیا۔

خوفناک سازش

پشاور کی فتح کے بعد خیبر سے لے کر ریاست امب تک کا وسیع علاقہ سید صاحبؒ کے زیر اثر آ گیا۔ غلام رسول مہر کے مطابق، سید صاحبؒ کے لئے "اب اطمینان سے ایک لشکر منظم کر کے سکھوں پر کامیاب یورش کے بہترین امکانات پیدا ہو گئے تھے"۔ (۹۱) لیکن اس سے پہلے کہ سید صاحبؒ اس مقصد کے لئے تیار ہوتے، سلطان محمد خان نے ان کے خلاف ایک انتہائی

---

(۹۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۶۸۔

ناعاقبت اندیشانہ اور ظالمانہ سازش رچی۔ اس کے لوگوں نے خفیہ طور پر سمہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھاگ دوڑ شروع کردی تاکہ علاقے کے مقامی لوگوں کو مجاہدین کے خلاف کھڑا کرسکیں۔ مقامی ملاؤں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں نے علاقے کے سرداروں اور عوام کو بہکانے کے لئے وہی خط استعمال کیا جو ہندوستان سے چند پیرزادوں نے بھیجا تھا اور جسے سلطان خان نے سید صاحبؒ کو دکھایا تھا۔ یہ مہم بہت تیزی اور نہایت رازداری کے ساتھ چلائی گئی۔ جب علاقے کے سرداروں اور عوام کے تعاون پر اطمینان ہوگیا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ پورے علاقے میں مجاہدین جہاں کہیں تعینات ہوں، ان پر ایک مقررہ وقت پر ہر جگہ حملہ کردیا جائے اور انہیں قتل کردیا جائے۔

مجاہدین کو مقامی قبائلیوں کی بدلتی ہوئی نیت کا اندازہ نہیں ہوسکا، مگر ارباب فیض اللہ خان کو محسوس ہوگیا کہ پشاور کے حکمران باغیانہ انداز اپنانے لگے ہیں۔ انہوں نے فوراً قاضی پشاور مظہر علی کو اس کی اطلاع دی اور کہا کہ سید صاحبؒ کو بلاتاخیر صورت حال سے آگاہ کردیا جائے۔ چونکہ یہ معاملہ انتہائی حساس تھا، اس لئے مظہر علی نے پہلے اس خبر کی تصدیق کرلینے کا فیصلہ کیا۔ اسی درمیان ایک دن سلطان محمد خان نے انہیں اپنے دربار میں بلایا اور ان سے اپنے بھائی یار محمد خان کے قتل کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا۔ اب مظہر علی کو بھی یہ محسوس ہوا کہ ارباب فیض اللہ خان کی اطلاع میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ انہوں نے فوراً سید صاحبؒ کو صورت حال سے باخبر کردیا۔ سید صاحبؒ فکرمند ہوگئے، لیکن چونکہ سازش کی تفاصیل پوری طرح سامنے نہیں تھیں، اس لئے سلطان خان کے خلاف محض شک کی بناء پر کوئی تادیبی قدم اٹھانا مصلحت اور احتیاط کے خلاف تھا۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے مولانا مظہر علی کو فوراً خط لکھ کر اپنی طرف سے ہر قسم کے تنازعہ سے احتراز کرنے کی تلقین کی اور ہدایت دی کہ اگر صورت حال مزید بگڑے تو وہ خاموشی کے ساتھ پنجتار آجائیں۔

لیکن مظہر علی کبھی پنجتار واپس نہیں جاسکے۔ ایک دن سلطان محمد خان نے انہیں بلایا اور گفتگو کے بہانے ایک کمرہ میں لے گیا جہاں اس نے اپنے آدمیوں کو چھپا رکھا تھا۔ داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے مولانا مظہر علی پر تلوار سے حملہ کیا اور انہیں شہید کردیا۔ اس کے بعد پشاور میں تعینات سارے مجاہدین کو دھوکہ سے بے خبری میں شہید کردیا گیا۔ ان میں سے صرف منشی عمادالدین جو اس وقت اپنے ٹھکانے سے باہر تھے، بچ گئے۔ ارباب فیض اللہ خان کو بھی شہید کردیا گیا، اس لئے کہ خیال تھا کہ وہ مجاہدین کے خلاف خوں ریزی میں درانیوں کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس کے

بعد فوراً سلطان خان نے پورے علاقے میں ہدایت بھیج دی کہ تیسرے دن رات کے وقت ہر جگہ مجاہدین پر حملہ کر کے انہیں تہ تیغ کر دیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ وقت مقررہ پر نقارہ پیٹ کر علاقے کے لوگوں کو یہ پیغام دیا جائے کہ مجاہدین پر حملہ کا وقت آ گیا ہے۔ جب پشاور میں بغاوت اور مجاہدین کی شہادت کی اطلاع پنجتار پہنچی تو سید صاحبؒ ششدر رہ گئے۔ ان کے لئے اس بات کا یقین کرنا مشکل تھا کہ سلطان محمد خان اس حد تک جا سکتا ہے۔ فوراً شوریٰ کی میٹنگ بلائی گئی۔ چونکہ رات ہو چکی تھی اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ صبح ہوتے ہی علاقے میں تعینات سارے مجاہدین کو پنجتار بلا لیا جائے۔

جب باغیوں کو ان کے جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ علاقے میں تعینات سارے مجاہدین کو فوری طور پر واپس بلایا جا رہا ہے، تو انہوں نے مجاہدین پر حملہ کے مقررہ وقت میں تبدیلی کر کے آنے والی رات ہی میں اپنی سازش پر عمل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ مجاہدین پر حملہ کا آغاز اسماعیلہ نامی ایک مقام سے ہوا۔ حاجی بہادر خان نامی ایک مجاہد کو جن کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مقامی لوگوں میں بھی بہت عزت تھی، عشاء کی نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا۔ جب وہ سجدے میں گئے تو اسماعیلہ کے خان نے ان پر تلوار سے حملہ کیا اور انہیں شہید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسماعیلہ میں نقارہ پیٹا جانے لگا۔ فوراً ہی دوسرے مقامات سے بھی نقارے کی آواز آنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں سمہ کا پورا علاقہ نقارے کی آواز سے گونجنے لگا۔ نقارے کی آواز ایک اشارہ تھا کہ مجاہدین پر حملے کا وقت آ گیا ہے۔ مجاہدین پر مختلف مقامات پر کم و بیش ایک ہی وقت میں حملہ کر دیا گیا۔ بعض بے خبری میں شہید کر دیئے گئے، کچھ نے لڑ کر جان دی، بہت تھوڑے مجاہدین کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔

باغیوں پر ایک جنون طاری تھا۔ انہیں نہ دینی احکام کا لحاظ تھا اور نہ دنیاوی رشتے کا خیال۔ انہوں نے سدم نامی مقام پر ہر شخص کو تلوار اور چھری سے بے دردانہ شہید کر ڈالا۔ بعض کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح زمین پر لٹا کر ذبح کر دیا گیا۔ مثلاً عظیم اللہ خان برادر حاجی محمود خان کو اس کے خسر نے چھاتی پر بیٹھ کر ذبح کیا۔ (۹۴) منئی نامی ایک دوسرے مقام پر حملہ کے وقت مجاہدین نے ایک مسجد میں پناہ لی۔ باغیوں نے مسجد کو آگ لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ مسجد کو بچانے کی خاطر مجاہدین

---

(۹۴) عظیم اللہ خان ایک مقامی مجاہد تھے اور سدم والوں کے ہم قوم تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سدم میں شادی کی تھی۔ واضح ہو کہ کسی ہندوستانی مجاہد نے کسی مقامی لڑکی سے شادی نہیں کی تھی کہ زور زبردستی کا سوال پیدا ہوتا۔ (مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۹۳۔۶۹۴)۔

مسجد سے باہر آگئے اور باغیوں کا مقابلہ کیا۔ تقریباً پچیس مجاہدین شہید ہو گئے اور آٹھ لڑ بھڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔ بعض مقامات پر چند مجاہدین حسن اتفاق سے بچ گئے۔ بہت سے مقامات پر ایک مجاہد بھی زندہ نہیں بچا۔ غلام رسول مہر ''منظورۃ'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''عشا کی نماز کے وقت بعض بعض (مجاہدین) نماز میں مشغول تھے، بعض نماز کی تیاری کے سلسلے میں طہارت وغیرہ کر رہے تھے کہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کشت وخون کا آغاز کر دیا۔ بعض دیہات میں آدھی رات کو، بعض میں نماز فجر سے پیشتر یا عین حالت ادائے نماز میں نمازیوں کو قتل کر ڈالا گیا۔ کم لوگ تھے جو فرصت پا کر بھاگ سکے یا کسی محفوظ جگہ گھس سکے''۔ (۹۳)

سمہ سے ہجرت

سید صاحبؒ کو اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ مقامی مسلمان اتنا انتہائی قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس واقعہ نے ان کے سامنے یہ سوال اٹھا دیا کہ انہیں اسی علاقے میں ٹھہر کر اصلاح وجہاد کا کام جاری رکھنا چاہیے، یا کسی دوسرے مناسب مقام پر ہجرت کر جانا چاہیے جہاں وہ سمہ کی طرح لامتناہی مخالفت اور اسلام دشمنی کے بغیر اسلام کا کام سرانجام دے سکیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک اس علاقے میں محنت کی تھی، لیکن بدلے میں مقامی مسلمانوں نے ان کے ان رفقاء کو بلا وجہ قتل کر ڈالا جو اس وقت اسلامیت کا بچا کھچا سرمایہ اور اس کی آبرو کی حیثیت رکھتے تھے اور جنہوں نے حقیقتاً اپنا خون بہا کر انہیں سکھوں کی محکومی سے نجات دلائی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سمہ میں ٹھہر کر شک وشبہ، بے یقینی اور ٹکراؤ کے ماحول میں کام کرنے کے بجائے انہیں دوسرا میدان عمل تلاش کرنا چاہیے۔ غور وخوض کے بعد انہوں نے کشمیر کی طرف ہجرت کر جانے کا فیصلہ فرمایا اور اپنے رفقاء کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

بغاوت کے اسباب کی تحقیق

لیکن یہ فیصلہ سید صاحبؒ نے نہ جذباتیت میں لیا اور نہ ہی جلد بازی میں۔ انہوں نے ہجرت سے پہلے اس بات کی تحقیق کا فیصلہ کیا کہ مجاہدین کے قتل عام کی کیا وجہ تھی جب کہ ان کے خلاف کبھی کوئی شکایت سید صاحبؒ کے سامنے نہیں لائی گئی۔ انہوں نے تختہ بند کے سید میاں کو بغاوت کے اسباب کی تحقیق کی ذمہ داری دی۔ سید میاں اور منگل تھانہ کے اخوندزادہ قابل نے

---

(۹۳) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۹۶۔

پورے علاقے کا دورہ کیا اور باغی سرداروں سے ملاقات کی۔ مقامی باغیوں نے انہیں بتایا کہ مجاہدین انہیں معمولی غلطیوں اور بے اصولیوں پر سزا دیتے تھے، اس لئے انہوں نے بغاوت کی اور انہیں شہید کر دیا۔ سید میاں اور اخوندزادہ ان لوگوں کی اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوئے اور ان سے کہا کہ جو غلطی یا بے اصولی شریعت کی نگاہ میں قابل سزا ہے، اس پر سزا دینا ذمہ داروں کا فرض منصبی تھا، خصوصاً جب علاقے کے سرداروں نے یہ رضا اور رغبت شرعی نظام کے نفاذ کے لئے سید صاحبؒ سے خود درخواست کی تھی۔ مقامی لوگوں نے اس پر کہا کہ ان کی بغاوت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ قاضیوں نے ان پر اپنی ایسی لڑکیوں کی جلدی شادی کر دینے کے لئے دباؤ ڈالا جو سن بلوغ کو پہنچ چکی تھیں۔ سید میاں اور اخوندزادہ نے ان کی اس دلیل کو بھی مسترد کر دیا، اس لئے کہ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ قاضیوں نے صرف ان خواتین کی جلد شادی اور رخصتی کے لئے دباؤ ڈالا تھا جن کے والدین قبائلی رسم و رواج کے مطابق لڑکے سے جہیز کی بھاری مانگ کرنے کی وجہ سے ان کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کر رہے تھے۔ تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ کسی مقامی لڑکی سے کسی مجاہد نے شادی نہیں کی۔ ایسی ہر لڑکی کی شادی مقامی قبیلے میں ہی ہوئی تھی۔ (۹۴)

مقامی لوگوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں ہندوستان سے بھیجا گیا ایک خط دکھایا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ سید صاحبؒ (نعوذ باللہ) ایک بدعقیدہ مسلمان اور انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ وہی خط تھا جو سلطان محمد خان نے سید صاحبؒ کو دکھایا تھا۔ پہلی بار تو یہ مان لینے کی گنجائش تھی کہ اس خط سے سلطان محمد خان اور دوسرے سردار غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، لیکن اب دوسری بار اس کو غلط فہمی کا سبب ٹھہرانا کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا۔ اس طرح جب پوری تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ سلطان خان اور سمہ کے دوسرے خوانین اور عوام کی بغاوت ایک سازش تھی تو سید صاحبؒ نے ان لوگوں سے احیاءِ اسلام کے لئے تعاون کی امید اٹھا لی اور سرحد سے ہجرت کا فیصلہ فرما لیا۔

---

(۹۴) اگر بغاوت کی وجہ چند قاضیوں کی غیر ضروری سختی تھی تو اس کا اثر صرف ان علاقوں میں ہونا چاہئے تھا جہاں ایسی بے اصولی ہوئی تھی۔ اس کا اطلاق سارے قاضیوں پر کیسے ہو سکتا تھا؟ اگر مجاہدین کے قتل عام کی وجہ چند قاضیوں کی بے اصولی تھی تو مولانا مظہر عظیم آبادی کو سلطان محمد خان نے اپنے دربار میں بلا کر سب کے سامنے یہ کیوں پوچھا کہ اس کے بھائی یار محمد کو (جو مجاہدین کے خلاف جنگ میں مارا گیا تھا) کیوں قتل کیا گیا؟ پھر مولانا مظہر علی کو کیوں شہید کر دیا گیا جب کہ ان کے خلاف کسی بے اصولی کی شکایت نہیں تھی؟ اگر مظہر علی نے بھی مذکورہ بالا غلطی کی تھی تو پشاور میں سلطان خان خود موجود تھا اور ان سے اس کے بارے میں استفسار کر سکتا تھا اور مطمئن نہ ہونے کی حالت میں سید صاحبؒ سے شکایت کر سکتا تھا۔

سید صاحبؒ کا سرحد سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ بعد کے چند مؤرخین کے لئے افسوس و رنج کا باعث ہوا اور بعض ذہنوں میں اس فیصلے کے صحیح ہونے کے بارے میں اشکال رہا۔لیکن حقائق پر غائر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحبؒ نے ہجرت کا فیصلہ پورے غور و فکر کے بعد کیا تھا جو ہر طرح سے حقیقت پسندانہ اور صحیح تھا۔مندرجہ ذیل چند باتیں اس حقیقت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

۱۔یہ بغاوت کسی فرد یا پالیسی کے خلاف نہیں تھی جہاں جزوی اصلاح سے شکایت دور ہو سکتی تھی۔حقیقتاً یہ شرعی نظام کے نفاذ کے خلاف بغاوت تھی۔حالانکہ لوگوں کو مانوس کرنے کے لئے ایک مدت تک محنت کی گئی تھی ۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ''نعوذ باللہ، اہل سمہ نمازیوں کے جثوں (شہدائے مجاہدین کے جسموں) پر گھوڑے دوڑاتے وقت یہی دو باتیں کہتے تھے کہ یعنی نماز اور عشر، حالانکہ کلمہ گو تھے۔معلوم ہوا کہ یہی دو شرعی باتیں ان پر شاق تھیں کہ سوئے ہوئے غازیوں پر حملہ کر کے انہیں مار ڈالا۔''(۹۵)

۲۔اس بار کسی ایک سردار خادی خان یا یار محمد خان نے بغاوت نہیں کی تھی، بلکہ پشاور کے حکمران اور سمہ کے بہت سے خوانین، ملا اور عوام اس سازش میں ملوث تھے۔سوات کا حکمران اور عوام پہلے ہی سے لڑنے پر آمادہ تھے۔سمہ کے باقی خوانین کی وفاداری پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ اب انہیں اپنا مطیع بنانے اور دعوت کے زیر اثر لانے کے لئے سید صاحبؒ کو سمہ کے بیشتر خوانین اور عوام کے خلاف صف آرا ہونا پڑتا۔

۳۔مجاہدین کے لئے اب پنجتار بھی محفوظ نہیں تھا اور وہاں کے حاکم فتح خان کی وفاداری بھی اب مشکوک ہو گئی تھی۔مجاہدین کے قتل عام کے بعد ایک دن اچانک اس نے اپنے قبیلے کے بہت سارے لوگوں کو پنجتار میں جمع کر لیا اور اس معاملے میں سید صاحبؒ سے مشورہ تک نہیں کیا۔دوسرے موقعہ پر جب پنجتار کے لوگوں نے جمع ہو کر سید صاحبؒ سے ہجرت نہ کرنے کی درخواست کی تو عام مجمع میں سید صاحبؒ نے واضح طور پر کہا کہ ان کے ہجرت کرنے یا رک جانے کا فیصلہ پورے طور پر فتح خان کی خواہش اور مشورے پر منحصر ہے۔اس پر فتح خان سید صاحبؒ کے قریب آ گیا اور دھیمی آواز میں جسے اور کوئی نہیں سن سکتا تھا، دیر تک سید صاحبؒ سے باتیں کرتا رہا۔شاید وہ علاقے کے باغی خوانین کی مجموعی طاقت کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔اس گفتگو کے فوراً بعد ہی سید

(۹۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۹۶۔

صاحبؒ نے اعلان کر دیا کہ ہجرت کا ان کا فیصلہ حتمی ہے۔ پنجتار سے جب وہ ہجرت کر کے کاٹل گرام نامی مقام پر پہنچے تو انہوں نے اپنے رفقاء سے فرمایا: "بھائیو! اب اس وقت ہم تم سے کہتے ہیں کہ سمہ میں جو کچھ بلوا اور کشت وخون ہوا، یہ سب فتح خان کی شرارت تھی"۔ (۹۶)

۴۔ اگر سید صاحبؒ سلطان محمد خان اور سمہ کے باغی سرداروں کے خلاف طاقت کے استعمال کا فیصلہ کرتے تو یہ مسلم حکمراں یقیناً سکھ حکمراں سے مصالحت کر لیتے۔ خادی خان، یار محمد خان، پائندہ خان، اور خادی خان کے بھائی امیر خان نے یہی راہ اختیار کی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سید صاحبؒ کے احیاء اسلام کے مشن کی انتہائی افسوس ناک شکست ہوتی۔

۵۔ اس میں شک نہیں تھا کہ کشمیر جیسی نئی جگہ میں ہجرت کرنے کے بعد احیاء اسلام کے کام کو از سر نو شروع کرنا ایک مشکل کام تھا، لیکن اس میں کامیابی ناممکن بھی نہیں تھی۔ کشمیر سید صاحبؒ کی نگاہ میں ہمیشہ سے ایک ممکن میدان عمل رہا تھا۔ انہوں نے ماضی میں کشمیر کی طرف پیش قدمی کی ابتدائی کوشش بھی کی تھی۔ پھر چترال اور وادیٔ کاغان کے حکمرانوں نے کشمیر پر حملے میں سید صاحبؒ کو اپنی شرکت اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اس کے علاوہ چار ایسے خوانین یا ان کے سفیر اس وقت بھی پنجتار میں موجود تھے جن کی ریاستیں کشمیر کے راستے میں پڑتی تھیں۔ اگر چہ غاصبوں نے ان خوانین کو ان کی ریاستوں سے بے دخل کر کے علاقے سے نکال دیا تھا، لیکن وہ اب بھی اپنے اپنے علاقے میں اثر رکھتے تھے اور کشمیر پر پیش قدمی میں سید صاحبؒ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار تھے۔ (۹۷)

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سید صاحبؒ کا ہجرت کا فیصلہ عملی نقطہ نظر سے ایک صحیح اور حقیقت پسندانہ فیصلہ تھا۔

ایک دن سید صاحبؒ نے اپنے سارے رفقاء کو جمع اور کیا اور ہجرت وجہاد کے پر خطر و پر مشقت راہ میں ساتھ دینے کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ آئندہ منزل کے غیر یقینی ہونے کے پیش نظر وہ ان سب رفقاء کو بخوشی گھر لوٹ جانے کی اجازت دیتے ہیں جو اس نئی ہجرت میں ان کا ساتھ دینے میں متامل ہیں۔ سید صاحبؒ کی بات سن کر مجاہدین بے اختیار رو پڑے اور بہ یک آواز پکار اٹھے کہ وہ ہر حال اور ہر منزل میں سید صاحبؒ کے ساتھ ہیں۔ ایک مجاہد نے بھی ان سے جدائی اختیار نہیں کی۔ جب ارباب بہرام خان نے اپنے اہل خانہ کو جن میں ان کی اہلیہ، بیٹی،

---

(۹۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۳۷۸۔

(۹۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۳۳۔

پانچ بیٹے اور بھتیجے شامل تھے واپس وطن لوٹ جانے کا مشورہ دیا تو ان سب کا متفقہ جواب تھا: ''ہم ہر حال میں ساتھ رہیں گے خواہ کچھ پیش آئے۔'' (۹۸)

کشمیر کی جانب

سید صاحبؒ نے ۱۸۳۰ء کے دسمبر (رجب ۱۲۴۶ھ) میں پنجتار سے ہجرت کی۔ کشمیر منزل طے پائی اور ان کا قافلہ قاسم خیل ہوتے ہوئے وادی جملہ کی طرف بڑھا۔ یہ انتہائی دشوار گزار پہاڑی راستہ تھا۔ انیس، بیس دنوں کے پر مشقت سفر کے بعد وہ راج دواری پہنچے جو ایک بڑا مقام تھا اور وہاں کی سہولیات ایک فوج کے قیام کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ یہ موسم سرما کا زمانہ تھا اور برف باری کی وجہ سے فوج کی نقل و حرکت دشوار تھی، اس لئے سید صاحبؒ نے راج دواری میں ہی قیام کا فیصلہ کیا۔ اب یہاں لوگوں کو مانوس کرنے کے بعد سید صاحبؒ کو مقامی سرداروں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا مشکل کام انجام دینا تھا اور اس کے بعد سکھوں کی یورش کا سدباب کرنا تھا جو موسم سرما کے بعد مال غنیمت کی تلاش میں اس علاقے میں داخل ہو جاتے تھے اور اسے تاخت و تاراج کر دیتے تھے۔ اس کے بعد ہی علاقے کے سرداروں سے تعاون کی امید کی جا سکتی تھی۔ چونکہ یہ علاقے کشمیر کے راستے میں تھے اس لئے یہاں کے لوگوں کو ساتھ لینے کی وجہ سے سید صاحبؒ کے لئے کشمیر پر پیش قدمی آسان ہو جاتی۔

راج دواری میں قیام

راج دواری میں قیام کے آغاز میں ہی دو مقامی سردار حبیب اللہ خان اور ناصر خان نے، جن کے درمیان سید صاحبؒ نے صلح کرا دی تھی، آپسی رنجش بھلا کر مجاہدین کے لئے رسد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے علاقے کے سرداروں کا ایک عمومی اجتماع منعقد کیا اور ان سے سکھوں کے حملوں سے بچنے کے لئے ضروری مشورے کیے۔ ان سب نے برضا و رغبت سید صاحبؒ کو امیر المومنین کی حیثیت سے قبول کیا اور اپنے علاقے میں شرعی نظام نافذ کرنے اور عشر ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طے پایا کہ سکھوں کی یورش کے وقت وہ سب ان سے سید صاحبؒ کی قیادت میں لڑیں گے۔

مدافعانہ تدابیر کے طور پر سید صاحبؒ نے ان راستوں پر اپنے دستے تعینات کر دیئے جن

---

(۹۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۴۔ ۷۔ مزید دیکھئے ۲۰۲۔ ۷۔ ۲۰۵۔ ۷۔

سے ہو کر سکھ اس علاقے میں داخل ہوتے تھے اور دفاعی انتظامات کے لئے مولانا محمد اسماعیلؒ کو ذمہ دار مقرر فرمایا۔ مولانا نے دیگر اہم مقامات پر مجاہدین کو تعینات کر کے دفاعی انتظام کو مزید مضبوط کیا اور اس طرح راج دواری سے بالاکوٹ کا پورا علاقہ کنٹرول میں لے لیا گیا۔

مظفر آباد کی مہم

اس دوران میں کئی مقامی سرداروں نے مولانا شاہ اسماعیلؒ کو مشورہ دیا کہ چونکہ سلطان نجف خان، جس نے سلطان زبردست خان کو بے دخل کر کے مظفر آباد پر سکھوں کی مدد سے قبضہ کر لیا تھا، ان دنوں سکھ سپہ سالار شیر سنگھ کی معیت میں مظفر آباد سے باہر گیا ہوا تھا، اس لئے اس کی غیر موجودگی میں مظفر آباد کو قبضہ میں لے لیا جائے۔ سلطان زبردست خان نے بھی جو اس وقت سید صاحبؒ کے ساتھ تھا، وعدہ کیا کہ مظفر آباد پر قبضہ ہوتے ہی وہ مجاہدین کے لئے نئے ہتھیار اور ضروری سہولتیں فراہم کرے گا۔ اس وقت مظفر آباد کی حفاظت کے لئے وہاں سات، آٹھ سو سپاہی موجود تھے۔ مجاہدین نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مظفر آباد پر حملہ کر دیا اور زبردست خان کے محل اور شہر کے بازار نامی حصے پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے قبضہ میں صرف چھاؤنی اور گڑھی رہ گئی۔ (۹۹) اس درمیان سید صاحبؒ راج دواری سے اٹھ کر پچون آ گئے۔ (۱۰۰)

مظفر آباد کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لینے کے بعد مجاہدین نے چھاؤنی اور گڑھی پر جو اب سکھوں کے قبضہ میں تھا، حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے لئے بہتر ہتھیار کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں زبردست خان سے رابطہ قائم کیا گیا، لیکن مظفر آباد کے مفتوحہ علاقے میں قدم جمانے کے بعد اس نے ٹال مٹول کی پالیسی اختیار کی۔ ادھر چونکہ سکھ فوج شیر سنگھ کی قیادت میں علاقے میں موجود تھی، اس لئے مجاہدین جلد از جلد مظفر آباد پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔ جلد ہی مجاہدین کو یہ اطلاع بھی ملی کہ زبردست خان نے در پردہ سکھوں کے ساتھ مصالحانہ گفتگو شروع کر رکھی ہے۔ اس اطلاع سے مجاہدین نہایت آزردہ خاطر ہوئے اور انہوں نے ضروری سمجھتے ہوئے اپنے بل بوتے پر چھاؤنی پر حملہ کر کے اسے سکھوں سے چھین لیا۔ سکھوں نے اب گڑھی میں پناہ لی۔ نئی تیاری کے

(۹۹) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۰۷۔

(۱۰۰) پچون میں سید ضامن شاہ، حاکم کوائی (کاغان) جو عرصہ سے سید صاحبؒ سے مراسلات کے ذریعہ تعلق رکھتا تھا، حاضر ہوا، سید صاحبؒ سے بیعت کی، اور جہاد میں مخلصانہ شرکت کی۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد بھی وہ مجاہدین کی امداد میں سرگرم رہا۔ (مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۲۳)۔

بغیر گڑھی کو فتح کرنا ناممکن تھا اور زبردست خان کے امروز و فردا پر مبنی وعدے طول پکڑتے جا رہے تھے۔ اس درمیان شیر سنگھ سکھ فوج کے ساتھ حبیب اللہ نامی مقام پر آ پہنچا۔ نجف خان اس کے ساتھ تھا۔ وہاں سے اس نے مظفر آباد کا رخ کیا۔

سکھ فوج کی آمد کی اطلاع ملتے ہی زبردست خان نے مولوی خیر الدین سے جو مجاہدین کے سپہ سالار تھے، رابطہ قائم کیا اور مدد کی درخواست کی۔ مولوی خیر الدین زبردست خان سے بہت ناخوش تھے، لیکن یہ وقت آپسی نزاع کا نہیں تھا۔ انہوں نے زبردست خان کی مدد کا فیصلہ کیا اور مجاہدین کو جنگی اہمیت کے مقامات پر متعین کیا۔ لیکن دوسرے دن صبح تک زبردست خان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مظفر آباد سے اپنا قبضہ اٹھا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ اب مولوی خیر الدین کے لئے اس صورت حال کا سنبھالنا ممکن نہیں تھا، اس لئے انہوں نے مجاہدین کو ساتھ لیا اور بالاکوٹ واپس چلے گئے۔

مظفر آباد کو قبضہ میں لینے کے بعد شیر سنگھ گڑھی حبیب اللہ گیا اور وہاں سے سپاہیوں اور سامان جنگ کا پورا انتظام کر کے مجاہدین کے خلاف ایک حملے کے ارادے سے بالاکوٹ کی طرف بڑھا اور بالاکوٹ سے ڈھائی میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔ جب سید صاحبؒ کو اندازہ ہوا کہ شیر سنگھ بالاکوٹ پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو انہوں نے علاقے میں تعینات سارے مجاہدین کو بالاکوٹ میں جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی بالاکوٹ منتقل ہو گئے۔

بالاکوٹ کی جنگ

بالاکوٹ پر حملہ کرنے کے لئے شیر سنگھ پہاڑ پر چڑھ کر مٹی کوٹ پر اپنی فوج اتار سکتا تھا، لیکن مٹی کوٹ تک پہنچنے کے لئے اسے ایک غیر معروف راستہ اختیار کرنا پڑتا جو صرف وہاں کے مقامی مسلمانوں ہی کے علم میں تھا۔ یا پھر وہ کنہار ندی کے مشرقی ساحل کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا بالاکوٹ کے سامنے پہنچ سکتا تھا۔ سید صاحبؒ نے ہر ممکن راستے کی حفاظت کے لئے ضروری انتظام کر رکھا تھا۔ انہوں نے مٹی کوٹ والے غیر معروف راستے پر بھی پہرا بٹھا رکھا تھا اور ایک دوسرا دستہ مٹی کوٹ پر بھی تعینات تھا۔ کنہار پر ایک لکڑی کا پل بھی ندی کی دوسری جانب آنے جانے کے لئے بنایا گیا تھا۔ سکھوں نے وہاں سے ذرا ہٹ کر اپنے لئے ایک پل بنا لیا تھا۔ سید صاحبؒ نے دونوں پلوں کے درمیان ایک محفوظ مقام پر مجاہدین کا ایک دستہ تعینات کر رکھا تھا تا کہ اپنے پل کی حفاظت

بھی کی جا سکے اور سکھوں کی نقل و حرکت بھی نظر میں رہے۔

ایک دن سکھ فوج نے پل پار کیا، لیکن وہ بالا کوٹ کی طرف بڑھنے کے بجائے دوسری طرف مڑ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں نظر سے اوجھل ہو گئی۔ ندی کی دوسری جانب ان کے خیمے کھڑے تھے جن کی حفاظت کے لئے سکھوں کی ایک مختصر فوج بھی وہاں موجود تھی۔ پھر یہ خبر پھیل گئی کہ سکھ فوج پشاور واپس ہو رہی ہے۔ لیکن دراصل یہ سکھوں کی ایک جنگی چال تھی۔ سکھ فوج نے دوسری جانب سے ایک طویل راستہ اختیار کیا اور تقریباً اکیس میل کی مسافت طے کر کے اچانک مٹی کوٹ کے سامنے نمودار ہوئی۔ روایت ہے کہ بعض مقامی مسلمانوں نے اس غیر معروف راستے تک سکھوں کی رہنمائی کی۔ پہرے پر تعینات مجاہدین نے سکھ فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن سکھ فوج ان پر حاوی ہو گئی۔ حملے کی اطلاع ملتے ہی سید صاحبؒ نے چار دستے کمک کے طور پر بھیجے، لیکن جب سکھ فوج مٹی کوٹ کے نیچے پہنچ چکی تھی تو جسے جو راستہ ملا، اس کے ذریعہ وہ مٹی کوٹ پر چڑھنے لگا اور شام تک پوری فوج اوپر پہنچ گئی۔ مٹی کوٹ پر مجاہدین کا جو دستہ تعینات تھا، وہ سکھوں سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن نہیں چھوڑی۔

اسی شام نجف خان (جس نے مظفر آباد پر سکھوں کی مدد سے قبضہ کر رکھا تھا) کا ایک نجی خط سید صاحبؒ کے نام آیا۔ خط میں اس نے سید صاحبؒ کے لئے عقیدت و تعظیم کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ سکھوں کو مظفر آباد پر قبضہ کرنے کی غرض سے لایا تھا۔ اس کا مقصد انہیں سید صاحبؒ کے خلاف کھڑا کرنا نہیں تھا۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ شیر سنگھ کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں اور لکھا تھا کہ اگر سید صاحبؒ سکھوں سے مقابلہ کے لئے خود کو تیار نہیں پاتے ہوں تو وہ پہاڑوں میں مراجعت اختیار کر کے سکھوں کی پہنچ سے دور ہو جائیں۔ (۱۰۱) اس نے مزید یہ بھی لکھا کہ شیر سنگھ نے ہتھیار اور دیگر سامان جنگ خیمے میں اس کی نگرانی میں چھوڑا ہے اور سید صاحبؒ شب خون مار کر اس پر قبضہ کر سکتے ہیں جس میں وہ ان کی مدد کرے گا۔ سید صاحبؒ نے اپنے رفقاء کے سامنے وہ خط پڑھوایا۔ ان سے مشورہ کیا اور صورت حال کے سب پہلو پر غور کیا۔

سید صاحبؒ نے شب خون نہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ وہ نجف خان کو پہلے سے نہیں جانتے تھے اور اس کے مشورہ پر اس طرح سے بھروسہ کر لینا خلاف مصلحت تھا۔ آخر کار نجف خان سکھوں کا

---

(۱۰۱) مجاہدین کی تعداد ایک ہزار تھی اور چونکہ وہ پنجتار رسے بالا کوٹ پہاڑی راستوں سے آئے تھے اس لئے وہ اپنے ساتھ بڑے اور وزنی ہتھیار نہیں لا سکے تھے۔

حلیف تھا۔ انہوں نے جنگ سے ہٹ جانے اور پہاڑوں میں مراجعت اختیار کر کے خود کو بچا لینے کے مشورہ کو بھی رد کر دیا۔ اس طرح سید صاحبؒ اور مجاہدین تو محفوظ ہو جاتے لیکن سکھ مقامی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیتے۔ تیسرا راستہ سکھوں سے اسی جگہ جنگ کرنے کا تھا اور سید صاحبؒ نے اسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ جیسا کہ غلام رسول مہر نے لکھا ہے: ''اس موقعہ پر یہی مناسب تھا کہ تدبیر کا پہلو اختیار کرنے کے بجائے شجاعت کے تقاضوں کو مقدم رکھا جاتا۔'' (۱۰۲)

سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: ''جنگ کے سلسلے میں ایک مقام ضرور ایسا آتا ہے جہاں فیصلہ کن جنگ اور ثبات و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (۱۰۳) وہ مقام سید صاحبؒ کے لئے بالاکوٹ میں آپہنچا تھا۔ اکثر مقامی سرداران کے ساتھ تھے۔ پھر بالاکوٹ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے ایک انتہائی محفوظ مقام تھا۔ سید صاحبؒ نے ٹونک کے حکمراں نواب وزیرالدولہ کو ایک خط میں چند دن قبل ہی لکھا تھا: ''چونکہ یہ مقام (بالاکوٹ) نہایت محفوظ ہے، (سکھ) لشکر خدا کے فضل سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور نکل کر لڑیں تو جنگ ہو سکتی ہے۔'' (۱۰۴) ان سب باتوں پر غور خوض کے بعد سید صاحبؒ نے سکھوں سے بالاکوٹ میں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے رفقاء سے فرمایا: ''اب کفار کے ساتھ یہیں لڑیں گے۔ اسی میدان میں لاہور ہے اور اسی میں جنت''۔ (۱۰۵)

بالاکوٹ پر حملہ کرنے کے لئے سکھوں کو مٹی کوٹ سے اتر کر ایک میدان پار کرنا ہوتا۔ سید صاحبؒ نے اس میدان میں کافی پانی چھوڑنے کا حکم دیا جس سے پورے میدان میں کیچڑ ہو گیا اور سکھوں کا اس کو عبور کرنا دشوار ہو گیا۔ مجاہدین میدان سے بلندی پر بالاکوٹ میں تھے اور انہوں نے جنگی اہمیت کے نقطۂ نظر سے مختلف مقامات پر مورچے قائم کر رکھے تھے۔ اس طرح صورت حال یہ ہو گئی کہ بالاکوٹ پر حملہ کرنے کے لئے جو سکھ میدان میں اترتے، وہ مجاہدین کے نشانے پر ہوتے اور انہیں حفاظت کے لئے کسی چیز کی آڑ لینے کا موقعہ نہیں ملتا۔ سید صاحبؒ نے جنگ میں خود اپنے ہاتھ میں کمان لینے کا فیصلہ کیا۔ ان سب مورچوں سے جو سکھوں کے مٹی کوٹ پہنچ جانے کے بعد غیر ضروری ہو گئے تھے مجاہدین کو واپس بلا لیا گیا۔ سید صاحبؒ نے اس پل کو جو مجاہدین نے ندی کے پار

---

(۱۰۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۵۶۔

(۱۰۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ص ۴۲۰۔ فٹ نوٹ ۱۔

(۱۰۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۵۰۔۷۵۱۔ (۱۰۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۵۳۔

جانے کے لئے بنایا تھا، منہدم کردینے کا حکم دیا تاکہ جنگ کے وقت سکھ اسے استعمال نہ کرسکیں۔ اور ان سب تدابیر کے اختیار کرنے کے بعد انہوں نے سارے مجاہدین کو تلقین کی کہ وہ الحاح اور اخلاص کے ساتھ دعاء واستغفار میں مشغول رہیں۔

رات کے پچھلے پہر سید صاحبؒ حسب معمول تہجد کے لئے بیدار ہوئے اور نماز و ذکر میں مشغول رہے۔ صبح کی نماز کے لئے وہ مسجد تشریف لائے اور امامت کی۔ نماز کے بعد وہ مسجد میں ہی انفرادی طور پر ذکر و دعاء میں مشغول رہے۔ طلوع آفتاب کے کچھ دیر کے بعد انہوں نے اشراق کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد وہ مسجد سے باہر تشریف لائے اور جہاد میں شرکت کی تیاری کرنی شروع کردی۔ انہوں نے لب ترشوائے، بالوں میں کنگھی کی، آنکھوں میں سرمہ لگایا، لباس تبدیل کیا، ہتھیار زیب تن کئے اور مسجد، جو بالاکوٹ کے بالائی حصے میں تھی، تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دو رائفل بردار مجاہد تھے۔ وہ عموماً جنگ کے موقعہ پر دو رائفل بردار مجاہد اپنے ساتھ رکھتے تھے جو رائفل میں گولیاں ڈال کر انھیں دیتے تھے۔ وہ اتنی تیزی سے فائر کرتے تھے کہ ایک مجاہد اس کام کے لئے ناکافی ہوتا تھا۔

اطلاع پہنچی کہ سکھ فوج نے بالاکوٹ کی طرف پیش قدمی کردی ہے اور مجاہدین کے مورچوں پر فائر کرنا بھی شروع کردیا ہے۔ سید صاحبؒ نے ہدایت دی کہ مجاہدین بھی اپنے مورچوں سے سکھوں پر گولیاں چلائیں، لیکن عام حملہ کے لئے سید صاحبؒ کے حکم کا انتظار کیا جائے۔ یہ فرما کر وہ مسجد کے دالان میں تنہا اللہ تعالیٰ سے دعاء میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مسجد سے باہر آئے اور میدان جنگ کی طرف بڑھے۔ ارباب بہرام خان ان سے چند قدم آگے چل رہے تھے۔ دادا ابوالحسن نے اسلامی علم بلند کیا اور سید صاحبؒ کے آگے ہوگئے۔ پھر بندوقچیوں کا ایک دستہ جن کے پاس دور مار کرنے والی بندوقیں تھیں، ان کے آگے پوزیشن لے کر چلنے لگا۔ فوراً ہی قرابین (نزدیک مار کرنے والی بندوق) سے لیس سپاہیوں کا ایک دستہ بھی آکر ان میں شامل ہوگیا۔ سید صاحبؒ نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ وہ جنگ میں شریک ہورہے ہیں۔ اس کے بعد وہ تیز رفتاری کے ساتھ مجاہدین کے سب سے آگے والے مورچہ کی طرف بڑھے۔ وہ مسلسل دھیمی آواز سے ''اللہ اکبر'' کہتے جارہے تھے۔ وہ اپنے رفقاء کے ساتھ مجاہدین کے سب سے آگے کے مورچہ پر پہنچے اور وہاں انہوں نے اور ان کے رفقاء خاص نے ایک بڑی چٹان کی آڑ میں مورچہ بنالیا۔ وہاں سے وہ حملہ آور سکھ فوج کا بخوبی جائزہ لے رہے تھے۔

مجاہدین اپنے اپنے مورچوں سے فائر کر رہے تھے، لیکن عمومی حملہ کے لئے انہیں سید صاحبؒ کی جانب سے ہدایت کا انتظار تھا۔

اس وقت سکھ فوجیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اومٹی کوٹ کی پہاڑی سے نیچے اتر کر میدان میں پہنچ چکی تھی اور بالا کوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ باقی فوج بھی مٹی کوٹ سے اتر رہی تھی۔ پوری فوج نے ایک ساتھ مجاہدین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب سکھوں کا پہلا دستہ زد پر آ گیا تو سید صاحبؒ نے اپنے ساتھ کے بندوقچی دستے کو اس پر فائر کرنے کا حکم دیا۔ بندوقچی اور شاہین بردار مجاہدین نے ایک ساتھ سکھوں پر فائر کیا اور انہیں گولیوں پر رکھ لیا۔ سکھ کھلے میدان میں تھے، اس لئے ان میں سے بہت سے سپاہی قتل وزخمی ہو گئے۔ دو سپاہیوں نے جو سکھ فوج کے علم بردار تھے، سینے پر گولی کھائی اور مردہ گر پڑے۔ اگرچہ دوسرے سکھ سپاہیوں نے فوراً علم اٹھا لیا اور اسے دوبارہ بلند کیا، لیکن تھوڑی ہی دیر کے لئے علم کو گرتے دیکھ کر سکھ فوج تذبذب کا شکار ہو گئی اور اس کا حوصلہ مجروح ہوا۔ سید صاحبؒ نے بس اسی لمحہ کو جس میں سکھ فوج اچانک تذبذب اور کم حوصلگی کا شکار ہو گئی تھی، عمومی حملہ کے لئے مناسب سمجھا اور "اللہ اکبر" کا پر شکوہ نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنے مورچہ سے نکل کر سکھوں پر حملہ آور ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی مجاہدین کی طرف سے عام حملہ کر دیا گیا۔ (۱۰۶)

مجاہدین کا حملہ انتہائی شدید تھا۔ سکھ ان کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ وہ پیچھے ہٹے اور واپس مٹی کوٹ کی پہاڑی پر چڑھنا چاہا۔ سید جعفر علی نقوی کے مطابق:

> سید صاحب اور آپ کے ساتھی بجلی اور آندھی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سکھوں کے سر پر پہنچے۔ ان (سکھوں) میں سے بعض نے نیزہ وشمشیر اٹھانے کا حوصلہ کیا، باقی بھاگ نکلے۔ لیکن راہ گریز کہاں تھی؟ وہ پہاڑ کے نیچے اتر چکے تھے اور دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ نہیں سکتے تھے۔ بس جتنے نیچے اترے تھے، مارے گئے۔ (۱۰۷)

جو سکھ فوجی اب تک پہاڑی پر تھے، وہ لگاتار گولیاں چلا رہے تھے، لیکن ان کی گولیاں مجاہدین کے ساتھ سکھوں کو بھی زخمی کر رہی تھیں۔ ایک مجاہد میاں عبدالقیوم کہتے ہیں کہ جب حملہ آور سکھ مجاہدین سے پندرہ، بیس قدم پر آ پہنچے تو بندوقچیوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے کے ساتھ ان پر باڑھ ماری، دوسری باڑھ ان پر فوراً ہی قرابین برداروں نے ماری۔ ان گولیوں سے سکھوں کی ایک بڑی تعداد جو زد پر تھی، قتل یا زخمی ہو گئی۔ جو بچے وہ غیر منظم طریقے سے پیچھے ہٹے۔ مجاہدین نے اس

(۱۰۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۵۱-۸۵۲، بحوالہ تواریخ ہزارہ بہ عہد سرکار دولت مدار، از مہتاب سنگھ۔

(۱۰۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۷۳، بحوالہ منظورہ۔

صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا تعاقب کیا اور ان میں سے بہت سے سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ (۱۰۸) ایک دوسرے مجاہد محمد امیر خان قصوری بیان کرتے ہیں: "سید صاحبؒ کے حملے نے بقیۃ السیف سکھوں کو پہاڑ کی جڑ میں پہنچا دیا تھا۔ وہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ غازی ان کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچتے اور تلواریں مار مار کر ختم کرتے جاتے۔" (۱۰۹) مہتاب سنگھ لکھتے ہیں:

سکھ اوا لاً پسپا ہو گئے۔ آخر کنور شیر سنگھ نے خود تلوار میان سے نکالی اور آگے بڑھا۔ مہان سنگھ اسے روکتا تھا کہ تنہا آگے جانا مناسب نہیں۔ کنور سنگھ اس وقت کچھ نہیں سنتا تھا اور ننگی تلوار ہاتھ میں لئے دس، بارہ قدم آگے بڑھ گیا۔ جو سکھ مقابلے سے واپس آ رہے تھے، انہیں پتھر مار مار کر اور گالیاں دے دے کر ٹھہراتا تھا۔ (۱۱۰)

شیر سنگھ نے فوراً اپنے خاص کمانڈر شام سنگھ، پرتاپ سنگھ اور عطر سنگھ کلیان والے کو مجاہدین پر گولیاں برسانے کا حکم بھیجا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی، لیکن میدان میں چونکہ سکھ اور مجاہدین ملے جلے تھے، ان کی گولیاں سکھوں کو بھی گھائل کر رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مٹی کوٹ کی پہاڑی کے دامن میں گھمسان دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ سید صاحبؒ بھی وہیں تھے اور مجاہدین کی سب سے آگے کی صف میں تھے۔ (۱۱۱)

اس وقت جب مجاہدین سکھوں پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور میدان جنگ میں ان کا غلبہ تھا، اچانک ایک ایسی بات غیر متوقع طور پر سامنے آ گئی جس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ جنگ جاری تھی کہ مجاہدین نے محسوس کیا کہ نہ تو وہ سید صاحبؒ کو دیکھ پا رہے ہیں اور نہ ہی ان کا علم میدان میں کہیں نظر آ رہا ہے۔ ایک مجاہد محمد امیر خان قصوری بیان کرتے ہیں:

لڑتے لڑتے ہم لوگوں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو نہ امیر المومنین کا نشان نظر آیا، نہ آپ دکھائی دئے۔ (۱۱۲)

اس بات سے مجاہدین بہت مضطرب ہو گئے اور حالت اضطراب میں ایک دوسرے سے سید صاحبؒ کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ جب انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ سید صاحبؒ کہیں میدان جنگ میں زخمی ہو کر گر گئے ہوں گے یا شہید ہو گئے ہونگے، تو وہ بے چین ہو کر اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے اور دیوانہ وار انہیں تلاش کرنے لگے۔ الٰہی بخش رام پوری بیان کرتے ہیں کہ میدان جنگ

---

(۱۰۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲،۷۷، بحوالہ منظورہ۔ (۱۰۹) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳،۷۷، بحوالہ منظورہ۔

(۱۱۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴،۸۵۳، بحوالہ تواریخ ہزارہ، از مہتاب سنگھ۔

(۱۱۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۷۰، بحوالہ وقائع احمدی۔ (۱۱۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۷۷، بحوالہ وقائع احمدی۔

میں حافظ عبداللطیف نانوتوی روتے ہوئے ان کے پاس آئے اور پوچھا: ''امیر المومنین کہاں ہیں؟'' جب انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو حافظ عبداللطیف روتے ہوئے ست بنّا کے نالے کی طرف چلے گئے۔ امیر الدین بڈھانوی نے بتایا کہ جب وہ جنگ میں مشغول تھے تو اَملیا کے حافظ عبداللہ ان کے پاس سید صاحبؒ کو پوچھتے ہوئے آئے اور جب انہوں نے لاعلمی ظاہر کی تو وہ روتے ہوئے پیچھے کے مورچوں کی طرف چلے گئے۔ نجم الدین شکارپوری کہتے ہیں کہ جنگ کے درمیان مرزا احمد بیگ پنجابی انتہائی پریشان ان کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: ''امیر المومنین کہاں ہیں؟''۔ (۱۱۳)

شروع میں مجاہدین کا خیال تھا کہ سید صاحبؒ مٹی کوٹ کے نالے والے مورچہ میں ہیں جہاں گھمسان جنگ ہو رہی تھی۔ شیر محمد خان رام پوری نے شیخ وزیر پھلتی سے پوچھا: ''حضرت کا حال معلوم ہے، کہاں ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''میں نے نہیں دیکھا لیکن لوگوں سے سنا ہے کہیں اس نالے میں ہیں۔'' شیخ حفیظ اللہ دیوبندی نے مولانا شاہ اسماعیل کو سکھوں پر گولیاں چلاتے دیکھا اور دور سے ہی پکار کر پوچھا: ''مولانا صاحب! حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟'' مولانا نے جواب دیا: ''شور نہ کرو، سکھ سنتے ہیں۔ حضرت آگے نالے میں ہیں۔'' (۱۱۴)

مجاہدین کی صفوں میں اس انتشار نے سکھوں کو سنبھلنے کا موقعہ دے دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو منظم کیا اور دوبارہ سنبھل کر مجاہدین پر حملہ کیا۔ مجاہدین کے لئے جنگ پر دھیان مرکوز رکھنا ناممکن تھا۔ انہیں یہ اندیشہ بے چین کئے ہوئے تھا کہ ان کا محبوب قائد جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا، میدان جنگ میں کہیں زخمی یا شہید گرا ہوا ہوگا۔ وہ دیوانہ وار میدان جنگ میں سید صاحبؒ کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ اس بات نے انہیں سکھوں کا آسان نشانہ بنا دیا۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> دوران جنگ میں سید صاحبؒ کی گم شدگی کا سن کر جاں نثار ارادت مندوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بے قرار ہو کر آپ کی تلاش میں سو بہ سو پھرنے لگے۔ سکھوں کی گولیاں، جو شربت شہادت سے لبریز تھیں، کھا کھا کر رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچتے رہے۔ (۱۱۵)

میاں عبدالقیوم بیان کرتے ہیں کہ جب سکھوں نے سنبھل کر دوبارہ حملہ کیا تو مجاہدین کی ایک مختصر جماعت میدان میں ان کے مقابلے میں ٹھہری رہی۔ باقی مجاہدین سید صاحبؒ کی تلاش میں پریشان پھرنے لگے۔ جب انہوں نے سید صاحبؒ کو اس چٹان کے پیچھے نہیں پایا جہاں انہیں

(۱۱۳) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۷۶۔۷۸۳، بحوالہ وقائع احمدی۔

(۱۱۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۸۱۔۷۸۲۔ تفصیلات کے لئے مزید دیکھئے ۷۷۶۔۷۸۶۔

(۱۱۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۷۸۳، بحوالہ منظورہ۔

دیکھا گیا تھا تو وہ پورے میدان جنگ میں سراسیمہ پھرنے لگے۔ سکھوں کی گولیاں برس رہی تھیں جن سے وہ بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ (۱۱۶)

سید صاحبؒ کی شہادت

جیسا کہ بعد میں سامنے آنے والے حقائق سے پتہ چلتا ہے، سید صاحبؒ نے سکھوں پر حملہ کیا اور مٹی کوٹ کے دامن میں ہلّہ کر کے پہنچ گئے۔ وہاں پر ایک نالا تھا اور پسپائی کے بعد وہیں سے سکھ واپس مٹی کوٹ کی پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لعل محمد جگدیش پوری کا بیان ہے کہ ''حضرت علیہ الرحمۃ نالے میں پہنچے جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار، بندوق جانبین سے چلنے لگیں۔'' حافظ وجیہ الدین باغپتی کہتے ہیں کہ انہوں نے سید صاحبؒ کو نالے میں سکھوں سے لڑتے دیکھا۔ جب سید صاحبؒ نے فائر کرنے کے لئے بندوق اپنے شانے سے لگائی تو حافظ وجیہ الدین نے ان کی انگلی پر خون کا نشان دیکھا اور سمجھ لیا کہ وہ زخمی ہو گئے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوا کہ گولی شاید آپ کے مونڈھے میں لگی ہے۔ بعض دیگر مجاہدین کی روایت ہے کہ سید صاحبؒ سر میں ایک پتھر کی چوٹ سے زخمی ہو گئے تھے۔ بابا بہرام خان تنولی کی روایت ہے:

> غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامن کوہ تک میدان صاف کر دیا۔۔۔۔سید صاحبؒ دامن کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ پھر دیکھا تو سید صاحبؒ پتھر پر نہ تھے۔ سب ساتھی بھی شہید ہو گئے، مگر میں نے اپنی آنکھ سے انہیں گرتے نہ دیکھا اور نہ ہی ان کی نعش دیکھی۔ نہ ساتھیوں میں سے کسی نے آپ کو گرتے ہوئے یا بے جان پڑے ہوئے دیکھا۔ (۱۱۷)

چونکہ سید صاحبؒ کو کسی نے زخم کھا کر گرتے ہوئے نہیں دیکھا (ان کے سارے رفقاء بھی یک بارگی ان کے ساتھ شہید ہو گئے تھے اور ان میں کوئی بھی اس واقعہ کو بیان کرنے کے لئے زندہ نہ بچا)، مجاہدین انہیں میدان جنگ میں تلاش کرتے پھرے اور اس حالت میں بہت سے مجاہدین سکھوں کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ جیسے عالم اور مدبّر سپہ سالار کی بھی یہی حالت تھی۔ لعل محمد جگدیش پوری بیان کرتے ہیں کہ مولانا شاہ اسماعیلؒ ان کی طرف آئے۔ اس وقت ایک رائفل ان کے کندھے سے لٹک رہی تھی اور ایک ننگی تلوار ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کی پیشانی خون آلود تھی۔ انہوں نے لعل محمد سے پوچھا: ''امیر المومنین کہاں ہیں؟'' لعل محمد نے اپنے داہنے

---

(۱۱۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۱۔۷۸۳۔ (۱۱۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۱۔۷۸۳۔

ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ سن کر مولانا اس طرف یہ کہتے ہوئے چلے گئے: ''بھائی! میں تو وہیں جاتا ہوں۔'' (۱۱۸)

اچانک مجاہدین میں یہ خبر پھیل گئی کہ سید صاحبؒ زخمی ہو گئے ہیں اور انہیں کچھ بھی خواہ مقامی گوجروں نے میدان جنگ سے نکال لیا ہے اور پہاڑوں میں لے گئے ہیں۔ کسی شخص نے بہ آواز بلند مجاہدین کو پکار کر کہا کہ وہ میدان جنگ سے نکل کر اوپر پہاڑوں پر آجائیں جہاں سید صاحبؒ کو زخمی حالت میں لے جایا گیا ہے۔ اس آواز کو سنتے ہی مجاہدین کی ایک بڑی تعداد پہاڑوں کی طرف لپکی اور میدان جنگ میں صرف تھوڑے سے مجاہدین مٹی کوٹ کی پہاڑی کے دامن میں لڑتے ہوئے رہ گئے۔ مجاہدین کی شکست اب سامنے آچکی تھی۔ چند ذمہ دار مجاہدین، جیسے سید جعفر علی نقوی، امان اللہ خان لکھنوی اور شیخ ولی محمد، نے فوراً ایک جگہ جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین کو میدان جنگ سے ہٹا کر بالاکوٹ میں جمع کیا جائے اور وہاں ایک دفاعی مورچہ قائم کیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس فیصلے پر عمل کرتے، سکھوں کا ایک دستہ بالاکوٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ مجاہدین نے سَت بنّا کے نالے میں مورچہ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن سکھ وہاں بھی پہنچ چکے تھے۔ سکھ فوج نے بالاکوٹ میں آگ لگادی۔ مجاہدین کے لئے اب کسی محفوظ مقام کی طرف نکل جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ ایک امید اس وقت بھی ان کا دل تھامے ہوئی تھی کہ سید صاحبؒ جب کسی جگہ محفوظ ہیں تو ان کی قیادت میں وہ دوبارہ دشمنوں سے جنگ کر سکیں گے۔

جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب سکھوں نے وہاں اپنا کنٹرول قائم کر لیا تو شیر سنگھ نے سید صاحبؒ کی شہادت کی تصدیق کرنی چاہی۔ اگر سید صاحبؒ زندہ تھے تو وہ اس فتح کو مکمل نہیں مان سکتا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں کو سید صاحبؒ کی لاش میدان جنگ میں ڈھونڈنے کی ہدایت دی۔ ایک لاش اس کے پاس لائی گئی اور کئی لوگوں نے پہچانا کہ وہ سید صاحبؒ کی لاش ہے۔ ایک شریف انسان کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے شیر سنگھ نے اپنے مقتول دشمن کا احترام کیا، ایک دوشالہ ان

(۱۱۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۹۱-۷۔ مہر نے سید صاحبؒ کی شہادت کی ان تفاصیل کو رد کیا ہے جو بیلیو، دیوان امرناتھ اور مرزا حیرت نے پیش کی ہیں (دیکھئے ۸۴-۷۔ ۸۵-۷، فوٹ نوٹ ۱)۔ مثلاً دیوان امرناتھ نے ظفر نامہ میں لکھا ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی میدان جنگ میں سید صاحبؒ سے پہلے شہید ہوئے، حالانکہ مولانا عبدالحی کا انتقال بہت پہلے خیر میں ہو چکا تھا۔ امرناتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ گھوڑے پر سوار میدان جنگ میں داخل ہوئے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز کی وجہ سے جنگ بالاکوٹ میں کسی نے بھی گھوڑا استعمال نہیں کیا۔

کی لاش مبارک پر ڈال دیا اور دو تھان خاصے کے اور پچیس روپے مسلمانوں کو دئے کہ جس طرح مسلمانوں کا دستور ہے، کفن دے کر اس کو دفن کر دیں۔ اس نے ایک مصور کو سید صاحبؒ کی تصویر بنانے کا بھی حکم دیا تا کہ وہ اسے لاہور لے جا کر رنجیت سنگھ کو دکھا سکے۔ رنجیت سنگھ کو جب وہ تصویر دکھائی گئی تو اس نے سید صاحب کی شبیہ دیکھ کر آفریں کہا اور ستائشی الفاظ کہے۔ دیوان امرناتھ اپنی کتاب ''سفر نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے وہ تصویر دیکھی تھی۔ (۱۱۹)

اس طرح سید صاحبؒ کی جدو جہد کا باب اول اختتام کو پہنچا۔ انہوں نے بالاکوٹ میں جان دی، لیکن وہ شعلہ ایمان جو انہوں نے اپنے رفقاء کے سینے میں فروزاں کر دیا تھا، ان کے خون شہادت سے بھی بجھ نہ سکا۔ مجاہدین نے سید صاحبؒ کی شہادت کے فوراً بعد اپنے آپ کو منظم کیا اور ان کے مقصد حیات اور نصب العین کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے مسلسل ایک صدی سے زیادہ مدت تک احیاء اسلام کے لئے جس طرح قربانی دی وہ تاریخ ملل میں اخلاص، ہمت اور حوصلہ کا ایک نہایت ہی قیمتی باب ہے۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مجاہدین نے ان کے نصب العین کو کس طرح اپنے خون سے سینچا، یہ ایک علیحدہ کتاب کا موضوع ہے۔ اس کتاب میں آئندہ ابواب میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ سید صاحبؒ کی تحریک احیاء اسلام کے اثرات کتنے وسیع اور عمیق تھے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جو آج مسلمانوں کی نگاہ سے اوجھل ہونے لگا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس تحریک سے مسلمانوں کا علمی اور ایمانی رشتہ کٹ گیا تو یہ امت مسلمہ کے لئے ایک عظیم خسارہ ہوگا۔ جیسا کہ غلام رسول مہر نے لکھا ہے:

> سید صاحبؒ کی تحریک کا آخری باب بالاکوٹ کا شہادت زار نہ تھا، بلکہ یہ (تحریک) بدستور قائم و استوار رہی اور اس کے نتائج بڑے ہی دور رس تھے۔ (۱۲۰)

(۱۱۹) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۰۸۔

(۱۲۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۔

بنیادی ارکانِ دین کا احیاء

(سید صاحب) کی تحریک خالص دینی تھی۔ وہ مسلمانوں کو سلطنتیں دلانے کے لئے نہیں،
صرف سچے مسلمان بنانے کے لئے اٹھے تھے۔ سلطنتیں اسلامیت کا ثمرہ تھیں۔

غلام رسول مہر، جماعت مجاہدین

اس باب میں سید صاحبؒ کی تحریک احیاء اسلام کے صرف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی جن کا تعلق اسلام کے بنیادی ارکان سے ہے۔ ان کے ان اصلاحات کا جائزہ جن کا تعلق مسلمانوں کے اخلاقی، سماجی اور سیاسی زندگی سے ہے، آئندہ ابواب میں علیحدہ علیحدہ لیا جائے گا تا کہ اس تحریک کے گہرے اور دیرپا اثرات کا ایک مجموعی خاکہ مرتب طور پر سامنے آسکے۔

ا۔ ایمان

سید صاحبؒ نے اپنی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو اس بات کی انتہائی قوت کے ساتھ دعوت دی کہ وہ توحید وسنت کو فکری اور عملی حیثیت سے مکمل طور پر اپنالیں اور شرک وبدعت سے متاثر ہر فکر وعمل کو یکسر ترک کردیں۔ جیسا کہ اسمتھ (W.C.Smith) نے لکھا ہے: "(سید صاحبؒ) کی تحریک کا آغاز دین میں ہر انحراف کی نکیر کے ساتھ ہوا اور اس میں اسلام کی صحیح اور خالص تعلیمات کی روشنی میں ہر نئے اضافہ وتخفیف سے انکار کیا گیا تا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پیش کیا گیا سادہ اسلام پھر سے سماج میں قائم کیا جاسکے"۔ (۱۴۱)

سید صاحبؒ کا اپنی دعوت میں اسلام کی خالص تعلیمات پر زور اور اس کے وسیع، دیرپا اور

(۱۴۱) ڈبلیو، سی، اسمتھ، موڈرن اسلام ان انڈیا، ۱۱ (انگریزی)۔

دوررس نتائج ایسے ناقابل تردید حقائق تھے کہ بہت سے علماء نے انہیں اس صدی کا مجدد تسلیم کیا۔ مثلاً مولانا کرامت علی جون پوری سید صاحبؒ کو "تیرہویں صدی ہجری کا مجدد" قرار دیتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ اس زمانے میں وہ سارے مسلمانوں کو رشد و ہدایت پر ڈالنے والے تھے۔ (۱۴۲)

سید صاحبؒ کی مثالی شخصیت

سید صاحبؒ کی تعلیمات کی اثر انگیزی کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ خود اپنی زندگی میں انتہائی اہتمام اور اخلاص کے ساتھ قرآن کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر عمل کرتے تھے اور ان سے معمولی سے معمولی انحراف بھی انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ نواب وزیر الدولہ کہتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی ایک اہم خصوصیت ان کا قرآن کا علم اور اس پر پورے اہتمام کے ساتھ عمل تھا۔ (۱۴۳)

ان کی فطرت سلیم اسلام کی سچی تعلیمات سے ذرا بھی انحراف کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا ان کی زندگی کا واحد نصب العین تھا اور ان کی نگاہ میں یہ مقصد جلیل سنت نبوی ﷺ پر پوری ہمت اور اخلاص سے عمل کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ یہی ان کا عقیدہ تھا اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: "میں نے مدۃ العمر آنے جانے، لینے دینے، اٹھنے بیٹھنے، حرکت و سکون، غصہ و بردباری، قہر و مہر، کھانے پینے، پہننے اور سوار ہونے کا کوئی کام نہیں کیا جس میں رضائے الٰہی کی نیت نہ ہو اور کوئی کام میں نے نفس کے تقاضے اور خواہش سے نہیں کیا۔" (۱۴۴)

اس طرح جب سید صاحبؒ "مجسم شریعت اور سراپا اتباع سنت" (۱۴۵) بن کر سامنے آئے تو مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ، مولانا شاہ اسماعیل دہلویؒ اور مولانا محمد یوسف پھلتیؒ جیسے نابغۂ روزگار نے

---

(۱۴۲) کرامت علی، مشکوٰۃ رحمت، بحوالہ ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۸۔۵۲۹۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی انہیں مجدد تسلیم کرتے ہیں (تمہید، عبداللہ عباس ندوی، تذکرہ سید احمد شہیدؒ از محمد حمزہ حسنی، ۱۳۔۱۴)۔ ان کے علاوہ حکیم سید فخر الدین بھی سید صاحبؒ کو اپنی کتاب "مہر جہاں تاب" میں (بحوالہ ندوی، کاروان ایمان و عزیمت، ۱۴۸) اور مولانا سخاوت علی جون پوری بھی اپنی کتاب "نصائح" میں (بحوالہ ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۵) اپنے وقت کا مجدد کہتے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں مجدد وہ شخص کہلاتا ہے جو غیر اسلامی نئی روایات اور طریقوں کی نشاندہی کر کے اسے اسلام سے خارج قرار دے اور اسلام کی صحیح اور خالص تعلیمات کو قائم کرے۔

(۱۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۰۔ (۱۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۱۔

(۱۴۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۳۔

جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے خاندانی تعلق رکھتے تھے اور خود اپنی اپنی حیثیت میں اس وقت علماء ہند کے درمیان آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انہیں اپنا روحانی مربی و راہنما تسلیم کر لیا۔ ان مخلص علماء دین نے بیعت کے بعد اپنے آپ کو سید صاحبؒ کی خدمت کے لئے ایسے وقف کر دیا جیسے غلام بے دام۔ جب سید صاحبؒ چلتے تو یہ بزرگ ان کی پالکی کے پیچھے ننگے پاؤں دوڑتے۔ اس تعظیم و عقیدت کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے علم میں اس زمانے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا جامع نمونہ ہونے کی حیثیت سے سید صاحبؒ کا کوئی ہم سر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقعہ پر سید صاحبؒ نے جب مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ سے کہا کہ اگر وہ ان میں سنت کے خلاف کوئی عمل دیکھیں تو انہیں فوراً متنبہ کر دیں، تو مولانا نے یہ تاریخی جواب دیا: "حضرت میں آپ میں سنت کے خلاف کوئی بات دیکھوں گا تو آپ کے ساتھ ٹھہروں گا کہاں۔" (۱۲۶)

شرک و بدعت کا رد

توحید و سنت سے اس مضبوط تعلق نے سید صاحبؒ کو اس مقام و منصب پر کھڑا کر دیا جہاں شرک و بدعت کے لئے ہرگز کوئی جگہ و گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے ببانگ دہل مسلمانوں کو شریعت مطہرہ کی پاک و صاف تعلیمات کی طرف پورے ایمان و یقین کے ساتھ بلایا اور انہیں شرک و بدعت کے ہر فعل اور رسم و رواج کو یکسر چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ جب لوگ ان کے پاس بیعت کے لئے آتے تھے (اور ایسے لوگوں کا کثرت کی وجہ سے شمار مشکل تھا) تو سید صاحبؒ صرف دو باتوں پر ان سے بیعت لیا کرتے تھے: اول، توحید کو مکمل طور پر اپنانا اور شرک کی ہر بات کو ترک کر دینا، اور دوم، سنت پر پوری ہمت سے عمل کرنا اور بدعت کے ہر عمل کو رد کرنا۔

سید صاحبؒ شرک و بدعت کے خلاف پوری قوت سے سینہ سپر تھے۔ اسی پر ان کا عمل تھا، اسی کی دعوت وہ خود دیتے تھے، اور اسی کے لئے اپنے رفقاء کو تاکید فرماتے تھے۔ وہ شرک و بدعت کو مسلم سماج سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ ایک مسترشد کے نام اپنے ایک خط میں وہ شرک و بدعت کی تعریف بھی بیان کرتے ہیں اور انہیں اس کے مٹانے کے لئے جد و جہد کی ترغیب بھی دیتے ہیں:

ترک اشراک کی تفصیل یہ ہے کہ فرشتوں، جنات، پیر و مرشد، استاد و شاگرد،

---

(۱۲۶) محمد عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ رشید، ۲، ۲۷۴۔

نبی وولی میں سے کسی کو مشکل کشا، دافع بلا اور منافع کے حاصل کرانے پر قادر نہ سمجھے۔ سب کو اللہ کی قدرت اور علم کے سامنے اپنی طرح عاجز و نادان سمجھے اور اپنی ضرورتوں کی طلب میں انبیاء، اولیاء، صلحاء اور ملائکہ میں سے ہرگز ہرگز کسی کی نذر نیاز نہ کرے۔

اور بدعت کے بارے میں وہ اسی والا نامہ میں فرماتے ہیں:

ترک بدعت کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امور معاش و معاد میں خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو پوری قوت اور بلند ہمتی سے پکڑنا چاہئے۔ اور جو آپ کے بعد لوگوں نے بہت سی رسمیں ایجاد کر لی ہیں، مثلاً رسوم شادی وماتم، قبروں کی زیب وآرائش، ان پر عمارتیں بنوانا، شادی کی تقریبات میں فضول خرچی واسراف، تعزیہ سازی وغیرہ، ہرگز ان کو اختیار نہ کیا جائے اور حتی الامکان ان کے ازالے کی کوشش کی جائے۔ اولاً خود ان کو ترک کیا جائے، پھر ہر مسلمان کو اس سے اجتناب کی دعوت دی جائے۔ (۱۲۷)

سید صاحبؒ کی مثالی شخصیت اور ان کی داعیانہ کوششوں نے مسلمانوں میں ایک دینی انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی اصلاحی کوششوں نے زمانے کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ نہایت قدیم اور گھٹی میں پڑی ہوئی غیر اسلامی رسوم کو لوگوں نے یکسر ترک کر دیا اور اسلامی احکامات کو سینے سے لگا لیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''گلی گلی شرک وبدعت کی تحقیق ہونے لگی اور پانچ پانچ سو برس کی رسومات بد جہان سے اٹھنے لگیں۔ اگر اس گروہ کا کوئی ادنی مرید بھی ہے تو اس کو بھی تین چیزیں لازم ہوتی ہیں: شرک سے بھاگنا، نماز کی قید، شرع کی تعظیم''۔ (۱۲۸) مسلمانوں میں دین سے محبت اور اس کے احکام جاننے کا بڑا شوق پیدا ہو گیا: ''شرک وبدعت اور کفر کی رسم اور خلاف شرع کام سے لوگ باز آگئے اور سب کو دین کی تلاش ہوئی اور دینی کتابیں جو نادر و کمیاب تھیں، سو شہر گاؤں میں ہر کہیں گھر گھر پھیل گئیں۔'' (۱۲۹)

احیاء ایمان کا وسیع دائرہ

سید صاحبؒ نے توحید وسنت کی بحالی اور شرک وبدعت کی پامالی کے لئے جو کوشش بلیغ فرمائی اور اسے بارگاہ الٰہی میں جو شرف قبولیت حاصل ہوئی، اس کے اثرات انتہائی حیرت انگیز اور

(۱۲۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۳، ۵۳۴۔ (۱۲۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۸۔
(۱۲۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۹، بحوالہ مکاشفات رحمت از مولانا کرامت علی جونپوری۔

غیر معمولی تھے۔ ماضی قریب کے ایک ممتاز و معروف عالم دین نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں:

> خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے ـــــ ایک دنیا آپ کے قلبی اور جسمانی توجہ سے درجہ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کردیا اور کتاب و سنت کے شاہراہ پر ڈال دیا۔ (۱۳۰)

سید صاحبؒ کی تحریک کے اثرات زمان و مکان کے حدود و قیود سے بالاتر تھے۔ ان کی جدوجہد کے اثرات کسی ایک مخصوص طبقہ تک محدود نہیں رہے۔ عوام و خواص، امیر و غریب، تاجر و کاشتکار، مرد و عورت، جوان و عمر رسیدہ ـــــ سماج کے ہر طبقے نے ان کی دعوت و تبلیغ سے بھر پور حصہ پایا۔ ان کی سعیٔ جمیلہ کے اثرات خود ان کے زمانہ تک بھی محدود نہیں رہے۔ نواب صدیق حسن خان کے مطابق "ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں۔" (۱۳۱) اسی طرح ان کی تحریک کے اثرات ہندوستان میں ہر دور و نزدیک مقام تک پہنچے، حتیٰ کہ ان سے ہندوستان سے باہر بیرونی ممالک نے بھی فیض حاصل کیا۔ یہ وسعت اور ہمہ گیری اس تحریک کی ایک غیر معمولی صفت اور پہچان ہے اور اس کی تفصیلات آئندہ اس کتاب میں مناسب مقامات پر سامنے آئیں گی۔

سید صاحبؒ کے رفقاء کو توحید و سنت سے جو عشق تھا، اس کتاب کے محدود صفحات میں اس کی منتخب مثالیں پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف دو مثالیں دی جاتی ہیں، جن میں سے ایک مرد کے طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری عورت کے طبقہ کی۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ سید صاحبؒ کے زیر اثر مسلمانوں کے دل میں اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات کس قدر راسخ ہوگئی تھیں۔

سید قطب علی نے، جو سید جعفر علی نقوی کے والد بزرگوار اور سید صاحبؒ کے خلیفہ تھے، اپنے انتقال سے صرف چند گھنٹے پہلے اپنی وصیت لکھی جس میں انہوں نے اپنے متعلقین کو یہ ہدایات دیں: (۱) توحید پر قائم رہو اور سنت کا اتباع کبھی نہ چھوڑو۔ (۲) میرے بعد کسی بدعت کا ارتکاب نہ ہونے پائے ورنہ قیامت کے دن تم سے مواخذہ کروں گا۔ (۳) میرے مرنے پر نوحہ نہ کیا جائے، نہ سوم یا کوئی دوسری رسم منائی جائے۔ (۱۳۲)

(۱۳۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۱، بحوالہ تقصار جیود الاحرار۔
(۱۳۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۱۔ (۱۳۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۹۲۔

نواب خان بہادر تہور جنگ کی صاحبزادی کی شادی نواب ارکاٹ سے ہوئی تھی۔ سید صاحبؒ کی تحریک احیاء اسلام سے متاثر ہو کر اس نیک طینت خاتون نے سارے غیر شرعی افعال سے توبہ کر لی تھی۔ جب ان کے شوہر نواب ارکاٹ نے ان پر بعض مروجہ غیر شرعی رسوم پر عمل کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تو ان کا جواب تھا: "میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے ہر فرمان کو ماننے کے لئے ہمہ تن تیار ہوں، لیکن قبر اور آخرت کے معاملات سب کے الگ الگ ہیں۔ میں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مرتکب نہیں ہو سکتی"۔ (۱۴۳)

اس طرح پورے سماج میں، جو شرک و بدعت کے رسوم و خرافات کے شکنجے میں بری طرح جکڑا ہوا تھا، سید صاحبؒ کی کوششوں سے توحید و سنت کا نور پوری طرح پھیل گیا اور شریعت مطہرہ کا اعتبار پوری شان سے پھر قائم ہو گیا۔

۴۔ نماز

سید صاحبؒ نے احیاء اسلام کے لئے جدوجہد کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب مسلمانوں میں سیاسی حالات اور سماجی اثرات کی وجہ سے دین سے اس قدر بُعد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہر اس چیز کو بیزاری اور تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے جس کا تعلق اسلام سے تھا۔ حتیٰ کہ نماز و روزہ جیسے بنیادی ارکان سے جن کے بغیر اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا، عمومی سطح پر بیزاری کا کھلے طور پر اظہار کیا جاتا تھا۔ حیدر علی رامپوری کے بیان کے مطابق ایسے لوگ برملا کہتے تھے کہ "نماز کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کا حکم نہیں اور نہ روزہ کونسل (برٹش کونسل) کا آئین"۔ زکوٰۃ و حج کا پھر کیا ذکر۔ (۱۴۴)

نماز سے غفلت و بیزاری

اس زمانے میں عام مسلمانوں میں نماز سے کس قدر بیزاری پیدا ہو چکی تھی، اس کا ذکر دکھ اور شرمندگی کے ساتھ استعجاب کا بھی سبب ہے۔ یقین کرنا مشکل ہے کہ صرف دو صدی پہلے مسلمانان ہند بے دینی کے اتنے گہرے قعر مذلت میں گر چکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی عمومی دینی حالت ایسی ہی ابتر تھی۔ چند مثالیں اس صورت حال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گی۔ ان دنوں جونپور جیسے مسلم آبادی والے شہر میں دن میں مسجدوں میں اذان نہیں ہوتی تھی۔ وہاں صرف فجر اور

(۱۴۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۸۳۔

(۱۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۴۰، بحوالہ صیانۃ الناس عن وساوس الخناس۔

مغرب کی اذان دی جاتی تھی اور وہ بھی اس لئے کہ صبح اور شام ہونے کا لوگوں کو اندازہ ہو جائے۔ جونپور کی عظیم الشان جامع مسجد تک میں نہ روزانہ جماعت ہوتی تھی اور نہ جمعہ کی نماز۔ اس کا استعمال ایک کمیونیٹی سینٹر کی حیثیت سے ہوتا تھا یا تعزیہ سازی کے لئے۔ جب سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا کرامت علی جونپوری نے وہاں پانچ وقت کی نماز قائم کرنے کی کوشش کی تو ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہر نماز کے وقت خود وہاں اذان دیں اور جماعت قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی یہ کوشش مقامی مسلمانوں کو کتنی ناپسند ہوئی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن جب وہ اندھیرے میں صبح کی نماز کے لئے مسجد جا رہے تھے تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ (۱۳۵)

سید صاحبؒ کے ایک مرید شیخ حسن علی کی کہانی بھی مسلمانوں کی افسوسناک جہالت کی تصویر پیش کرتی ہے۔ وہ الہ آباد کے قریب کیا نامی ایک مقام کے رہنے والے تھے۔ اس وقت وہ پورا علاقہ جہالت اور دین سے لاتعلقی کے اندھیرے میں تھا۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ اس علاقے میں "روزہ دار اور پابند نماز عنقا کا حکم رکھتا تھا اور زکوۃ وحج کی سعادت تو کیمیا کی طرح نایاب تھی"۔ جب شیخ حسن علی نے لوگوں کو شرک وبدعت سے روکا اور ارکان دین کی طرف متوجہ کیا تو لوگوں نے "آپ کو دیوانہ مشہور کر کے ہتھکڑیوں بیڑیوں میں جکڑ دیا"۔ (۱۳۶)

مولانا کرامت علی جونپوریؒ، جنہوں نے بنگال میں احیاء اسلام کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، بنگال کے اس وقت کے مسلمانوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ نہ صورت وشکل سے بہ حیثیت مسلمان پہچانے جاتے تھے اور نہ لباس سے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عام مسلمان نماز روزے اور حج اور زکوۃ اور قربانی اور صدقہ فطر ادا کرنے سے مطلق غافل تھے اور جمعہ اور جماعت اور عیدین کو مطلق چھوڑ دیا تھا، یہاں تک کہ بعض لوگ بڈھے ہو گئے تھے، ان کو وضو بھی نہ آتا تھا"۔ وہ آگے لکھتے ہیں: "حافظ لوگ یکبارگی نایاب ہو گئے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں تراویح کا ختم میسر نہ ہوتا تھا اور نماز کی عظمت لوگوں کے جی سے جاتی رہی تھی، یہاں تک کہ بے نمازی کو لوگ برا نہ جانتے تھے"۔ (۱۳۷)

---

(۱۳۵) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۱۳-۱۱۴۔ ایک دن ایک مقامی خاتون نے مولانا کرامت علی جونپوریؒ کو گلی سے گزرتے ہوئے دیکھ کر پہچانا اور یہ کہتے ہوئے ان پر اپنے گندے برتن پھینکے کہ یہی وہ نیا مولوی ہے جس نے دن میں بھی اذان دینے کا نیا طریقہ شروع کیا ہے۔ (مجیب اللہ ندوی، تذکرہ حضرت مولانا کرامت علی جونپوری، ۳۶)۔

(۱۳۶) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۹۳۔ (۱۳۷) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۱۵-۱۱۶۔

نماز کا قیام

سید صاحبؒ کی تحریک احیاء اسلام میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت نماز کو حاصل تھی۔ نماز کا اہتمام اور وقت پر خشوع وخضوع کے ساتھ اس کی ادائیگی سید صاحبؒ کے رفقاء کی پہچان بن گئی تھی۔ خواہ گوالیار کے مہاراجہ سندھیا کا محل ہو یا کلکتہ میں ہگلی ندی کا کنارہ، راجستھان کا ریگستان ہو یا درۂ خیبر کی پہاڑی رہگزر، مسجد کا صحن ہو یا جنگ کا میدان ___ جہاں کہیں بھی نماز کا وقت آیا، سید صاحبؒ اور مجاہدین نے وہیں صفیں آراستہ کیں اور فریضۂ نماز ادا کیا۔ خواہ ان اللہ والوں پر فاقہ ہو یا رزق کی وسعت، حالت خوف ہو یا موقعۂ امید، شکست سے دوچار ہونا پڑ رہا ہو یا فتح کی مسرت حاصل ہوئی ہو، قید و بند کی آزمائش ہو یا آزادی کی فرحت ___ ان کی جبیں نماز میں سجدہ ریز ہونے کی سعادت سے ہمیشہ خوش بخت رہی۔ ان کے دل کو چین وسکون حاصل ہوتا تھا تو نماز سے اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی تو نماز میں۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔

سفر حج میں جب سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء جہاز پر سوار ہونے کے لئے کلکتہ بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ چنانچہ پورا کاروان جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھا، ایک بڑے میدان میں رک گیا۔ لوگوں نے ندی میں وضو کیا، اذان دی گئی اور نمازیوں نے صفیں درست کر لیں۔ ہر صف حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ سید صاحبؒ آگے بڑھے اور امامت کی۔ چونکہ مجمع بہت زیادہ تھا، سینکڑوں مکبر تکبیر کہہ رہے تھے۔ (۱۳۸)

سرحد کو ہجرت کرتے ہوئے جب سید صاحبؒ گوالیار پہنچے تو گوالیار کے حاکم مہاراجہ دولت راؤ سندھیا نے ان کی اور ان کے رفقاء کی اپنے محل میں دعوت کی۔ وہ محل ہی میں تھے کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ شیخ باقر علیؒ نے جو اسلامی لشکر کے مؤذن تھے، بہ آواز بلند اذان کہی۔ چونکہ مہاراجہ کے محل میں پہلی بار صدائے اذان بلند کی گئی تھی، اس لئے وہاں کام کرنے والے اپنا کام چھوڑ کر انہیں نماز پڑھتے دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ خواتین بھی انہیں چھت پر سے نماز پڑھتے دیکھنے لگیں۔ اذان کی آواز سنتے ہی وزیر اعظم راجہ ہندو راؤ کے حکم سے ملازمین وضو کے لئے پانی لے کر حاضر ہوئے۔ مجاہدین نے وضو کیا، جانماز جو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، بچھائی، صفیں قائم کیں اور سید صاحبؒ کی امامت میں نماز عصر ادا کی۔ (۱۳۹)

---

(۱۳۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۴۳، ۸، بحوالہ وصایہ، حصہ اول۔

(۱۳۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۴۳۸۔

سرحد میں ایک بار جب مجاہدین بالاکوٹ جارہے تھے تو انہیں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ راستہ سنگلاخ تھا، سخت برف باری ہو رہی تھی اور تیز ہوا کی وجہ سے سردی اتنی شدید ہو گئی تھی کہ لوگ اپنی زندگی سے ناامید ہو گئے۔ لیکن جب نمازِ عصر کا وقت ہوا تو لوگوں نے فوراً نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا: ''عصر اخیر کو برف برسنی موقوف ہوئی اور آفتاب نظر آیا۔ اسی وقت لوگوں نے جلدی جلدی اسی برف سے وضو کر کے جس نے جہاں موقعہ پایا وہیں نماز پڑھی۔ کسی نے اکیلے، کسی نے جماعت سے، کسی نے پہاڑ کی چوٹی پر مغرب کی نماز پڑھی، کسی نے درے میں'' مجاہدین بے دم ہو کر برف میں گر گئے۔ مقامی گوجروں نے ان کی جان بچائی۔ لیکن اس حال میں بھی ان سے نماز نہیں چھوٹی۔ (۱۴۰)

پھولڑا کی فتح کے بعد مجاہدین پر جو کھلے میدان میں خیمہ زن تھے، سکھوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ حملہ کے وقت مجاہدین صبح کی نماز کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے شارع عام کی جانب سے بندوق چلنے کی آواز سنی اور سمجھ گئے کہ سکھوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اس صورت حال میں مجاہدین کا فطری ردِعمل تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی حفاظت کی فکر کرتے، ہتھیار سنبھالتے اور سکھوں کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے ابھی فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ انہوں نے ''جلدی جلدی تنہا تنہا یا دو دو چار نے (جماعت سے) نماز فرض ادا کی اور اپنے ہتھیار سنبھال کر دشمنوں کی طرف دوڑے۔'' (۱۴۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برٹش گورنر جنرل نے آگرہ میں جمعہ کے دن ایک دربار منعقد کیا جس میں شرکت کرنے کے لئے نواب وزیر الدولہ کو بھی دعوت دی گئی جو سید صاحبؒ کے مرید خاص تھے۔ چونکہ دربار کا وقت جمعہ کی نماز کے وقت سے ٹکراتا تھا، اس لئے نواب وزیر الدولہ نے اس میں شرکت سے انکار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نواب رامپور یوسف علی خان اور نواب بھوپال سکندر بیگم نے انہیں اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ چونکہ نواب وزیر الدولہ پر برٹش سرکار کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے ہمدردی رکھنے کا الزام ہے، اس لئے ان کا دربار سے غیر حاضر رہنا شکوک پیدا کر سکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ نواب وزیر الدولہ مسافر ہیں اور مسافر پر جمعہ کی نماز فرض نہیں۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کی بہی خواہی کی قدر کی، لیکن ان کا فیصلہ تھا کہ وہ ایک دنیاوی حاکم کے دربار میں حاضری کے لئے رب کائنات کی بارگاہ سے غیر حاضر نہیں

---

(۱۴۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۳۸۸۔۳۸۹۔

(۱۴۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۳۸۸۔۳۸۹۔

ہو سکتے۔ چنانچہ بلا خوف انہوں نے گورنر جنرل کو اطلاع دے دی کہ وہ دربار میں شرکت سے اس لئے قاصر ہیں کہ اس سے ان کی جمعہ کی نماز چھوٹ جائے گی۔ (۱۴۲)

جب محمد جعفر تھانیسریؒ، جو سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد تحریک سے منسلک ہوئے اور اس کے ایک اہم قائد تھے، برٹش سرکار کے خلاف سازش اور مجاہدین کی امداد کرنے کے الزام میں گرفتار کئے گئے تو انہیں بیڑیوں میں ایک بگھی میں علی گڈھ سے دہلی لے جانے کی ذمہ داری خود دو برٹش پولیس انسپکٹروں نے لی۔ یہ افسران بہت محتاط تھے اور سفر میں کہیں نہیں رکے۔ محمد جعفر خوب سمجھ رہے تھے کہ وہ انتہائی خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں، لیکن نہ تو قید ہو جانے کا غم اور نہ ہی مستقبل میں سزاؤں کا خوف ان کے وقت پر نماز ادا کرنے کے اہتمام کو متاثر کر سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

”جب نماز کا وقت آتا تو میں اجازت کے بغیر ہی تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لیتا تھا۔ گاڑی بدستور رواں رہتی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔“ (۱۴۳)

جب مولانا یحییٰ عظیم آبادی، محمد جعفر تھانیسری اور چند دوسرے قائدینِ تحریک کو برٹش سرکار کے خلاف سازش و بغاوت کے جرم میں قید کر کے عدالت میں پیش کیا گیا تو انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ انہیں پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔ حقیقتاً اس دن عدالت نے ان کے خلاف سزائے موت کا ہی حکم سنایا۔ لیکن جب عدالت میں نماز عصر کا وقت آیا تو سزائے موت کا خوف بھی انہیں نماز کی ادائیگی سے غافل نہ کر سکا۔ انہوں نے جج سے نماز ادا کرنے کی اجازت چاہی۔ جج نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پران مردان خدا نے وہیں تیمم کیا اور بیٹھے بیٹھے اس جج کے سامنے جو ان کے خلاف سزائے موت کے فیصلے کو آخری شکل دے رہا تھا اشارے سے نماز ادا کر لی۔ (۱۴۴)

ایک بار جب محمد جعفر تھانیسری اور چند دوسرے مجاہدین کو ملتان کے قید خانہ سے دوسری جگہ کشتی سے منتقل کیا جا رہا تھا تو ان کے جسم پر اتنی وزنی زنجیریں تھیں کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے نیچے ایک ندی بہ رہی تھی، لیکن ان کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کر وضو کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن جب نماز کا وقت آتا تو وہ لیٹے لیٹے تیمم کرتے اور اشارے سے نماز ادا کر لیتے۔ (۱۴۵)

نماز سے محبت مجاہدین کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی اور ان کے رگ و ریشے میں اس طرح سما گئی تھی کہ بیماری اور پیرانہ سالی کی غفلت بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو پاتی تھی۔ تحریک کے ایک بڑے

---

(۱۴۲) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۲۸۔۱۲۹۔
(۱۴۳) محمد جعفر تھانیسری، کالا پانی، ۵۳۔
(۱۴۴) تھانیسری، کالا پانی، ۶۱۔۶۲۔
(۱۴۵) تھانیسری، کالا پانی، ۸۵۔

قائد مولانا احمد اللہ عظیم آبادیؒ نے جزائر انڈمان میں جہاں انگریزوں نے انہیں قید کر رکھا تھا، داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ غلام رسول مہر ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''غشی کی حالت میں بھی ذکر اللہ جاری رہتا۔ نماز کا اس قدر خیال تھا گویا ہر وقت تحریمہ بندھا رہتا اور نماز پڑھا کرتے۔''(۱۴۶)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے والد مولانا سید عبدالحیؒ نے محمد حسین نامی ایک مجاہد سے ملاقات کی تھی جنہوں نے سید صاحبؒ کے دست مبارک پر براہ راست بیعت کی تھی اور سرحد کی جنگوں میں شریک رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک سو دس (۱۱۰) برس کے ہو چکے تھے اور پیرانہ سالی کی وجہ سے شدید نسیان کا شکار تھے۔ وہ ہر بات فوراً بھول جاتے تھے، لیکن یہ غفلت ان کی نماز کو متاثر نہیں کر سکی تھی۔ مولانا عبدالحیؒ نے رات کو ان کے قریب ہی سونے کا اہتمام کیا۔ جب وہ اخیر شب میں بیدار ہوئے تو دیکھا کہ محمد حسین تہجد پڑھ رہے ہیں۔ محمد حسین رات کی تاریکی میں چپکے سے اٹھتے اور فجر کی نماز کے لئے خود مسجد چلے جاتے۔(۱۴۷) مولانا عمادالدین نے جن کی روحانی بلندیٔ مرتبہ کا ذکر نواب وزیرالدولہ نے اپنی کتاب ''وصایۃ الوزیر'' میں خاص طور پر کیا ہے، سید صاحبؒ سے بیعت کی، لیکن اس روحانی تعلق کا ان پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ بیعت کے فوراً بعد بے ہوش ہو گئے اور مسلسل تین دنوں تک ان پر غفلت طاری رہی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ نماز کے وقت پر پوری طرح ہوش میں آجاتے اور نماز ادا کرتے۔(۱۴۸)

نماز کا اہتمام عورتوں میں بھی پوری قوت و شان سے زندہ ہو گیا تھا۔ مولانا کرامت علی جونپوریؒ لکھتے ہیں: ''اور آگے ہندوستان کے پیرزادوں اور مولویوں سے لے کر عوام تک کی عورتوں میں نماز کا چرچا بھی نہ تھا اور اب ہر قوم کی عورت مرد نماز میں بالکل مستعد ہو گئے ہیں۔''(۱۴۹) سید صاحب کی دوسری اہلیہ سیدہ ولیہ ''یکایک بیمار ہوئیں اور ایک رات اور دن بیمار رہ کر کلمۂ حق پڑھتی ہوئی آدھی رات کے وقت جاں بحق ہوئیں۔ بیماری میں بھی نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جب وقت معلوم ہوتا، تکیے پر تیمم کر کے نیت باندھ لیتیں۔''(۱۵۰) حج کے سفر میں جب سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہے تھے تو لٹیرے بدوؤں نے قافلہ پر حملہ کر دیا۔ حجاج مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔ ''بدو پہلی بار پسپا ہوئے۔ اتنی دیر میں قافلے کی عوتوں

---

(۱۴۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۹۔
(۱۴۷) ندوی، کاروان ایمان و عزیمت، ۱۲۰۔۱۲۱۔
(۱۴۸) ندوی، کاروان ایمان و عزیمت، ۸۴۔
(۱۴۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۹۔
(۱۵۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۲۳۔

نے نماز سے فرصت کر لی۔ اس کے بعد مردوں نے نماز پڑھی۔"(۱۵۱) اس زمانے میں دین دار گھرانے کی خواتین بھی سفر میں نماز نہیں پڑھتی تھیں۔ غیر محرم مردوں کے سامنے نماز ادا کرنا بے شرمی کی بات سمجھی جانے لگی تھی۔ سید صاحبؒ کی تعلیمات کی وجہ سے یہ غیر اسلامی رواج ختم ہو گیا۔ سید صاحبؒ کے حج کے مشہور سفر کے درمیان مولانا عبدالحئی کی اہلیہ نے سارے حجاج کی موجودگی میں کشتی سے اتر کر فرض نماز ادا کی۔ دوسرے حجاج نے بھی اس نیک عمل کو مستحسن نگاہوں سے دیکھا اور اپنی خواتین کو ترغیب دے کر ان سے نماز پڑھوائی۔ (۱۵۲)

سید صاحبؒ کے خلفاء نے بھی اپنی دعوت میں نماز کو اسی طرح اہمیت دی۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی اپنے حلقۂ تعلیم میں مسلمانوں کو نماز میں پڑھی جانے والی سورتوں کو معنی کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے کے لئے تیار کرتے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "ان پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور دعاؤں کے معنی اور مطالب سے خوب آگاہ ہو گئے۔"(۱۵۳) عام مسلمانوں میں بھی وہ شوق و اہتمام پیدا ہو گیا جو ایک طویل عرصے سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ جیسا کہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی لکھتے ہیں: "اس گروہ کے سبب ایک عالم نمازی ہوا، بلکہ اس گروہ کو دیکھ کر گمراہ کرنے والے [پیر] بھی اپنے معتقد کو نماز کی تقلید کرنے لگے کہ ہمارے لوگ کہیں ہم سے پھر نہ جائیں"۔ مولانا کرامت علی جونپوری بھی لکھتے ہیں: "اس ملک کے مردوں، عورتوں میں نماز روزہ خوب جاری ہو گیا۔۔۔ پرانی مسجدیں آباد ہو گئیں اور نئی مسجدیں بننے لگیں۔"(۱۵۴)

نماز میں خشوع و خضوع

سید صاحبؒ نے اپنے رفقاء اور مریدین میں نماز کی جو غیر معمولی محبت پیدا کر دی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خود ان کا سینہ اس ذوق و محبت سے سرشار تھا۔ سید جعفر بھی اس کی شہادت دیتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی ایک اہم خصوصیت ان کی نماز کا خشوع و خضوع تھا جس کے نتیجے کے طور پر "ان کے پیچھے نماز ادا کرنے والے مقتدیوں کے دل میں محبت و رغبت طاری ہو جاتی تھی۔"(۱۵۵) ایک بار سفر حج میں جب جہاز مکہ معظمہ کی طرف رواں دواں تھا، سید صاحبؒ کی امامت میں نماز کی

(۱۵۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۶۲۔ (۱۵۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۳۔

(۱۵۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۱۸، ۲۱۹۔

(۱۵۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۵۲۸، بحوالہ رسالۂ دعوت و مکاشفات رحمت۔

(۱۵۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۶۔

کیفیت ان کے ایک رفیق سفر اس طرح بیان کرتے ہیں: ''ظہر کا وقت ہوا، اذان ہوئی، آپ نماز کو تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔ اس نماز میں ایسی برکت اور تاثیر تھی کہ ہر ایک کے اوپر ایک حال سا واقع تھا کہ اس کی لذت زبان سے بیان نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص کی طبیعت متوجہ الی اللہ تھی۔'' (۱۵۶)

مولانا شاہ اسماعیلؒ جو سید صاحبؒ کے سب سے قریبی رفیق تھے، اس بات کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے تھے کہ انہیں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت عطا کی گئی ہے۔ وہ کہتے تھے: ''مجھے نماز میں غفلت نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً متنبہ فرما دیتا ہے''۔ اپنی زندگی کے آخری رمضان میں وہ اتنا بیمار ہوگئے کہ تراویح میں شرکت نہیں فرما سکتے تھے۔ ایک دن انہوں نے شرکت فرمائی اور چار رکعتیں خود پڑھائیں جن میں سورہ اسراء پڑھی۔ مولانا جعفر علی کہتے ہیں کہ ''جو لذت اس نماز میں آئی، وہ نہ اس سے پہلے کبھی آئی تھی، نہ اس کے بعد کبھی آئی''۔ (۱۵۷)

سید صاحبؒ کی شخصیت کا یہ غیر معمولی اثر حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ کے واقعۂ بیعت میں بہت کھل کر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی بہت مشہور روحانی شخصیت تھے اور ان سے روحانی استفادہ کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جب وہ سید صاحبؒ سے ملے تو نہ صرف خود ان سے بیعت ہوگئے بلکہ اپنے سارے مریدوں کو بھی ان کے دست بابرکت پر بیعت کر لینے کی تلقین کی۔ ایک بار جب ان سے دریافت کیا گیا کہ خود مرجع خاص وعام ہونے کے باوجود انہوں نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر کیوں بیعت کر لی تو ان کا تاریخی جواب تھا: ''یہ سب کچھ ہے، مگر ہم کو نماز پڑھنی اور روزہ رکھنا نہ آتا تھا۔ سید صاحبؒ کی برکت سے نماز پڑھنی بھی آگئی اور روزہ رکھنا بھی آگیا۔'' یقیناً شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نماز کے ظاہری ارکان کی بات نہیں کر رہے تھے، بلکہ ان کا اشارہ ان باطنی کیفیات اور روحانی برکات کی طرف تھا جن کا تجربہ وحصول انہیں سید صاحبؒ سے رشتۂ ارادت قائم کرنے کے بعد ہی ہوا۔ اس تعلق کے بعد ہی انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ تعلق مع اللہ کے کن کن قیمتی درجات تک ابھی ان کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقعہ پر انہوں نے خود فرمایا:

میں نے آپ (سید صاحبؒ) کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپ کا طریقہ دیکھا۔ اس وقت

(۱۵۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۸۔

(۱۵۷) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۳۲۔

اپنے نزدیک مجھ کو خیال ہوا کہ اگر میں مر جاتا تو میری موت بری ہوتی۔ (۱۵۸)

نماز کا ذوق اور خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی ادائیگی سید صاحبؒ کے رفقاء کی پہچان بن گئی تھی۔ جس فرد یا جماعت میں یہ صفت نظر آتی، لوگ گمان کرتے کہ ان کا تعلق سید صاحبؒ کی جماعت سے ہوگا۔

اسلامی حکومت میں نماز پر زور

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء خود تو نماز کا اہتمام کرتے ہی تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں سرحد میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کی سعادت بخشی تو انہوں نے وہاں عام مسلمانوں کو بھی نماز کا پابند بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اس سلسلے میں قانون بنائے۔ انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا شعبہ قائم کیا جس کے ذمہ دار علاقے کا دورہ کرتے تھے تاکہ دیکھیں وہاں کوئی نماز کا تارک تو نہیں۔ اللہ کے فضل سے نماز کا رکن اس طرح وہاں کے مسلمانوں کے لئے جزو زندگی بن گیا تھا کہ جب یہ مجاہدین دورہ کرتے ہوئے کسی گاؤں میں پہنچتے تو وہاں کے لوگ گاؤں سے باہر آ کر ان کا خیر مقدم کرتے اور اطلاع دیتے کہ وہاں کوئی بے نمازی نہیں۔ اللہ کے فضل سے یہ سعادت سید صاحبؒ کو ہی حاصل ہوئی کہ ان کے زیر اثر پورے علاقے میں لوگ اس طرح ادائے نماز پر قائم ہو گئے کہ خدا کے فضل سے ایک شخص بھی نہیں ملتا تھا جو بے نمازی ہو۔ (۱۵۹)

۳۔ حج

حج جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے، ایک ایسا فریضہ ہے جسے مسلمانان ہند ہمیشہ نہایت شوق سے ادا کرتے آئے ہیں۔ لیکن، جیسا کہ باب اول میں گزرا، سید صاحبؒ کے دور میں کچھ ایسے کم علم اور کوتاہ فہم علماء سامنے آئے جنہوں نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر حج فرض نہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مکہ معظمہ کا راستہ غیر محفوظ ہے، پرتگالی اور برٹش جہاز راں اکثر

---

(۱۵۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۵۳۔ سید صاحبؒ سے تعلق کے اس خیر و برکت کا عوام اور خواص سب کو تجربہ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے ایک شاگرد حافظ مصطفےٰ نے جو عمر رسیدہ تھے، سید صاحبؒ سے بیعت کے بعد اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا: ''پہلے ہم جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ دلیا تھا۔ اسے آٹا سید صاحبؒ ہی نے بنایا۔'' (مہر، جماعت مجاہدین، ۲۵۱)۔

(۱۵۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۸۔

حاجیوں کے جہاز کو لوٹتے اور ڈبو دیتے ہیں اور کبھی وہ سمندر میں طوفان کی وجہ سے بھی تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح راستہ کا امن وامان جو حج کی فرضیت کی ایک شرعی شرط ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو میسر نہین، اس لئے ان پر حج فرض نہیں۔ ان کا مزید یہ کہنا تھا کہ ان حالات میں حج کو جانا اور دیدہ ودانستہ جان کو خطرے میں ڈالنا حقیقتاً اللہ کی نافرمانی اور اسلامی تعلیمات کی مخالفت ہے۔

حج کی عدم فرضیت کا فتنہ

اس دلیل میں بظاہر وزن تھا۔ مسلمان تذبذب کا شکار ہو گئے اور بہت سے ایسے مسلمان جن پر حج فرض تھا، اس کی ادائیگی کے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ علماء حق نے اس فتنہ کا رد کیا۔ مولانا عبدالحی بڈھانویؒ، مولانا شاہ محمد اسماعیلؒ اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے حج کی فرضیت باقی رہنے کے حق میں فتویٰ دیا۔ لیکن پھر بھی یہ فتنہ زور پکڑ گیا اور صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر اس کا سدباب جلد نہیں کیا جاتا تو ہندوستان میں اسلام کی شکل ہی تبدیل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تحریر فرمایا: ''علماء کم علم اور کج فہم نے جن اندیشوں کے بناء پر حج کی فرضیت سے انکار کر دیا، کیا بعید تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو بعض دوسرے وجوہ کی بنیاد پر نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے رخصت کا پروانہ بھی عطا کر دیتے''۔ (۱۶۰)

سید صاحبؒ کی جانب سے حج کی فرضیت کا دفاع

سید صاحبؒ نے اسلام کے اس عظیم رکن کے لئے خطرے کا احساس کر لیا۔ ان دنوں ان کے دل کو حج کی فکر لگ گئی تھی اور ان کی زیادہ تر دعائیں اسی کے حق میں ہوتی تھیں۔ لیکن دعاء کے علاوہ انہوں نے ایک ایسا عملی قدم اٹھانے کا بھی فیصلہ کیا جس سے حج کا عملی طور پر قابل ادائیگی ہونا ثابت ہو جاتا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ سال حج کے لئے جاتے ہیں اور جو مسلمان مرد یا عورت ان کے قافلے میں شریک ہونا چاہے وہ اس کے سفر کے سارے اخراجات کے کفیل ہوں گے۔ انہوں نے مختلف شہروں میں اپنے لوگوں کو اس مضمون کا خط لکھ کر اس خبر کی خوب تشہیر کی، حتیٰ کہ یہ خبر ہندوستان کے مختلف حصوں میں خوب پھیل گئی۔

لوگوں نے سید صاحبؒ کے سفر حج کی اطلاع کا نہایت شوق ودلچسپی سے استقبال کیا۔ جو سفر

---

(۱۶۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۴۷۔۲۵۱۔

حج میں شرکت کے خواہش مند تھے، انہوں نے کاروان حج میں شمولیت اختیار کی۔ جو حج کے لئے نہیں جاسکتے تھے، انہوں نے کاروان حج کی خدمت کو باعث سعادت جانا۔ جو یہ بھی نہیں کر سکے، انہوں نے دور ونزدیک سے چل کر قافلۂ حج کو ایک نظر دیکھ لینے کی ہی کوشش کی۔ مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کے ساتھ بڈھانہ سے حج میں شرکت کی نیت سے ایک بڑی جماعت سید صاحبؒ کی خدمت میں تکیہ پہنچی۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ کی معیت میں ڈھائی سو مرد وعورت دہلی، پھلت اور سہارنپور سے تکیہ پہنچے۔ رائے بریلی کے اطراف سے بھی تقریباً ایک سو مرد وعورتیں جمع ہوگئیں۔ تقریباً چالیس افراد خود سید صاحبؒ کے اعزہ اور اہل خاندان سے حج کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح جب ۳۰۔ جولائی ۱۸۲۱ء (شوال ۱۲۳۶ھ) کو بروز سوموار سید صاحبؒ کے قافلہ نے تکیہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا تو حجاج کی تعداد چار سو پانچ (۴۰۵) تھی۔ (۱۶۱)

آغاز سفر میں ہی سید صاحبؒ نے سارے رفقاء کو اہتمام کے ساتھ اس بات کی ہدایت کی کہ حج کا سفر اللہ پر توکل اور تقویٰ کے ساتھ طے کرنا ہے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس بات کی ان الفاظ میں تاکید کی:

> ہم فقراء اپنے گھروں سے محض اللہ کے بھروسے پر ادائے حج کے لئے نکلے ہیں۔ حج بڑی عظیم الشان عبادت ہے۔ ہر شخص کو تقویٰ کو اپنا شعار بنانا چاہئے۔ کوئی شخص کسی شخص سے چھوٹی سے چھوٹی چیز کا سائل نہ ہو۔ ہم کسی سے زادراہ کا ہرگز سوال نہیں کریں گے۔ اگر ضرورت پڑے گی تو مزدوری کریں گے، آدھا کھائیں گے اور آدھا جہاز کے کرائے کے لئے رکھیں گے۔ میں اپنے حج کو بھی اپنے ساتھیوں کے حج پر مقدم نہیں رکھوں گا۔ اگر زادراہ کم ہوجائے گا تو ہم تھوڑے تھوڑے آدمیوں کو کلکتے سے بھیج کر حج کرائیں گے، اس کے بعد خود جائیں گے۔ لیکن اللہ کی ذات سے مجھے یہی امید ہے کہ وہ ساز وسامان درست فرمائے گا۔ (۱۶۲)

سید صاحبؒ کا قافلہ اتر پردیش، بہار اور بنگال کے وسیع صوبوں سے گزرتا ہوا کلکتہ کی طرف رواں دواں تھا جہاں سے پانی کے جہاز کے ذریعہ حجاج کو جدہ کا سفر کرنا تھا۔ جہاں جہاں موقعہ ملا، اصلاح حال اور اصلاح معاشرہ کی دعوت کے ساتھ حج کی فضیلت اور حج کے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل عمل ہونے پر پورا زور دیا گیا۔ دلمو نامی مقام پر سید صاحبؒ کے حکم سے مولانا عبدالحیؒ

---

(۱۶۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۵۷۔ مہر نے عیسوی تاریخ سید احمد شہیدؒ میں صفحہ ۱۸۲ پر دی ہے۔
(۱۶۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۶۳۔

نے لگاتار چار دن تک توحید وسنت کی اہمیت کے ساتھ حج وعمرہ کی فضیلت پر وعظ فرمایا۔ ایک موقعہ پر سید صاحبؒ نے خود حج کے ارکان تفصیل سے بیان کیے۔ جب قافلہ گنتی نامی ایک مقام پر پہنچا تو سید صاحبؒ کو اطلاع دی گئی کہ مولوی یاد علی نامی ایک شخص جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے حج کی عدم فرضیت کے قائل ہیں، پاس کے ایک گاؤں گڑھ میں رہتے ہیں۔ سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کو چالیس افراد کے ساتھ گڑھ بھیجا اور یہ ہدایت دی کہ وہ وہاں مسلمانوں کو جمع کر کے ان سے گفتگو کریں اور ان کے سامنے قرآن وحدیث کی روشنی میں حج کی فرضیت ثابت کریں۔ (۱۶۳) ان سب باتوں کا ہندوستانی مسلمانوں کے دل ودماغ پر گہرا اثر پڑا۔ حج کی فرضیت سے انکار کرنے والے قائل ہوتے گئے اور عوام نے بھی جب اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو حج کے لئے جاتے دیکھا تو ان کے سامنے بھی حج کی عدم فرضیت کے دلائل کمزور اور ناقابل قبول ثابت ہو گئے۔

حج کی ادائیگی میں ذوق وشوق

حج کی روح اصلاً وہ اخلاص اور شوق ہے جس کے ساتھ حاجی فریضہ حج ادا کرتا ہے۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے پورے حج میں انتہائی صبر وسکون، ذوق وشوق اور تقویٰ وپرہیز گاری کا اہتمام کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی "مخزن احمدی" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حجاج نے سفر کی صعوبتوں کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس طرح برداشت کیا کہ ان کی زبان اللہ کے ذکر سے تر اور ان کا دل یاد الٰہی سے معمور رہتا تھا۔ سید صاحبؒ کی رفاقت اور تعلیمات کا یہ فیض تھا کہ وہ راہ کی مشکلات پر صبر کرتے اور اس بات پر شکر کہ یہ صعوبتیں انہیں راہ حج میں پیش آرہی تھیں۔ (۱۶۴)

جب حجاج کا قافلہ مکہ معظّمہ پہنچا تو ان کے دل محبت الٰہی، شکر گزاری اور خوشی کے جذبات سے سرشار تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر کرتے ہیں: "مکہ معظّمہ میں داخل ہوتے وقت ہر شخص پر گریہ طاری تھا۔" (۱۶۵) جب قافلہ مدینہ منورہ جارہا تھا تو ذوالحلیفہ سے چل کر "ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے روضۂ منورہ نظر آرہا تھا۔ ہر ایک پر محبت واشتیاق کا غلبہ تھا، درود وقصائد مدحیہ اور اشعار نعتیہ زبان پر تھے۔" (۱۶۶) جہاز سے جب عدن کے پہاڑ نظر آئے تو سید صاحبؒ کے دل میں محبت

---

(۱۶۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۶۸۔

(۱۶۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۵۸۔

(۱۶۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول ۳۵۳۔

(۱۶۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۶۳۔

وشکر کے جذبات موجزن ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی سرزمین دکھائی۔ انہوں نے شکر کے کلمات کہے اور مولانا عبدالحئیؒ سے فرمایا: ''جب ہم جہاز سے اتریں گے، شکر کا دوگانہ پڑھیں گے۔''(۱۶۷) جب جہاز ابھی سمندر ہی میں تھا تو ان کے ایک رفیق سفر نے انہیں جہاز کی چھت پر تنہا کھڑا دیکھا۔ ان کا بیان ہے: ''وہ (سید صاحبؒ) سمندر کو دیکھ کر بار بار سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم پڑھتے تھے اور دیوان حافظ کے کچھ اشعار بھی پڑھتے تھے جو مجھے یاد نہیں۔ آنکھوں سے آپ کے چہرے پر آنسو جاری تھے اور آواز میں فرق ہو گیا تھا۔''(۱۶۸) مکہ معظمہ سے واپسی کے وقت ہر شخص بیت اللہ سے جدائی کے احساس سے غمگیں تھا۔(۱۶۹)

پورے سفر حج میں سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ہر عمل سے مکمل طور پر پرہیز کیا، خصوصاً جدال، فسق، عصیان اور بے حیائی سے تو بہت دور رہے جن سے حج کے موقعہ پر بچنے کی خصوصی تاکید آئی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں: ''آپ کی صحبت کی برکت سے قافلے میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا پیش نہیں آیا۔''(۱۷۰) یہی نہیں کہ وہ نافرمانی سے بچے بلکہ انہوں نے اپنے حج کو ان نیک اعمال سے مزین کرنے کا پورا اہتمام کیا جو اللہ کو پسند ہیں۔ حجاج کا وقت تلاوت قرآن، نماز، دعاء، ذکر اور دین سیکھنے سکھانے میں گزرتا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ کا ''روزانہ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد 'حزب البحر' پڑھتے اور مولانا محمد یوسف صاحب سے 'سورۃ زخرف' کا پہلا رکوع سنتے۔ جب آپ اس سے فارغ ہوتے تو لوگ آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے۔ کوئی کسی آیت کا مطلب پوچھتا، کوئی کسی حدیث کا۔ سوا پہر دن چڑھے تک اسی طرح مجلس رہتی۔'' وہ آگے لکھتے ہیں کہ ''ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر سید صاحبؒ پھر اسی دری پر بیٹھ جاتے اور اس طرح سے لوگ آپ کے پاس جمع ہو جاتے اور جو جس بات کا سوال کرتا، اس کا جواب دیتے۔''(۱۷۱)

مکہ معظمہ میں سید صاحبؒ نے مولوی عبدالحئیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کو تعلیمی حلقے قائم کرنے کی صلاح دی تاکہ عام مسلمانوں کو نفع ہو۔ حکم کی تعمیل میں مولانا عبدالحئیؒ نے حدیث شریف کی مشہور کتاب مشکوۃ شریف کا درس شروع کیا اور مولانا شاہ اسماعیلؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

---

(۱۶۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۶۔

(۱۶۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۸۔

(۱۶۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۶۷۔

(۱۷۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۵۔

(۱۷۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۴۔۳۴۵۔

کی معرکتہ الآراء کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا۔ دونوں حلقے نہایت مقبول اور مفید ثابت ہوئے۔ اسی سفر میں ''صراط مستقیم'' کا، جو سید صاحبؒ کی تعلیمات پر مبنی کتاب تھی اور جسے مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ نے سید صاحبؒ کی نگرانی میں قلمبند کیا تھا، عربی ترجمہ عربی داں قارئین کے استفادے کے لئے تیار کیا گیا۔ مکہ معظمہ کے دوبارہ قیام کے دوران رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ ''تمام اہل قافلہ روزہ ونماز اور عمرہ وطواف میں حسب معمول سرگرم و مشغول ہو گئے۔''(۱۷۲)

مستقبل کے لئے عہد

سفر حج نے حجاج کے دلوں میں اسلام کی عظمت ومحبت کی جوت جگا دی۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ سب اپنی پوری زندگی اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کریں گے۔ جب سید صاحبؒ حج سے ہندوستان واپس ہوئے تو ان کا دل شکر کے جذبات سے لبریز تھا۔ انہوں نے اجتماعی طور پر حج وعمرہ کی ادائیگی اور سفر میں سہولت وکفالت کے لئے بارگاہ الٰہی میں بہت شکر ادا کیا اور ایک طویل دعاء مانگی جس میں مستقبل کے بارے میں ان کی تمنائیں ان الفاظ میں ظاہر ہو گئیں: ''ہماری جانیں اور ہمارے مال تیرے راستے میں صرف ہوں۔'' یہ فرماتے جاتے تھے اور ''آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تمام حاضرین پر ایسی تاثیر اور رقت طاری تھی کہ زار زار روتے تھے اور ایک بے ہوشی اور خود فراموشی کا عالم تھا۔''(۱۷۳) یہ سفر اللہ کی رضا کے لئے تھا اور اس کی بناء پر کوئی نام ونمود مقصود نہ تھا، اس لئے حج سے واپسی کے بعد سید صاحبؒ کی ایک دعاء یہ بھی تھی: ''یا اللہ! ہم میں سے کوئی حاجی کے لقب سے مشہور نہ ہو۔''(۱۷۴)

جب سید صاحبؒ کا قافلۂ حج، جس نے کئی وجوہات سے پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر لی تھی، بخیر وعافیت واپس آ گیا تو حج کی فرضیت کے خلاف راستے کے پُرخطر ہونے کے جو دلائل دیئے جا رہے تھے، وہ خود بخود لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہو گئے اور کچھ ہی دنوں میں ان کے ذہن سے معدوم ہو گئے۔ جن صوبوں سے گذرتا ہوا یہ قافلۂ حج واپس ہوا، وہاں کے لوگوں نے قافلہ کی محفوظ واپسی کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ دیگر علاقوں کے لوگوں نے دوسروں سے اس کی

(۱۷۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۶۶۔
(۱۷۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۷۳۔
(۱۷۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۵۷۔

تفصیلات سنیں۔ایک مدت تک اس حج کے واقعات کی گونج لوگوں کی محفلوں میں سنائی دیتی رہی۔ شعراء نے کاروان حج اور سالار حج کی مدح میں نظمیں لکھیں۔اس کے بعد ہندوستان میں حج کی فرضیت اس شان سے قائم ہوگئی کہ آج تک لاکھوں مسلمان فریضۂ حج ادا کرتے ہیں اور ذوق وشوق کے ساتھ اس فریضہ کوادا کرنے میں ان کا عالمی برادری میں ایک امتیازی مقام ہے۔

۴۔دعاء

نواب وزیرالدولہ اپنی کتاب ''وصایۃ الوزیر'' میں لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ میں دعاء کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کی دعاؤں میں عجیب تاثیر تھی اور وہ شرف قبولیت سے نوازی جاتی تھیں۔[۱۷۵] سید صاحبؒ ہر ضرورت کے لئے اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے اور کامل یقین اور انتہائی الحاح کے ساتھ اس سے حاجت طلب کرتے تھے۔وہ انفرادی طور پر بھی دعاء کا اہتمام کرتے تھے اور اجتماعی طور پر بھی۔عسرت ہو یا فراغت،خوشی ہو یا غم،فتح ہو یا شکست،وہ ہر حال میں اور سب سے پہلے اللہ تعالی سے دعاء مانگنے کا ہی اہتمام کرتے تھے۔نیچے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحبؒ کی زندگی اور مشن میں دعاؤں کا کتنا اہم مقام تھا۔

دعاء کی سنت کا احیاء

ایک بار جب سید صاحبؒ دائرہ شاہ علم اللہ میں اپنے ارادت مندوں کے ساتھ مقیم تھے، عسرت کا ایک ایسا دور آیا کہ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء اور اہل خاندان پر دو دن مکمل فاقہ کے گزر گئے۔سید محمد علی، جو سید صاحبؒ کے بھانجہ اور ''مخزن احمدی'' کے مصنف ہیں، بھی ساتھ تھے۔ان سے اس آزمائش کا تحمل مشکل ہوگیا۔بھوک نے جب حد درجہ بے چین کیا تو وہ سید صاحبؒ سے دعاء کے ملتجی ہوئے۔اس وقت سید صاحبؒ اپنے رفقاء کے ساتھ مسجد میں ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔سید محمد علی کا حال زار دیکھ کر سید صاحبؒ مسکرائے، اپنے رفقاء کو دعاء کرنے کی تلقین کی اور خود بھی الحاح کے ساتھ دعاء میں مشغول ہوگئے۔اس وقت بہت تیز بارش ہو رہی تھی اور برسات ہونے کی وجہ سے سئی ندی میں جس کے کنارے دائرہ شاہ علم اللہ آباد ہے، خاصا پانی تھا۔اللہ کی شان کہ جیسے ہی سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھایا، بارش تھم گئی اور اس سے پہلے کہ وہ دعاء

---

(۱۷۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۰۔

مکمل کرتے، سئی ندی کی دوسری جانب سے چند لوگوں نے آواز دی کہ ندی پار کرنے کے لئے ان کے لئے کشتی بھیجی جائے، وہ سید صاحبؒ کے لئے اناج لائے ہیں۔ (۱۷۶)

سرحد میں قیام کے دوران ایک شب جب سید صاحبؒ کا مجاہدین کے ساتھ ایک ایسے سنسان اور غیر آباد پہاڑی مقام پر قیام ہوا جہاں کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا تو مجاہدین کو اندازہ ہوگیا کہ وہ رات فاقہ ہی سے گزارنی ہے۔ سید صاحبؒ نے سب کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور عشاء تک ساتھیوں کے سامنے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اللہ کی حمد وثناء اور شان رزاقیت کا بیان فرماتے رہے۔ ان کے الفاظ میں ایسا اخلاص اور ایسی تاثیر تھی کہ مجاہدین رو پڑے اور قرب الٰہی اور نزول رحمت خداوندی کی ایک عجیب کیفیت سے ہمکنار ہوئے۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے ننگے سر ہو کر نہایت الحاح سے اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا شروع کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ کا ذکر جمیل کرتے جاتے تھے اور نہایت عاجزی کے ساتھ دعاء مانگ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چند مقامی گوجر جوان کے لئے بالکل اجنبی تھے ان سے اچانک ملنے آئے۔ وہ ایک بڑے برتن میں سب کے لئے دودھ لائے تھے۔ ساتھ میں سید صاحبؒ کے لئے ایک چارپائی اور بستر بھی تھا۔ (۱۷۷)

سرحد کے قیام کے دوران سید صاحبؒ کا ذوق دعاء ایک دوسرے انداز میں سامنے آتا ہے۔ ایک دن انہوں نے مولانا شاہ اسماعیلؒ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اور ان کے سارے رفقاء چند دن دعاء میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ خود ایک مقررہ وقت میں تنہا کسی پرسکون جگہ میں دعاء میں مشغول ہوں اور مولانا شاہ اسماعیلؒ پاس ہی جنگل میں کسی مناسب مقام پر مجاہدین کے ساتھ دعاء کرنے کا اہتمام کریں۔ چنانچہ روزانہ عصر کی نماز کے بعد سید صاحبؒ تو خود تنہا ایک کمرے میں دعاء کا اہتمام فرماتے اور مولانا شاہ اسماعیلؒ سب مجاہدین کو بستی سے باہر ایک نالے کے پاس لے کر جاتے۔ وہاں وہ پہلے دعاء کی فضیلت اور آداب کا بیان فرماتے اور پھر عاجزی کے اظہار کے طور پر ننگے سر ہو کر اللہ سے دعاء کرتے۔ اس وقت سب کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے۔ یہ دعاء طویل ہوتی اور دیر تک جاری رہتی۔ واپسی کے بعد مولانا شاہ اسماعیلؒ سید صاحبؒ کو دعاء کی تفصیل اور کیفیت کے بارے میں بتاتے۔ یہ سلسلہ پانچ، سات دنوں تک جاری رہا۔ (۱۷۸)

---

(۱۷۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۷۸۔۱۸۰۔

(۱۷۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۴۰۸۔

(۱۷۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۴۰۳۔

سید صاحبؒ کسی بھی کام کے شروع کرنے سے پہلے دعاء کا اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً کلکتہ میں جب ایک جگہ وعظ کہنے کا موقعہ آیا تو انہوں نے پہلے ان الفاظ میں دعاء کی: "الٰہی! جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ بیان کروں گا اور بندوں کی ہدایت تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو محض اپنے فضل وکرم سے ان بھائیوں کو ہدایت کر اور شرک وبدعت اور فسق وفجور سے ان کو محفوظ رکھ اور سنت وتوحید پر ان کو قائم کر۔"(۱۷۹) اسی طرح جب وہ کوئی نیک عمل پورا فرمالیتے تو اہتمام سے اس عمل کی قبولیت کے لئے دعاء کرتے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے ایک ارادت مند کو گھر سے شرک وبدعت کے بعض آثار ہٹادینے کی ترغیب دی۔ اہل خانہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے فوراً بعد سید صاحبؒ نے حسب معمول دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ان الفاظ میں اللہ سے دعاء مانگی: "یا اللہ! تو ان سب لوگوں کو ہدایت نصیب کر اور اپنی صراط مستقیم پر قائم رکھ۔"(۱۸۰) انہوں نے حج کے سفر کے آغاز میں بھی دعاء کا اہتمام کیا اور واپسی کے بعد بھی۔ وہ جنگ سے پہلے بھی دعاء کرتے تھے اور جنگ کے بعد بھی۔ اصلاً وہ اس کا اہتمام اس لئے کرتے تھے کہ ان کا ہر عمل اللہ کی رضا کے لئے ہی تھا۔

دعاء میں الحاح وحضوری

سید صاحبؒ کی دعاء میں الحاح اور حضوری کی ایک عجیب تاثیر وکیفیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی دعاؤں میں اکثر اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی اور اس کی عظیم صفات کا واسطہ دیتے تھے۔ نبی برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح وہ خود دعاء کے وقت متاثر اور بے قرار ہوجاتے اور ان کے جذبات کا پیمانہ چھلک جاتا۔ ایک بار جب انہوں نے جاوا کے اپنے بعض ارادت مندوں کے لئے دعاء کی تو وہ سب بے اختیار کہہ اٹھے: "جس طرح حضرت نے ہمارے واسطے دعاء کی ہے ہم نے اس طرح دعاء کرتے ہوئے نہ کسی کو دیکھا، نہ سنا اور نہ ایسے الفاظ ہم نے کبھی پڑھے۔"(۱۸۱)

سب کے لئے دعاء

سید صاحبؒ سب کے لئے دعاء کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے لئے دعاء کرتے تھے، ان مسلمانوں کے لئے بھی جو ان کے خلاف صف آرا تھے۔ ایک درانی سردار کے لئے جس نے بلا کسی جائز سبب کے ان پر جنگ تھوپ دی تھی انہوں نے جنگ سے پہلے پورے اخلاص سے ان الفاظ

(۱۷۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۱۶۔ (۱۸۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۴۔

(۱۸۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۵۶۔

میں دعاء کی: "اگر تیرے علم میں ہم حق پر ہوں تو ہم ضعیفوں کو فتح یاب کر۔ اور جو وہ حق پر ہوں تو ان کو کر۔" (۱۸۲) اسی طرح سید صاحبؒ پورے اخلاص سے غیر مسلموں کے لئے بھی دعاء کرتے تھے۔ جیسا کہ غلام رسول مہر شہادت دیتے ہیں، وہ سکھوں کے لئے جن سے وہ میدان جنگ میں نبرد آزما تھے، ہر فرض نماز کے بعد روزانہ یہ دعاء کرتے تھے: "خدایا! ان لوگوں کو ہدایت فرما اور ایمان و اسلام کی دولت دے کر ہمارا بھائی بنا دے۔" (۱۸۳) حقیقتاً وہ سارے بنی نوع انسان کے لئے دعاء کرتے تھے۔ جب انہوں نے جاوا کے ارادت مندوں کی ایک جماعت کے لئے دعاء کی تو ان لوگوں نے یہ بات واضح طور پر محسوس کی اور قدر دانی کے ساتھ اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا: "حضرت نے ہمارے واسطے اور مخلوق کے واسطے کیا اچھی دعاء کی۔" (۱۸۴)

سید صاحبؒ کے رفقاء کی زندگی میں دعاء کا مقام

سید صاحبؒ کی تعلیم و تربیت سے ان کے خلفاء، رفقاء اور ارادت مندوں میں بھی دعاء کا غیر معمولی اہتمام پیدا ہو گیا تھا۔ ان سب کی زندگی میں یہی رنگ و ذوق غالب تھا۔ اس پر روشنی ڈالنے کے لئے چند منتخب واقعات نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

نواب وزیر الدولہ، جو سید صاحبؒ کے مرید باصفا اور ریاست ٹونک کے حکمراں تھے، بھی دعاء کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے اور اس کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں دعاؤں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر دربار کرتے وقت بھی وہ دعاء کرنے کا تقاضہ محسوس کرتے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے، سرپوش اتار دیتے، کعبہ کی طرف رخ کر لیتے اور اللہ تعالیٰ سے دعاء میں مشغول ہو جاتے۔ انہوں نے اپنے درباریوں کے لئے یہ فرمان جاری کر رکھا تھا کہ ان اوقات میں وہ نواب کی تعظیم کے لئے اپنی جگہ پر کھڑے نہ ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ ساری زندگی انہوں نے کبھی کسی کے خلاف دعاء نہیں کی۔ (۱۸۵)

پھولڑا کی جنگ میں جس میں سکھ سپہ سالار ہری سنگھ نلوہ نے مجاہدین پر حملہ کیا تھا، مجاہدین اچانک گھیرے میں آ گئے تھے اور ان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ جلد سنبھل جانے اور اپنے دفاع

---

(۱۸۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۵۵۔ (۱۸۳) مہر، سیرت احمد شہیدؒ، ۸۳۵۔

(۱۸۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۵۶۔

(۱۸۵) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۳۷، اور جماعت مجاہدین، ۱۹۰۔

کے لئے صف آرا ہو جانے کا تھا۔ لیکن سید احمد علی، جو مسلم فوج کے کمانڈر تھے، اس نازک موقعہ پر بھی اللہ سے مدد مانگنا نہیں بھولے۔ وہ جلدی سے ایک جگہ قبلہ رو ہو کر کھڑے ہو گئے، اپنے پاس کے لوگوں کو تاکید کی کہ وہ دوسرے مجاہدین کو بھی بلالیں اور فوراً دعاء میں مشغول ہو گئے۔ مختصر دعاء کے بعد ہی انہوں نے ہتھیار سنبھالے۔ (۱۸۶)

مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ کو بھی دعاء سے بہت تعلق خاطر تھا اور وہ دعاء میں اپنے درد دل کی دوا پاتے تھے۔ ایک زمانے میں ہندوستان کی برٹش حکومت نے انہیں سرحد چھوڑ کر واپس اپنے وطن عظیم آباد جانے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ شرط عائد کر دی تھی کہ وہ عظیم آباد چھوڑ کر سرحد نہیں جائیں گے۔ وہ اپنے وطن میں نہایت بے قرار اور سرحد واپسی کے لئے بے چین رہتے تھے۔ اس بے چینی کے عالم میں کبھی وہ چلچلاتی دھوپ میں اور کبھی ڈھلتی رات کے سناٹے میں گھر سے باہر کھلے میدان میں آجاتے، زمین پر سر رکھ دیتے اور سجدے میں بے قرار ہو کر دعاء کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سرحد پہنچا دے جہاں وہ اپنے محبوب قائد سید صاحبؒ سے جدا ہو گئے تھے اور جہاں اس وقت بھی مجاہدین سید صاحبؒ کے نصب العین کی کامیابی کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

۵۔ دعوت

توحید و سنت پر عمل کی دعوت اور شرک و بدعت سے اجتناب کی ترغیب کو سید صاحبؒ کی تحریک احیاء اسلام میں کلیدی مقام حاصل تھا۔ ان کی دعوت میں ایک طلسماتی اثر تھا۔ سید صاحبؒ لوگوں کے دل میں اسلام کی غیر معمولی محبت پیدا کرنے میں اس لئے اتنا کامیاب ہوئے کہ خود ان کا دل اسلام کی سچی محبت سے سرشار تھا اور انہوں نے یہ مایۂ بے بہا غیر معمولی جدوجہد اور قربانی کے بعد حاصل کیا تھا۔

سید صاحبؒ کی دعوت کی خصوصیات

سید صاحبؒ کی دعوت کی پہلی اور سب سے اہم خصوصیت ان کا اخلاص تھا۔ احیاء اسلام کے دوسرے ہر کام کی طرح انہوں نے دعوت و تبلیغ میں بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کو اپنا نصب العین بنایا اور اپنی دعوتی کوششوں کے بدلے کسی نام و نمود، مال و متاع، یا عہدہ و ملک گیری کے خیال کو بھی اپنے دل سے قریب نہیں آنے دیا۔ جب کلکتہ کے ایک بڑے تاجر شیخ غلام بخش کی

(۱۸۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۰۶۔

اہلیہ نے ایک نہایت شاندار کوٹھی سید صاحبؒ کی خدمت میں ہدیتاً پیش کی تو انہوں نے وہ کوٹھی اسی وقت شیخ غلام بخش کو اپنی طرف سے دے دی اور فرمایا: "ہم تو غریب مسافر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر روز نیا کھانا، نیا پانی اور نیا مکان دیتا ہے، پھر بھلا ہم مکان لے کر کیا کریں گے۔"(۱۸۷)

دوم، سید صاحبؒ اپنے مقام پر بیٹھ کر اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کے پاس آئیں اور دین سیکھیں۔ نبی برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ خود لوگوں کے پاس جاتے تھے اور اپنا پیغام پہنچاتے تھے۔ ان کا دوآبہ کے علاقے کا سفر، رائے بریلی کے اطراف کا دورہ، لکھنؤ میں دعوت کی سرگرمیاں، سفرِ حج میں دعوت و تبلیغ کی سعی بلیغ، سرحد میں احیاء اسلام کی جدوجہد ــــ سب اصلاً دعوت دین کی نیت سے ہی کی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے رفقاء کو بھی ہمیشہ دین کی دعوت لے کر لوگوں تک جانے کی ترغیب دی۔ ایک موقعہ پر آپ نے اسی جذبہ سے زمینداروں کی ایک جماعت سے فرمایا: "کچھ مدت، آپ بھائیو للہ فی اللہ اپنے نواح و اطراف کی بستیوں میں دورہ کرو اور مسلمانوں کو توحید اسلام کا طریق سکھاؤ، اللہ تعالیٰ تم کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔"(۱۸۸) اسی طرح انہوں نے بنگال کے ارادت مندوں کی ایک جماعت سے فرمایا: "جابجا سیر اور دورہ کرتے رہنا اور توحید و سنت کا جو مضمون تم نے یہاں سیکھا ہے، وہی لوگوں کو سکھانا اور ان سے شرک و بدعت کے کام چھڑانا۔"(۱۸۹)

سوم، سید صاحبؒ نے اپنے رفقاء کو اہتمام کے ساتھ اس بات کی تعلیم دی کہ وہ دعوت کی راہ میں آنے والی دشواریوں اور لوگوں کی بدسلوکی کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ جب تبت کے لوگوں کی ایک جماعت ان کے حج کے سفر میں شامل ہونے کی نیت سے حاضر ہوئی تو آپ نے حج (جو زادِ راہ نہ ہونے کی وجہ سے ان پر فرض نہ تھا) کے بجائے انہیں تبت واپس جا کر اسلام کی صحیح تعلیمات کی تبلیغ کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی اور فرمایا: "ہم تم کو تمہارے ہی ملک رخصت کر دیں گے اور احلام نامے لکھ دیں گے۔ وہاں جا کر مسلمانوں کو توحید و سنت سکھاؤ اور شرک و بدعت سے بچاؤ۔ مگر ایک بات ضرور کرنا کہ کوئی تم کو لکڑی، پتھر، لات، گھونسہ کتنا ہی مارے، تم اس پر صبر کرنا اور ان کو کچھ نہ کہنا۔ اس طور تعلیم و تلقین کرتے رہنا۔ پھر عنایت الٰہی سے دیکھنا کہ تھوڑی ہی مدت میں دین اسلام کی کیسی ترقی ہوگی اور وہ سارے ایذا دینے والے خود آ کر تم سے خطا معاف

---

(۱۸۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۱۔
(۱۸۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۱۔
(۱۸۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۴۔

کرائیں گے۔"(۱۹۰) اسی طرح انہوں نے بنگال میں وہاں کے ارادت مندوں کو لوگوں کے پاس جا کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کی ترغیب دی اور اس کے بعد فرمایا۔"اور جو تم کو مارے کوٹے، رنج وایذا دے، صبر کرنا اور وعظ ونصیحت سے باز نہ رہنا"۔(۱۹۱)

چہارم، دعوت میں استقامت اور ثابت قدمی سید صاحبؒ کا ایک خاص وصف تھا۔ بڑے سے بڑے نقصان کا اندیشہ انہیں حق کی دعوت وتبلیغ سے باز نہیں رکھتا تھا۔ ایک بار ان کے لکھنؤ کے قیام کے دوران (جس میں بعض شیعہ حضرات کے سنّی عقیدہ قبول کرنے کے پیش نظر) لکھنؤ کے وزیر اعظم نواب معتمد الدولہ نے سید صاحبؒ کے پاس یہ سرکاری حکم بھیجا کہ وہ شیعہ حضرات کے سامنے تبلیغ نہ کریں، ورنہ لکھنؤ چھوڑ دیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکم عدولی کی صورت میں سرکار کی طرف سے تادیبی کاروائی کی جائے گی۔ لیکن حکومت کے اس موقف سے سید صاحبؒ کے پایۂ ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی اور وہ دعوتی سرگرمیوں میں اسی طرح مشغول رہے۔ بعد میں انہوں نے ایک موقعہ پر فرمایا: "منع کرنے کا طریقہ اور تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ تم ہماری رعیت ہو، ہمارے شہر سے چلے جاؤ، اس میں ہمیں کچھ عذر وحیلہ نہ تھا۔ لیکن کلمۃ الخیر لوگوں کو تعلیم نہ کرو، یہ بات اہل اسلام کے خلاف ہے۔ خدا طالب سنی ہو یا شیعہ، جو ہمارے یہاں آئے گا، ہم اس کو سکھائیں گے"۔(۱۹۲) انہوں نے ہمیشہ اپنے رفقاء کو بھی دعوت کی راہ میں ثابت قدمی کی اسی طرح تعلیم دی۔

پنجم، سید صاحبؒ کا طریق دعوت، فطرت انسانی کے گہرے فہم پر مبنی تھا۔ وہ گناہ سے نفرت کرتے تھے لیکن گنہ گار کے سچے بہی خواہ تھے۔ وہ غافل اور گنہ گار مسلمانوں کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں اور پر امید رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ایسے لوگ خود ان گناہوں سے نفرت کرنے لگیں جن میں وہ مبتلا ہیں اور انہیں ترک کر کے اسلامی تعلیمات کو اختیار کریں۔ ان کے لکھنؤ کے قیام کے دوران امان اللہ خان اور اس کے چند ساتھی جو چوری اور جرائم پیشگی میں ملوث تھے سید صاحبؒ کی شہرت سن کر از راہ تجسس ان سے ملنے آئے۔ لوگوں نے چپکے سے سید صاحبؒ کو ان لوگوں کی مجرمانہ زندگی کی اطلاع دے دی۔ سید صاحبؒ ان سے محبت واکرام کے ساتھ ملے اور اسلام کی حقانیت اس دلپذیر انداز میں ان کے سامنے پیش کی کہ وہ سب تائب ہوئے اور دین دارانہ زندگی اختیار کر لی۔(۱۹۳) ٹوپی کے پھلیلہ نامی ایک ظالم ڈاکو کو آپ نے اسی طرح حکمت

---

(۱۹۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۰۱۔

(۱۹۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۴۔

(۱۹۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۲۰۔

(۱۹۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۱۳۔۲۱۶۔

واخلاق سے مانوس کیا اور بالآخر اس نے بھی جرائم پیشہ زندگی ترک کر کے سید صاحبؒ کی رفاقت اختیار کر لی۔ (۱۹۴) یہ سید صاحبؒ کے اس انداز دعوت وتبلیغ کا ہی اعجاز تھا کہ ان کے دست گرفتہ اشخاص میں، جنھیں ان کے بدولت گناہوں سے اجتناب کی توفیق نصیب ہوئی، بہت سے جرائم پیشہ، پیشہ ور گداگر، ہجڑے اور پیشہ ور عورتیں بھی ملتی ہیں جو تائب ہوئیں اور جن کی زندگی اچھے دیندار مسلمانوں کے لئے قابل رشک بن گئی۔

ششم، سید صاحب کے دعوتی نظام میں ہر کس وناکس کے لئے جگہ تھی، اس طرح کہ اس کی پوری پذیرائی ہوتی تھی اور اس کو یہ احساس ہوتا تھا کہ تحریک میں اس کا تعاون کسی سے کم اہم نہیں۔ سید صاحبؒ ہر شخص کو جہاد بالسیف کی دعوت نہیں دیتے تھے، مگر وہ ہر مسلمان کو اس کی دعوت ضرور دیتے تھے کہ وہ اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر احیاء دین میں اپنی صلاحیت، ذوق اور حالات کے مطابق شریک ہو۔ انہوں نے ارباب حکومت اور والیان ریاست کو اپنے اپنے علاقے میں شریعت مطہرہ کے مطابق حکومت کا نظم ونسق چلانے کی دعوت دی۔ انہوں نے منتخب حضرات کو ذمہ داری دی کہ وہ خواص وعوام میں دعوت کا کام لے کر اٹھیں۔ انہوں نے مخصوص شعراء کو مجاہدین کی ہمت افزائی کے لئے کھڑا کیا (مولانا خرم علی بلہوری کی نظم "جہادیہ" جہاد کے موقعہ پر میدان جنگ میں پڑھی جاتی تھی)، اور بعض شعراء کو ترغیب دی کہ وہ سادہ اور عام فہم زبان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ضروری مسائل دین کو منظوم طور پر تیار کر دیں تا کہ عوام الناس انہیں یاد کر لیں اور اس طرح ضروری علم دین سے واقف ہو سکیں۔ سرحد میں بعض عمر رسیدہ تعلیم یافتہ حضرات کو ضرورت مند مجاہدین کو قرآن ناظرہ پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی۔ جب سید صاحبؒ کو یا شاہ اسماعیلؒ کو علم سے مناسبت رکھنے والا کوئی طالب حق مل جاتا تو وہ اپنے مشغول نظام الاوقات سے اس کے لئے وقت نکالتے۔ نواب وزیر الدولہ نے وصایۃ الوزیر میں لکھا ہے کہ مولوی عماد الدین بنگالی نے خود سید صاحبؒ سے صراط مستقیم کئی بار سبقاً پڑھی۔ (۱۹۵)

دعوت کے لئے اختیار کردہ ذرائع

اسوۂ نبویؐ کے مطابق سید صاحبؒ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ضروری ذرائع اختیار کرنے کا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ ان کے طویل دعوتی اسفار، دعاؤں کا اہتمام، لوگوں کو تربیت کے لئے بیعت میں قبول کرنا، نجی مجلسوں میں ترغیب اور عمومی مجلسوں میں وعظ، تعلیمی حلقوں کا قیام

---

(۱۹۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۱۴، ۲۱۶۔ (۱۹۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۵۴، ۲۵۵۔

(جن میں مولانا عبدالحی بڈھانویؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کے مکہ مکرمہ میں حرم شریف میں تعلیمی حلقے سرفہرست ہیں)، علماء کو دعوتی مقاصد کے تحت مختلف علاقوں میں بھیجنا، یہ سب وہ ذرائع تھے جنہیں سید صاحبؒ نے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے استعمال فرمایا، جن کا ذکر اس کتاب میں مناسب مقامات پر مذکور ہے۔ پھر بھی چند ذرائع ایسے ہیں جن پر یہاں خصوصاً روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اول، سید صاحبؒ منتخب رفقاء کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، ان کے سارے اخراجات کی ذمہ داری خود اٹھاتے تھے اور ان کی اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ وہ فکری اور عملی طور پر ان بلند مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کی اہلیت پیدا کر سکیں جو سید صاحبؒ کے پیش نظر تھے۔ اس طرح ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو احیاء اسلام کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی پوری طرح اہل تھی۔ مولانا حیدر علی رامپوری لکھتے ہیں: ''اکثر ملکوں میں خلفاء راست کردار جناب موصوف (سید صاحبؒ) نے سیر فرما کر لاکھوں آدمیوں کو دین محمدی کی راہ راست بتادی''۔ (۱۹۶)

دوم، سید صاحبؒ کی تحریک احیاء دین میں مناسب دعوتی لٹریچر کو بھی ایک مقام حاصل تھا جن میں چھوٹی بڑی سب طرح کی کتابیں شامل تھیں۔ مہر لکھتے ہیں کہ ایسی کئی کتابیں خود سید صاحبؒ کی ذاتی ترغیب سے اور ان کی نگرانی میں تیار کی گئی تھیں، ''مثلاً صراط مستقیم''، ''تنبیہ الغافلین''، ''رسالہ در نماز و عبادات'' اور ''رسالہ در نکاح بیوگان''۔ (۱۹۷) ان کے رفقاء نے بھی تحریک کو قوت پہنچانے کے لئے تصنیف و تالیف کو پوری اہمیت دی۔ چنانچہ مولانا شاہ اسماعیلؒ کی ''تقویۃ الایمان''، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی ''در منثور''، مولانا سید جعفر نقوی کی ''منظورۃ السعداء''، مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی کی ''تذکرہ صادقہ''، جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' اور ''کالا پانی'' اور نواب وزیر الدولہ کی نگرانی میں تیاری کرائی گئی ''وقائع احمدی''۔ یہ صرف چند نام ہیں جو سید صاحبؒ کے رفقاء کی کتابوں کی طویل فہرست سے یہاں مثال کے طور پر دیے گئے ہیں۔ حیدر علی رامپوری لکھتے ہیں کہ دعوتی مقاصد کے لئے جہاں سید صاحبؒ کے خلفاء اور ذمہ دار رفقاء نے وعظ نصیحت کے طریقے کو اپنایا، وہیں ''بعضوں نے آیات قرآنی و احادیث صحیحہ کی کتابیں لکھیں اور رسالے اور ترجمے شائع کیے کہ جس میں ترغیب عبادات اور ترہیب گناہ ہی سے اپنے ملک کی زبان میں پیشہ اپنا کر ہزاروں جہلاء کو کہ سیدھا کلمہ بھی پڑھنا نہیں جانتے تھے، عالم بنادیا''۔ (۱۹۸) یہ کتابیں ان مراکز کے ذریعہ

---

(۱۹۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ (۱۹۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۳۹۔ ۸۴۰۔

(۱۹۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۰۔

جنہیں مجاہدین نے پورے ہندوستان میں قائم کر رکھا تھا، بڑی تعداد میں پھیلائی جاتی تھیں۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ کی "تقویۃ الایمان" اور "تذکرۃ الاخوان"، سید اولاد علی قنوجی کی مختصر تصنیفات اور مولانا ولایت علی، مولانا خرم علی بلہوری، مولانا عنایت علی اور دسیوں دوسرے تحریک کے ذمہ داروں کے رسالے بھی چھاپے جاتے تھے اور کم قیمت پر لوگوں کو دستیاب کرائے جاتے تھے۔ (۱۹۹)

سوم، سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد تحریک کے اکابرین نے تحریک کے مقاصد کے پیش نظر پرنٹنگ پریس بھی قائم کیے۔ مثلاً سید عبداللہ سرام پوری نے، جو سید صاحبؒ کے مرید تھے، سرام پور میں ایک چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) قائم کیا جس سے بہت سی اہم کتابیں چھپ کر سامنے آئیں۔ انہوں نے شاہ عبدالقادرؒ کا قرآن مجید کا ترجمہ بھی سب سے پہلے اسی پریس سے شائع کیا۔ (۲۰۰) اسی طرح بردوان کے مولوی بدیع الزماں نے، جو مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے خلیفہ تھے، ایک پریس خریدا اور اس تحریک سے متعلق دعوتی کتابیں شائع کیں۔ (۲۰۱) یہ پہلا پریس تھا جو دعوتی مقاصد کے لئے غیر منقسم ہندوستان میں قائم کیا گیا تھا۔ اس طرح مجاہدین نے اپنے مشنری لٹریچر کا بھی انتظام کیا اور اس کی اشاعت کا بھی۔ (۲۰۲) مہر لکھتے ہیں: "جا بجا چھاپے خانے قائم کر دیئے گئے تھے جن میں اس قسم کی کتابیں متواتر چھاپی جاتیں اور دو دو، چار چار پیسے میں مل جاتیں۔" (۲۰۳)

چہارم، سید صاحبؒ نے اپنے مشن میں خط نویسی کو بھی ایک ذریعہ کے طور پر اختیار فرمایا۔ یہ خطوط علاقے کے خوانین اور سرداران کو بھی لکھے جاتے تھے اور سیدوں اور علماء کرام کو بھی، سرحد اور اس کے اطراف میں بھی بھیجے جاتے تھے اور ہندوستان بھی، اور ان میں تحریک کے اغراض و مقاصد کی تشریح کی جاتی تھی۔ سید صاحبؒ کے خطوط اب کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ برٹش میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق، سید صاحبؒ کے سارے خطوط اب موجود نہیں، ان میں سے کچھ ضائع بھی ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وہ سرحد کے ایسے تیرہ (۱۳) حکمران اور اور بتیس (۳۲) خوانین اور سرداروں کے نام جمع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جنہیں سید صاحبؒ نے دعوتی خطوط لکھے تھے۔ اس فہرست میں انہوں نے ان علماء، والیان ریاست اور رفقاء کے نام شامل نہیں کیے ہیں جنہیں سید صاحبؒ نے ہندوستان خطوط لکھے

---

(۱۹۹) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۳۴۔۴۳۵۔
(۲۰۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۹۷۔۳۰۱۔
(۲۰۱) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۱۷۔
(۲۰۲) آبادشاہ پوری، سید بادشاہ کا قافلہ، ۱۲۲ اور ۱۳۶۔
(۲۰۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۳۴۔۴۳۵۔

تھے۔ سرحد کے بہت سارے لوگوں کا نام بھی مہر کو نہیں مل سکا جنہیں سید صاحبؒ نے خطوط بھیجے تھے۔ وہ شہادت دیتے ہیں کہ "مملکت سندھ سے سرحد کشمیر تک پورے علاقے کا ایک بھی قابل ذکر فرد نہ تھا جس کے کان تک سید صاحبؒ نے دین کی پکار نہ پہنچائی ہو"۔ (۲۰۴)

پنجم، مجاہدین نے اپنے مشن کو منظم طریقے سے چلانے کے لئے پورے ہندوستان میں مختلف مقامات پر اپنے مراکز بھی قائم کئے تھے جو تحریک کو مختلف طریقوں سے تقویت پہنچاتے تھے۔ یہ مراکز چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی قائم کردیئے گئے تھے۔ بعض بڑے گاؤں میں دو مراکز ہوا کرتے تھے۔ بڑے مراکز صوبائی سطح پر قائم تھے۔ ایک شہر میں کئی مراکز ہوتے تھے۔ ایک وقت میں صرف حیدرآباد شہر میں مجاہدین کے چودہ (۱۴) مراکز تھے جو مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے خلفاء کی نگرانی میں چلائے جاتے تھے۔ (۲۰۵) ان مراکز میں باہمی رابطہ تھا۔

ششم، مجاہدین کی دعوتی سرگرمیوں میں مساجد کو بھی بہت اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے نئی مساجد بنوائیں اور پرانی مساجد کو متحرک اور فعال بنایا تاکہ مسلمانوں کو باجماعت نماز کی ترغیب دی جاسکے۔ انہوں نے مساجد میں ایسے امام مقرر کئے جو مقامی مسلمانوں کو دین کی ضروری تعلیم دیتے تھے، وعظ و تلقین کا کام بھی سنبھالتے تھے، اور مسلمانوں کے آپسی تنازعات کو بھی حل کرتے تھے۔ ان مساجد کا انتظام انہیں مجاہدین کے ذمہ ہوتا تھا۔ (۲۰۶)

سید صاحبؒ کی دعوت کا وسیع دائرہ

سید صاحبؒ نے دعوتی مقاصد کے پیش نظر بہت وسیع اور عریض علاقے کا دورہ کیا جس میں ان کے قیام دہلی اور رائے بریلی کے دوران کے اسفار، سفر حج میں راستے میں پڑنے والے علاقے اور سرحد کے سفر اور قیام کے دوران وہاں کے وسیع علاقے شامل ہیں۔ ان سب موقعوں پر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی اور اسلامی تعلیمات کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ جہاں وہ خود نہیں جاسکے، انہوں نے اپنے خلفاء اور دوسرے ذمہ دار احباب کو بھیجا۔ اس طرح مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شہادت کے مطابق "ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوٹا جہاں آپ کا فیض نہ پہنچا ہو"۔ (۲۰۷) مندرجہ ذیل تفاصیل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

---

(۲۰۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۳۔۲۰۶۔

(۲۰۵) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۶۹، ۱۷۰ اور ۴۳۴۔۴۳۵۔

(۲۰۶) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۳۴۔۴۳۵۔

(۲۰۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۹۔

سید صاحبؒ نے مولانا سید محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو حیدر آباد، دکن اور پھر بمبئی اور مدراس بھیجا جہاں لاکھوں لوگوں نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی۔ (۲۰۸) بنگال میں مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے سید صاحبؒ کی دعوت کو متعارف کرایا۔ (۲۰۹) پھر مولانا کرامت علی جونپوری بنگال بھیجے گئے۔ انہوں نے بنگال اور آسام کے وسیع علاقے میں نہایت کامیابی کے ساتھ شرک وبدعت کی بیخ کنی کی اور توحید وسنت کی آبیاری کا فریضہ انجام دیا۔ (۲۱۰) مولانا سید اولاد حسن قنوجی کو صوبہ اتر پردیش تبلیغ کی خاطر بھیجا گیا۔ (۲۱۱) مولانا جعفر علی نے نیپال میں دعوتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ افغانستان میں سید صاحبؒ کے خلیفہ حبیب اللہ قندھاری نے دعوت کا کام کیا اور ان کے خلیفہ عبداللہ غزنوی نے پنجاب میں دعوت کے کام کو نہایت کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا۔ مولوی محمد قاسم تبلیغ دین کے لئے بمبئی بھیجے گئے۔ حافظ قطب الدین کو بھی اشاعت دین کے لئے سید صاحبؒ نے سرحد سے ہندوستان روانہ کیا۔ سید حمید الدین، جو سید صاحبؒ کے بھانجہ اور سید ابوالقاسم، جو سید صاحبؒ کے نواسہ تھے، بھی سرحد سے اشاعت دین کی ذمہ داری پر ہندوستان بھیجے گئے۔ (۲۱۲) مہاجر کے سید مردان علی شاہ کو بھی سید صاحبؒ نے جہاد کی تبلیغ کے لئے ذمہ دار بنایا تھا۔ (۲۱۳) سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے شاہ محمد حسین کو بہار میں تموہیا کی جامع مسجد کا امام مقرر کیا اور انہیں چھپرہ، مظفر پور، ترہٹ، پٹنہ اور ان کے اطراف میں دعوتی کام کے لئے ذمہ دار مقرر کیا۔ انہوں نے زین العابدین حیدر آبادی کو الہ آباد اور محمد عباس حیدر آبادی کو اڑیسہ دعوت کا ذمہ دار بنا کر بھیجا۔ (۲۱۴) مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں، بلاشبہ "ایک بڑا انقلاب وہ دینی فضا تھی جو اس دعوت وتحریک کے زیر اثر، امام جماعت (سید احمد شہیدؒ) اور اس کے باخدا وصاحب علم وتاثیر رفقاء کے دوروں اور وعظ وارشاد سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔" (۲۱۵)

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سید صاحبؒ کا پیغام ہندوستان کی سرحد سے گزر کر بیرونی

---

(۲۰۸) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۶۹۔۱۷۰ اور ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۴۶۔

(۲۰۹) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۱۸۔

(۲۱۰) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۱۷، ۱۱۸۔

(۲۱۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۵۵۔

(۲۱۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۰۔

(۲۱۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۷۱۔

(۲۱۴) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۴۶۔۴۷۔

(۲۱۵) ندوی، تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۴۲۔

ممالک تک بھی پہنچا۔ تبت میں سید صاحبؒ نے تبت کے ہی چند افراد کو دعوت کے لئے مامور فرمایا۔ ان میں ایک خاتون بھی تھیں۔ ان لوگوں نے سید صاحبؒ کی دعوت کو چین تک پہنچایا۔ جاوا، بلغاریہ اور مراکش کے کئی لوگوں نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنے اپنے ملک میں توحید وسنت کی تبلیغ وترویج کا ذریعہ بنے۔ سید صاحبؒ کے سفر حج کے درمیان ان سے پیگو، برما کے ایک سونے کے تاجر سید حمزہ نے ملاقات کی اور بیعت ہوئے۔ انہوں نے برما میں سید صاحبؒ کی دعوت کا تعارف کرایا۔ (۲۱۶) سید صاحبؒ کی دعوتی کوششوں کے وسیع اثرات کی شہادت دیتے ہوئے مولوی عبد الاحد لکھتے ہیں: ''حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔'' (۲۱۷)

۶۔ جہاد

سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کو سمجھنے کے لئے اسے ان حالات کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو ہندوستان میں دینی، معاشی اور سیاسی طور پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور پنجاب میں سکھوں کی جابرانہ پالیسی کی وجہ سے درپیش تھے۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جہاد کا اصل مفہوم واضح کیا جائے اور اس بات پر بھی گفتگو کی جائے کہ سید صاحبؒ کا تصورِ جہاد کیا تھا اور ان کی تحریک جہاد میں اصل زور کن باتوں پر تھا۔

جہاد کی تعریف

غلام رسول مہر، جو سید صاحبؒ کے ایک انتہائی معتمد اور متوازن سوانح نگار ہیں، سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کو سمجھنے کے مقصد سے جہاد کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اصطلاح شریعت میں جہاد کی تعریف یہ ہے: استفراق الواسع فی مدافعة العدو ظاهرا و باطنا۔ دشمن کے حملے کے روک تھام کے لئے اپنی پوری قوت وطاقت کے ساتھ ظاہراً وباطناً بے دریغ سعی کرنا۔ ظاہراً یہ کہ دشمن لشکر لیکر چڑھ آئے تو شمشیر بکف ہو کر اس کی مدافعت میں لگ جانا ـــــ باطناً یہ کہ اپنے نفس کو تمام ابلیسی قوتوں کی فسوں سازیوں

(۲۱۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۱۱۔ (۲۱۷) ندوی، ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۶۰۔

اور معصیت وعدوان کی زیاں کاریوں سے بچائے رکھنا۔ (۲۱۸)

یہ بات اہمیت کے ساتھ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جہاد میں ہر وہ پر امن کوشش شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی خاطر کی جائے۔ اسلام اپنے حق میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت بہت سخت شرائط کے ساتھ دیتا ہے اور اسے قتال کہا جاتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

جہاد صرف جنگ وقتال ہی پر (جو ضرورت کے وقت جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم اور افضل ترین مظہر ہے) منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کوشش جو اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کے غلبہ کی خاطر کی جائے، جہاد ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے، 'سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ یا ظالم حکمران کے سامنے حق وانصاف کی بات کہی جائے'۔ (۲۱۹)

جہاد میں سید صاحبؒ کا نصب العین

جنگ کے لئے ہتھیار اٹھانا اور قتال سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کا اولین مقصد نہیں تھا، بلکہ ان کی ساری جدوجہد کے پیچھے اصل مقصد تھا: مسلمانوں کو اخلاص کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لینے کے لئے تیار کرنا۔ غلام رسول مہر نہایت تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

یہاں سب سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہئے جس میں بعض اصحاب نیک نیتی سے مبتلا ہوئے۔ اس کا سرچشمہ (ولیم) ہنٹر جیسے متعصب، حق ناشناس اور خدا ناترس انگریزوں کی مسلسل اور متواتر غلط بیانیاں تھیں۔ یعنی سمجھ لیا گیا تھا کہ جماعت مجاہدین کے داعی عوام کو رات دن جہاد بالسیف کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ جہاں جاتے ہیں ان کا خاص مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو بہ لطائف الحیل عساکر مجاہدین میں بھرتی کر کے سرحد پہنچا دیں جہاں سے مراجعت بوجوہ بہت دشوار تھی۔ حقیقت حال پر نظر رکھی جائے تو داعیوں کا اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو دین حقہ کا پابند بنائیں۔ ان کی زندگیاں شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچاتے رہیں اور جو عقیدے یا اعمال یا رسمیں خلاف اصول اسلام ہوں، انہیں ترک کرا دیں۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ جہاد اسی طرح ایک اہم اسلامی حکم ہے جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا دوسرے اسلامی احکام ہیں۔ (۲۲۰)

سید صاحبؒ خود جہاد سے کیا مفہوم لیتے تھے؟ یہ بات مولانا محبوب علی دہلوی اور مولانا محمد

---

(۲۱۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۳۴-۲۳۵۔ (۲۱۹) ندوی، دستور حیات، ۱۵۹۔

(۲۲۰) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۳۱۔

حسن کے ایک مکالمہ کی روشنی میں کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا محبوب علی دہلی سے جہاد میں شرکت کی نیت سے سرحد آئے تھے لیکن انہیں وہاں یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ ان دنوں مجاہدین غیر مسلموں سے کسی جنگ میں مشغول نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے برملا اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ سرحد میں ان دنوں غیر مسلموں سے کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی، اس لئے حقیقتاً وہاں کوئی جہاد نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی باتوں سے مجاہدین میں غلط فہمی پیدا ہونے لگی، اس لئے ایک دن سید صاحبؒ کے ایک معتمد ساتھی مولانا محمد حسن نے سید صاحبؒ کی طرف سے سب کی موجودگی میں ان سے بات کی۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اس مجلس میں سید صاحبؒ خود موجود تھے اس لئے مولوی محمد حسن کے الفاظ کو سید صاحبؒ کی ترجمانی سمجھا جائے گا۔ یوں بھی سید جعفر علی نقوی کے الفاظ میں ''مولانا محمد اسماعیل و مولوی محمد حسن رامپوری کی حیثیت سید صاحبؒ کے وزیروں کی تھی۔'' مولوی محمد حسن رامپوری نے مولانا محبوب علی دہلوی کے سامنے ان الفاظ میں اپنا موقف ظاہر کیا:

> جنگ کا نام ہی جہاد نہیں ہے۔ جنگ قتال کو کہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی پیش آتا ہے۔ جہاد کے معنی ہیں ''اعلاء کلمۃ اللہ میں کوشش کرنا'' یہ مدت دراز تک باقی رہتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ قتال کا نام جہاد رکھا ہے اور ان کوششوں کو جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لوگ کر رہے ہیں، عبث قرار دیتے ہیں۔(۲۲۱)

درحقیقت جہاد اسلام میں ایک انتہائی ذمہ دارانہ عمل ہے اور بدلہ لینے، مال حاصل کرنے یا نجی حکومت قائم کرنے کی خاطر غیر مسلموں سے لڑی جانے والی کوئی جنگ جہاد نہیں کہی جاسکتی۔ یہ جنگ ''ظلم'' کے خلاف ہی لڑی جاسکتی ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء و خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے ناانصافی اور ظلم کو ختم کرکے عدل و انصاف قائم کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیں سید صاحبؒ کے یہاں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ہم نے محض اللہ کے لئے علم جہاد بلند کیا ہے۔ ہم مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست، حکومت و سیاست کی طلب و آرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔ خدا کے سوا ہمارا اور کوئی مطلوب نہیں۔''(۲۲۲)
سید صاحبؒ کے نزدیک جہاد ظلم و استحصال کو توڑنے اور انصاف اور امن قائم کرنے کا ایک فطری اور مضبوط ذریعہ تھا جسے حتیٰ الامکان پرامن طور پر اور اصولوں کے مطابق برتنا تھا۔ یہی اسلام کی تعلیم تھی اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ لیکن جب ان پر جنگ تھوپ دی گئی اور انہوں نے دیکھ لیا کہ وقت کا

(۲۲۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۵۔۵۶۔ (۲۲۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۸۷۔

تقاضہ جہاد بالسیف کا تھا تو پھر انہوں نے اس تقاضے کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس راہ میں حوصلہ وجواں مردی، ایمان ویقین اور اخلاص و پاک نفسی کی ایسی مثال پیش کی جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

جہاد میں سید صاحبؒ کا اصل حریف

سید صاحبؒ پہلے سکھوں سے اس لئے ٹکرائے کہ پنجاب میں مسلمان، سکھ حکومت کی پالیسی کے تحت ظلم وستم کے انتہائی صبر آزما حالات سے گزر رہے تھے اور اس صورت حال کا تقاضہ تھا کہ فوری طور پر مسلمانان پنجاب کی دادرسی کی جائے۔ لیکن پنجاب کے مسئلہ کو حل کرنے اور سرحد میں اسلامی ماحول ومزاج پیدا کرنے کے بعد وہ ہندوستان کا رخ کرنا چاہتے تھے تا کہ وہاں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے لوہا لے سکیں۔ وہ ایک موقعہ پر واضح الفاظ میں فرماتے ہیں: ''پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تا کہ وہاں سے اہل کفر وطغیان کو ختم کیا جا سکے۔ اور میرا اصل مقصد ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کروں''۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ''ہندوستان پر جہاد'' سے سید صاحبؒ کی مراد وہاں انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جہاد ہے جن کی سیاسی قوت کے سامنے اس وقت ہندوستان کے سارے مقامی اہل اقتدار بے بس ہو چکے تھے۔ مہر خود بھی اسی صفحہ پر ان الفاظ میں اس کی تشریح کر دیتے ہیں: ''سید صاحبؒ اور ان کے عام نیازمندوں کے نزدیک تطہیر ہند کے سلسلے میں مرکزی حیثیت انگریزوں کو ہی حاصل تھی''۔ (۲۲۳)

مہر دوسری جگہ بھی اس حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

> سید صاحبؒ کے نزدیک جہاد کا پہلا ہدف انگریز تھے جو ہندوستان کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ سکھوں سے بھی جہاد ضروری تھا، لیکن وہ انگریزوں سے پہلے نہیں آتے تھے۔ ان سے آغاز جہاد اس لئے ہوا کہ سید صاحبؒ نے جو مرکز تجویز فرمایا، اس میں سکھ سب سے پیشتر سامنے آ گئے۔ (۲۲۴)

لیکن اگر ہم اس بات کا یقین کہ سید صاحبؒ کے جہاد بالسیف کا اصل ہدف انگریز تھے، خود سید صاحبؒ کے الفاظ کی بنیاد پر کرنا چاہیں تو ان کی تحریر وتقریر میں اس کے حق میں ان کے بیانات نہایت واضح ہیں۔ وہ راجہ ہندو راؤ وزیر اعظم ریاست گوالیار کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

---

(۲۲۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۷۔ (۲۲۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۳۲۔

وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے بادشاہ بن گئے۔ جو تاجر سامان بیچ رہے تھے، انہوں نے سلطنت قائم کرلی۔ بڑے بڑے امیروں کی امارتیں اور رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی عزت اور ان کا اعتبار چھن گیا۔ جو لوگ ریاست وسیاست کے مالک تھے، وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے۔ آخر فقیروں میں تھوڑے سے آدمیوں نے کمر ہمت باندھی۔ ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے دین کی خدمت کے لئے اٹھا ہے۔

مہر اس اقتباس کی وضاحت کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "دور سے آئے ہوئے غیر کون تھے جو تجارت کرتے کرتے سلطنت کے مالک بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ صرف انگریز تھے اور انہیں کے خلاف جنگ کے لئے سید صاحبؒ خود اٹھے تھے، اسی غرض سے رؤساء وعوام ہند کو اٹھانا چاہتے تھے"۔ (۲۲۵)

جہاد کی سنت کے احیاء کے لئے اختیار کئے گئے تدابیر

جب سید صاحبؒ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اس وقت مسلمانوں کی حفاظت اور اسلامی احکام کی حرمت وتقدس کی حمایت کے پیش نظر جہاد بالسیف وقت کا ایک دینی تقاضہ بن گیا تھا تو انہوں نے اس کو قائم کرنے کی پوری فکر اور کوشش کی اور اس سلسلے میں بڑے عزم وحوصلہ سے کام لیا۔ مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لئے آپ ہتھیار زیب تن فرماتے (جو اس وقت کے مشائخ کے چلن کے خلاف تھا)، ہتھیار خریدتے، اور گھنٹوں جسمانی کسرت اور ورزش کرتے۔ انہوں نے اپنے رفقاء کو بھی زاہدانہ طرز زندگی اور صوفیانہ مشاغل میں غلو سے بچتے ہوئے فنون سپہ گری میں مہارت حاصل کرنے کی ہدایت دی تاکہ وہ جہاد کی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ انہوں نے پیراکی، تیراندازی، شمشیرزنی، گھوڑسواری اور دوسرے فنون میں وہ مہارت حاصل کی جو ان فنون کے اساتذہ کے لئے بھی باعث رشک تھی۔ وہ اپنے رفقاء اور عام مسلمانوں کے سامنے جہاد کی فضیلت بیان فرماتے، ان کے دلوں میں اس عمل کے لئے شوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اور مضبوط اور طاقتور مسلمانوں سے مل کر خوش ہوتے۔ انہوں نے سفر حج میں عقبہ کے مقام پر اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی جہاں مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ (۲۲۶) اسی طرح انہوں نے سنت پر عمل کی نیت سے حدیبیہ میں بھی اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی کہ

---

(۲۲۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۵۔ (۲۲۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۵۸۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کی خبر سن کر ان کے خون ناحق کا بدلہ لینے کے لئے بیعت جہاد لی تھی۔ (۲۲۷)

سید صاحبؒ نے لمبے لمبے اسفار کیئے اور وہ جہاں بھی گئے، یہ بات لوگوں میں پھیل گئی کہ انہوں نے جہاد کا بارگراں اٹھانے کا عزم فرمالیا ہے۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر لوگوں کے دلوں میں بھی جہاد کا شوق موجزن ہوگیا۔ سفر حج میں جب وہ الہ آباد میں قیام پذیر ہوئے تو ان کے میزبان شیخ غلام علی، رئیس الہ آباد روزانہ ایک بار سے زیادہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ہر بار کوئی بیش قیمت ہتھیار پیش کرتے۔ جب سید صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ حج سے واپسی کے بعد وہ ان سے ہتھیار لے لیں گے تو شیخ غلام علی نے عرض کیا: ''اول تو مجھ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کہاں جہاد کریں گے، اس ملک میں یا کسی اور ملک میں۔ پھر مجھ کو خود اپنی زندگی کا بھروسہ بھی نہیں۔ اگر میں مر گیا تو میری آرزو باقی رہ جائے گی۔ آپ اس کو لے جائیں۔ پھر آپ کو اختیار ہے، جہاں چاہیں وہاں رکھ دیں''۔ (۲۲۸) اسی سفر میں الہ آباد کے قلعہ میں مقیم مسلمان سپاہیوں نے سید صاحبؒ کی دعوت کی اور ان کی خدمت میں کھانے کے بعد کئی قسم کے ہتھیار ہدیتاً پیش کیے۔ اسی طرح عظیم آباد، پٹنہ میں نواب قطب الدین خان نے سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی دعوت کی اور ان کی خدمت میں ایک بیش قیمت تلوار، ایک ڈھال، ایک پستول، ایک بندوق، دو کمان اور دو ترکش پیش کیے۔ (۲۲۹)

جہاں سید صاحبؒ خود نہیں جا سکے یا اپنے کسی معتمد ساتھی کو نہیں بھیج سکے وہاں انہوں نے اس علاقے کے ذی اثر حضرات کو خطوط لکھ کر ان تک اپنی تحریکِ جہاد کی آواز پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ کس قوت کے ساتھ جہاد کی دعوت کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کر رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اصل کام کا وقت آپہنچا ــــــ اب ہر سچے مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس ذرائع سے خالی انسان (سید صاحبؒ) کے پاس آجائیں، چاہے جیسے بھی ممکن ہو اور مجاہدین کی جماعت میں شامل ہو جائیں ــــــ جو شخص اس مقصد کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرے گا وہ ہمیشہ کی رحمت میں داخل ہوگا۔ لیکن جو آج اس سے اعراض کرے گا وہ یوم آخرت میں دکھ اور افسوس سے ہم کنار ہوگا۔ (۲۳۰)

---

(۲۲۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۵۸۔ (۲۲۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۷۴۔

(۲۲۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۰۴۔

(۲۳۰) محی الدین احمد، ۱۱۷۔ انگریزی سے اردو ترجمہ راقم الحروف کا ہے۔

جہاد کے کام کو تقویت پہنچانے اور منظم کرنے کے لئے سید صاحبؒ نے جن دوسرے ذرائع کا استعمال کیا جیسے مراکز کا قیام اور مشنری لٹریچر کی تیاری، ان کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔

سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کی خصوصیات

سید صاحبؒ کی تحریک جہاد ہندوستان میں اس مقصد سے کی گئی دوسری ساری کوششوں کے مقابلے میں اس طرح منفردانہ حیثیت کی حامل ہے کہ سید صاحبؒ نے ہندوستان میں پہلی بار جہاد مکمل طور پر شرعی اصولوں کے مطابق قائم کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: ''چند غیر معروف مستثنیات کی گنجائش رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی جہاد اس سرزمین (ہندوستان) پر صرف ایک مرتبہ ہی ہوا تھا اور یہ وہ جہاد تھا جس کے امیر حضرت سید احمد بریلوی اور سپہ سالار حضرت شاہ اسماعیلؒ تھے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں:

> جنگ و صلح دونوں حالت میں شریعت کے قوانین سے ذرہ برابر تجاوز نہ کیا اور جہاں ان کو حکمرانی کا موقعہ ملا وہاں بالکل خلفاء راشدین کے طرز کی حکومت کی۔۔۔۔۔۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا کی میزان میں ہندی مسلم قوم کے دوازدہ صد سالہ کارنامے میں سے جتنا حصہ خیر کے پلڑے میں رکھے جانے کے قابل ہوگا اس کا سب سے زیادہ وزنی جزو یہی ہوگا۔ (۴۳۱)

سید صاحبؒ نے جہاد کی جن سنتوں کو زندہ کیا، ان میں سے صرف چند کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

اولاً سید صاحبؒ نے اپنی تحریک میں ہجرت پر، جو جہاد کی ایک اہم سنت ہے، عمل کیا اور اسے زندہ فرمایا۔ انہوں نے ہندوستان سے جہاں مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے لئے دین پر عمل کرنے میں رکاوٹیں پیدا کی جارہی تھیں، سرحد ہجرت کی جہاں مسلمان اکثریت میں آباد تھے، دین پر چلنے کے لئے آزادانہ ماحول تھا، اور وہاں پاؤں جما کر احیاء اسلام کے لئے ایک منظم

---

(۴۳۱) ابوالاعلیٰ مودودی ''دیباچہ'' ۱۹-۲۰، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مرتبہ عبداللہ بٹ۔ یہ کتاب جو مختلف مصنفین کے مضامین پر مشتمل ہے اور ہندوستان کی آزادی سے پہلے مرتب کی گئی تھی، ان بالکل ابتدائی کتابوں میں سے ہے جو اس تحریک پر انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے سے کچھ قبل تیار کی گئی تھی۔ صحیح مواد کی عدم حصولیابی کی وجہ سے اس میں بعض واضح خامیاں اور بڑی غلطیاں ہیں جو بعد کی تحقیقات کی روشنی میں صاف ہوگئی ہیں۔

جدوجہد کا آغاز کرنے کا موقعہ تھا۔

دوم، سید صاحبؒ اور مجاہدین نے ہندوستان میں سب سے پہلے ایک شرعی امام کے ماتحت جہاد ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ سید صاحب کی نگاہ میں جہاد انصاف قائم کرنے اور ناانصافی کی طاقتوں کو زیر کرنے کا ایک ذریعہ تھا، اس لئے ضروری تھا کہ جہاد اسلامی اصولوں اور قوانین کی پوری پابندی کے ساتھ قائم کیا جائے۔ یہ بات اسی صورت میں ممکن تھی جب جہاد میں شریک ہونے والا ہر شخص ایک منتخب سربراہ کو جوابدہ ہوتا جسے اسلام کی اصطلاح میں ''امام'' کہا جاتا ہے۔ جب اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا تو علاقے کے خوانین، علماء اور عوام نے سید صاحبؒ کو متفقہ طور پر اپنا امام منتخب کرلیا۔ اس طرح نہ صرف جہاد کے شعبہ میں نظم ونسق قائم کرنے کا موقعہ ملا، بلکہ جہاد کی ایک اہم سنت ۔۔ جہاد کو ایک شرعی امام کے ماتحت چلانا ۔۔ زندہ ہوئی۔

سوم، سید صاحب اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دل سے جنگ پر امن کو ترجیح دیتے تھے اور جنگ کے لئے اسی صورت میں تیار ہوتے تھے جب پر امن مصالحت کی ہر کوشش ناکام ہوجاتی تھی۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف ان کے جارحانہ اقدام اور مسلمانوں پر مظالم کے پیش نظر اور مصالحت کی کوشش سے مایوسی کی حالت میں ہتھیار اٹھایا۔ ان کی سکھوں سے پہلی جنگ اکوڑہ میں اس پس منظر میں ہوئی کہ سکھ مسلمانوں پر چڑھ آئے تھے۔ اسی طرح انہوں نے خادی خان، یار محمد خان اور پائندہ خان کے خلاف اس وقت جنگ لڑی جب پر امن مصالحت کی ہر ممکن کوشش ناکام ہوگئی۔ جنگ زیدہ سے ایک رات قبل جب مجاہدین نے یار محمد خان کی فوج پر شبخون مارنے کی اجازت چاہی تو سید صاحبؒ کا جواب تھا: ''صلح کا پیغام درمیان میں ہے۔ میں چھاپہ مارنے کی اجازت کس طرح دے سکتا ہوں؟ یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں''۔ (۲۳۲)

چہارم، سید صاحبؒ نے جہاد کو اسلامی شریعت کی روشنی میں ایک ایسے مثبت عمل کے طور پر پیش کیا جس میں پوری انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کا راز مضمر تھا۔ چونکہ جہاد کا اصل مقصود ظلم وناانصافی کو شکست دینا اور اللہ کے حکم کے مطابق بے لاگ انصاف قائم کرنا تھا، اس لئے اس کے نتیجے کے طور پر ہر انسان کو، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، حفاظت، عزت اور آزادی کا پورا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔ سید صاحبؒ نے اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں جہاد کی برکتوں پر مفصل گفتگو فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جس طرح سے بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بکثرت فوائد

---

(۲۳۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۱۴۳۔

پہنچتے ہیں، اسی طرح جہاد سے عامۂ خلائق کو نفع پہنچتا ہے"۔ (۲۴۳) وہ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اپنی جدوجہد میں کامیابی کے بعد وہ حکومت کی ذمہ داری مناسب لوگوں کو اس شرط کے ساتھ سونپ دیں گے کہ وہ شرع شریف کی روشنی میں سارے مقدمات کے فیصلے اس انصاف کے ساتھ کریں کہ کسی پر بھی ظلم اور ناانصافی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے، چاہے مظلوم مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ (۲۴۴)

جہاد کی مقبولیت

سید صاحبؒ کی دعوت جہاد میں ایک مقناطیسی کشش تھی جس سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ متاثر ہوا۔ جہاد کی اہمیت اس طرح لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگئی کہ ضعیف والدین اپنے جوان بیٹوں کو جہاد میں شرکت کے لئے تاکید کرتے، مائیں سوتے وقت اپنے بچوں کو ایسی لوری سناتیں: "الٰہی! مجھے بھی شہادت نصیب" اور بچے کھیلتے ہوئے ایسے اشعار پڑھا کرتے: "لبالب پیالا بھرا خون سے، فرنگی کو مارا بڑے دھوم سے۔" نوجوان بھی کھلے طور پر تحریک جہاد میں شامل ہونے کے سلسلے میں اپنے اہل خاندان اور ساتھیوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

سرحد میں جنگ کے بعد غازی مجاہدین، شہداء پر رشک کرتے اور دعاء کرتے کہ انہیں بھی شہادت نصیب ہو۔ اس وقت پورا ہندوستان جہاد کی صدائے بازگشت سے گونج رہا تھا اور اس پکار میں ایسی تاثیر تھی کہ بقول ولیم ہنٹر، کوئی باپ جس کے جوان بیٹے میں تقویٰ کے آثار نمایاں ہوتے، یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا گھر سے کب اچانک غائب ہو جائے گا۔ (۲۴۵)

یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ جہاد کے لئے جوش وجذبہ صرف نوجوانوں اور عام مسلمانوں میں ہی نہیں تھا، بلکہ علماء، والیان ریاست اور سماج کے دوسرے ممتاز لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ جگہ کی کمی وجہ سے نیچے صرف چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

سفر حج میں جب قافلہ غازی آباد پہنچا تو وہاں کے نواب فرزند علی نے نہایت وسعت قلبی اور بڑے اہتمام کے ساتھ قافلۂ حج کی خدمت کی۔ پھر ایک دن وہ اپنے نوجوان بیٹے امجد کو سید صاحبؒ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور انہیں ان کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ سید صاحبؒ انہیں اپنے ساتھ سرحد لے جائیں تاکہ وہ جہاد میں شرکت کر سکیں اور شہادت سے سرفراز ہوں۔ (۲۴۶)

---

(۲۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۹۵۔
(۲۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۹۴۔
(۲۴۵) ہنٹر، ۱۱۲۔
(۲۴۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ دوم، ۳۷۲۔

جب ٹونک کے والی، نواب وزیر الدولہ کو یہ اطلاع ملی کہ سرحد میں مسلمانوں نے اتفاق رائے سے سید صاحبؒ کو امیر المومنین منتخب کرلیا ہے، تو انہوں نے فوراً سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک مکتوب روانہ کیا جس کے ذریعہ انہوں نے سید صاحبؒ سے جہاد کی بیعت کی اور لکھا کہ اگر ان کا حکم ہو تو وہ سب جاہ و مال اور سلطنت و ریاست چھوڑ کر ان کی خدمت میں سرحد حاضر ہو جائیں۔ سید صاحبؒ نے انہیں منع کیا اور انتظار کرنے کو کہا۔ (۲۳۷)

والیٔ رامپور نواب احمد علی خان نے، جو سید صاحبؒ کے ایک مخلص ارادت مند تھے، سید صاحبؒ کے سرحد میں امیر المومنین منتخب ہونے کے بعد انہیں اپنے مکتوب میں لکھا: ''میں نے سید المرسلین (ان پر اور ان کے آل پر رب العالمین کی طرف سے ہزار ہزار درود و سلام ہوں) کی سنت کے مطابق غائبانہ مولوی حیدر علی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرلی ہے جو آپ کے خلیفہ ہیں۔ اس وسیلے سے میں مجاہدین فی سبیل اللہ کے گروہ میں شامل ہوگیا ہوں۔ مناسب وقت پر بہ سر و چشم حاضر ہو جاؤں گا۔ دوست کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی ہم سر کے بل دوڑیں گے۔'' (۲۳۸)

مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، جو پٹنہ کے نہایت ذی اثر خاندان کے چشم و چراغ تھے، جماعت مجاہدین کی سربراہی کے جرم میں برٹش سرکار کے ذریعہ گرفتار کیے گئے اور انہیں عدالت نے پھانسی کی سزا دی۔ جیل میں ان کا صبر و استقلال اور وجد و سرشاری قابل دید تھی۔ وہ نہایت ذوق و شوق سے حضرت خبیبؓ، صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کی وہ مشہور رباعی پڑھا کرتے جس کے ایک شعر کا مفہوم ہے: ''جب میں اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہوں تو مجھے اس کی فکر نہیں کہ میں زمین پر کس پہلو گرتا ہوں۔'' (۲۳۹)

اردو کے معروف شاعر مومن خان مومنؔ، سید صاحبؒ کے ارادت مندوں میں سے تھے، انہوں نے سید صاحبؒ کی منقبت و محبت میں کئی نظمیں اردو اور فارسی میں لکھی ہیں جنہیں مہر نے اپنی کتاب جماعت مجاہدین میں صفحات ۱۰۰۔۱۰۲ پر جمع کر دیا ہے۔ ان کی نظموں میں ان کا سرحد حاضر ہو کر سید صاحبؒ سے ملنے کا اشتیاق صاف جھلکتا ہے۔ اپنے اردو کے ایک شعر میں وہ لکھتے ہیں:

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے
جلد مومنؔ لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تلک

---

(۲۳۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۸۸۔ (۲۳۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۶۰۔۲۶۱۔
(۲۳۹) ندوی، کاروان ایمان و عزیمت، ۵۲۔

وہ اپنے دوسرے اشعار میں سید صاحبؒ سے غایت محبت وعقیدت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا
لبوں پر دم بنا ہے جوش خوں شوق شہادت کا
نہ کر بیگانہ مہر امام اقتدا سنت
کہ انکار آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
امیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا(۲۴۰)

تاریخ سید صاحب کا نام اپنے صفحات میں اس نسبت سے محفوظ رکھے گی کہ ان کی مساعی جمیلہ نے ان کے دور میں مسلمانوں میں اللہ کے لئے سب کچھ قربان کردینے کا وہی جذبہ پیدا کردیا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سینوں میں موجزن تھا۔ یہ تاریخ اسلام کا مایہ ناز باب ہے جو مشکل سے یقین آنے والی یہ کہانی سناتا ہے کہ سید صاحبؒ نے اپنے دور کے مسلمانوں کو مایوسی اور شکست خوردگی کے گڑھے میں گرا ہوا پایا لیکن اپنی پرخلوص جدوجہد سے انہیں دوبارہ ایک ایسی باعزم اور صاحب پیغام ملت بنادیا جس کے حوصلے کے سامنے بڑا سے بڑا خطرہ راہ کی دھول اور جس کی نگاہ میں شہادت کے مقابلے میں زندگی کی ہر دلکشی بے معنی و بے حقیقت تھی۔

(۲۴۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۰۱۔

اصلاح اخلاق

سید بادشاہ کا قافلہ افکار و کردار کی مشعلیں جلائے چلا جا رہا ہے اور فضا جگمگا اٹھی ہے۔ یہ عجیب و غریب قافلہ ہے۔ اس میں شامل رہروان حق کو دیکھ کر تاریخ کا مسافر انگشت بدنداں ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اتنے بلند پایہ افراد اتنی بڑی تعداد میں اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔

آباد شاہ پوری، سید بادشاہ کا قافلہ

گذشتہ باب میں سید صاحبؒ کی ان کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے نتیجے کے طور پر اسلام کے بنیادی ارکان، جیسے ایمان، نماز، حج، دعاء، دعوت اور جہاد، زندہ ہو گئے اور مقام کمال تک پہنچے۔ جب ایمان اور یہ اعمال مسلمانوں کی زندگی کا جزو اور ان کے دل کی دھڑکن بن گئے تو فطری طور پر ان کے اخلاق میں جلا پیدا ہوئی اور ان کے اندر وہ اوصاف پیدا ہوئے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اخلاقی شان کی یاد دلاتے تھے۔ یقیناً یہ اخلاقی انقلاب جو اتنی کم مدت میں اتنے بڑے اور بلند پیمانے پر برپا ہوا، بذات خود سید صاحبؒ کی تحریک احیاء دین کی بہت بڑی کامیابی تھی جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مفہوم بھی دلالت کرتا ہے کہ میں اخلاق کے تکمیل کے لئے تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں۔ نیچے چند ایسے منتخب اخلاقی صفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو سید صاحبؒ کی جد وجہد اور کوشش سے مجاہدین اور ان کے رفقاء میں خصوصاً اور عام مسلمانوں میں عموماً پیدا ہو گئے تھے اور جن سے ان کی زندگیوں میں نورانیت اور ان کی تحریک میں للٰہیت پیدا ہو گئی تھی۔

۱۔ اخلاص

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء اخلاص و للٰہیت کے اس بلند مقام پر فائز تھے جس کی نظیر صحابۂ

کرام کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر تاریخ کے صفحات میں مشکل سے ملے گی۔ خود سالار کاروان سید صاحبؒ کا اس معاملے میں کیا حال تھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ہم محض رضائے الٰہی کے آرزومند ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں۔۔۔ اگرچہ ہم عاجز و خاکسار، ذرۂ بے مقدار ہیں، لیکن بلاشک محبت الٰہی سے سرشار اور غیر خدا کی محبت سے بالکل دستبردار ہیں۔ یہ سب کچھ محض اللہ کے لئے ہے۔ اس جذبۂ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے کا شائبہ بھی نہیں۔۔۔ میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد فقیر کے دل میں موجزن ہے، اس میں رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا عزت و جاہ و مال و دولت، شہرت و ناموری، امارت و سلطنت، برادران و معاصرین پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہرگز نہیں ہے۔ اور ہم جو بات کہہ رہے ہیں، اللہ اس پر گواہ ہے۔(۲۴۱)

سید صاحبؒ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے شرک و بدعت کے شکار اور اخلاقی امراض میں مبتلا مسلمانوں کو ایک بار پھر اخلاص وللّٰہیت کی اس بلندی پر پہنچا دیا جس سے بلند تر مقام کا تصور (قرون اولیٰ سے اتنے بُعد کے بعد) کرنا مشکل ہے۔ نیچے مجاہدین کے صرف چند ایسے واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ کے ان نیک بندوں کی نگاہیں صرف اور صرف اللہ کی رضاء و خوشنودی کی طرف لگی رہتی تھیں۔ وہ اسی حال میں جیئے اور اسی حال میں موت کو گلے لگایا۔

عبدالمجید خان آفریدی نے جہان آباد، رائے بریلی سے سید صاحبؒ کے ساتھ سرحد ہجرت کی تھی۔ جب سید صاحبؒ نے جنگ اکوڑہ سے قبل سکھ فوج پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا تو عبدالمجید خان کا انتخاب بھی اس اہم مہم کے لئے کیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کی طبیعت خاصی خراب ہوگئی اس لئے ان کا نام فہرست سے نکال دیا گیا۔ جب انہیں اس بات کی اطلاع ملی تو وہ بے چین ہوگئے اور سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''حضرت میں کچھ ایسا بیمار تو ہوں نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو۔ اور یہ پہلا معرکہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجئے تاکہ سنت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔''(۲۴۲)

جنگ مایار میں سید موسیٰ نے، جو سید صاحبؒ کے عزیز تھے، کئی کاری زخم کھائے اور گھوڑے سے گر پڑے۔ جب ایک مجاہد ان تک پہنچا تو وہ لفظ ''اللہ'' بار بار دہرا رہے تھے۔ جب اس نے

---

(۲۴۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۴۸۷۔ (۲۴۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۳۱-۲۳۲۔

انہیں میدان جنگ سے اٹھا کر خیمے تک پہنچانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس سے دریافت کیا: "تم کون ہو؟ جنگ میں کسے فتح نصیب ہوئی؟" جب اس مجاہد نے انہیں بتایا کہ سید صاحبؒ فتحیاب ہوئے تو انہوں نے "الحمد للہ" کہا اور قدرے چاق سے ہو گئے۔ (۲۴۳)

جنگ مایار ہی میں کالے خان نامی ایک مجاہد بہت زخمی ہو گئے اور بے ہوش ہو کر میدان جنگ میں گر پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آئے تو فوراً ایک مجاہد سے دریافت کیا کہ جنگ کا نتیجہ کیا رہا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے سید صاحبؒ کو فتح عطا فرمائی تو انہوں نے "الحمد للہ" کہا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (۲۴۴)

اخلاص کا یہ جوہر گراں مایہ سید صاحبؒ کے صرف چند منتخب رفقاء تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی تربیت وتعلیم سے ان کی جماعت کے ہر فرد و بشر کے رگ و پے میں سما گیا تھا۔ نواب وزیرالدولہ شہادت دیتے ہیں: "خدا کی رحمت سے اس تقوی شعار سپاہ کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کی للّٰہیت کے محاسن تحریر کئے جائیں تو انہیں پورا کرنے کے لئے لا متناہی دفتر چاہیئے۔" (۲۴۵) اور یہ صرف دوستوں ہی کی شہادت نہیں، دشمنوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ ولیم ہنٹر مجاہدین کے بارے میں لکھتا ہے: "میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔" وہ آگے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے: "جہاں تک میرا تجربہ ہے، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم خود غرض، اور بے لوث ہوگا۔" (۲۴۶)

۴۔ ایثار

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کو اپنا مقصد حیات، زندگی سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اس کے

---

(۲۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۶۱۔۲۶۲۔ (۲۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۳۱۔۲۳۲۔

(۲۴۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۷۱۔

(۲۴۶) ہنٹر، ۱۰۵۔۱۰۶۔ ولیم ہنٹر اور دوسرے یوروپین مصنفین نے سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے لئے "وہابی" کی غلط اصطلاح ایجاد کی جو اس اقتباس میں بھی موجود ہے۔ وہ اس طرح سید صاحبؒ کی تحریک کو نجد کے عالم دین شیخ عبدالوہابؒ کی تحریک کی ایک شاخ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیخ عبدالوہابؒ کی تحریک "وہابی" کہلائی جو بعض وجوہات کی بناء پر ہندوستان کے عام مسلمانوں کے ذریعہ ناپسند کی جاتی تھی۔ اس طرح وہابی کی اصطلاح سید صاحبؒ کی تحریک کو ہندوستان میں غیر مقبول بنانے کی ایک سازش تھی۔

لئے ہر قربانی پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت دل سے تیار رہتے تھے۔ جب ہم ان کے واقعات پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں اس مبارک دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب صحابۂ کرام نے ایمان و دین کی بقاء کی جنگ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کی تھی۔

سید صاحبؒ کی شخصیت ایثار و قربانی کے معاملے میں بھی ان کے رفقاء کے سامنے مثالی تھی۔ وہ ہندوستان میں ایک انتہائی مقبول شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے ارادت مندوں کی تعداد لاکھوں میں تھی جن میں نواب، راجہ، روٴساء، علماء، مشائخ، اور عوام، سب ہی شامل تھے۔ لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ احیاء دین کی ضرورت کے پیش نظر انہیں سرحد ہجرت کر جانا چاہیئے تو وہ سارے رشتوں سے دامن چھڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہجرت کی راہ اختیار کی۔ سرحد پہنچ کر انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں احیاء دین کا چراغ جلائے رکھا اور جان ہتھیلی پر لئے پھرتے رہے، حتیٰ کہ بالاکوٹ کے میدان میں جان، جان آفریں کو سپرد کر کے سرخرو ہوئے۔

سید صاحبؒ ہی کی طرح ان کے اہل خاندان اور اعزہ بھی ایثار و قربانی کی راہ پر گامزن رہے۔ ان کی دونوں اہلیہ محترمہ اور کمسن صاحبزادی نے بھی ہجرت کی خاطر گھر بار چھوڑا تاکہ سرحد پہنچ کر سید صاحبؒ کی مہاجرانہ زندگی میں ان کے ساتھ ہوں۔ لیکن بعض نامساعد حالات کی وجہ سے وہ سندھ سے آگے سفر نہ کر سکیں۔ اس طرح وہ سید صاحبؒ سے اس زندگی میں پھر کبھی نہ مل سکیں۔ ان کی غیرت اسلامی کا یہ حال تھا کہ ہجرت کے لئے گھر سے قدم نکالنے کے بعد وہ پھر زندگی بھر وطن واپس نہیں ہوئیں، سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد بھی نہیں۔ سید صاحبؒ کے اعزہ سید احمد علی، سید موسیٰ، سید ابو محمد اور سید ابوالحسن نے ان کے ساتھ سرحد ہجرت کی اور سرحد ہی میں شہادت پائی۔ خاندان کے دوسرے کئی افراد نے بھی ان کے پیچھے سرحد کی طرف پیش قدمی کی، لیکن بعض مخالف حالات کی وجہ سے وہ ٹونک سے آگے سفر جاری نہ رکھ سکے۔ وہ اور جو وطن ہی میں رہے، سب نے زندگی بھر دین کی اشاعت کے لئے پوری کوشش کی اور اس راہ میں کسی بھی قربانی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ (۲۴۷)

مولانا شاہ اسماعیلؒ اور مولانا عبدالحئیؒ بڈھانویؒ کی زندگی بھی اسی ایثار و قربانی کی داستان پیش کرتی ہے۔ محمد جعفر تھانیسری اپنی کتاب سوانح احمدی میں لکھتے ہیں کہ جب ان دونوں بزرگوں

---

(۲۴۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۳۔

نے سید صاحبؒ کے ساتھ سرحد ہجرت کی تو اپنے آپ کو اس طرح مٹا دیا کہ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ انہوں نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ دونوں بزرگ آپ [سید صاحبؒ] کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنے کو فخر دارین جانتے تھے اور ان دونوں سرتاج علماء دہلی نے جن کی تعظیم بادشاہ دہلی تک کرتے تھے، اپنے تئیں بالکل مٹا دیا تھا۔ پاخانہ کماتے، چکی پیستے، دانہ دلتے، گھاس کھودتے، بوجھ اٹھاتے، سائسی کرتے، غرض کسی ذلیل سے ذلیل کام سے بھی آپ کو عار نہ تھا۔" (۲۴۸) مولانا شاہ اسماعیلؒ خود ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "ہم لوگ دنیاوی کاروبار بھی ان لوگوں سے (جو اپنی مشغولیت و ذمہ داری کا عذر بیان کرتے ہیں) سیکڑوں گنا زیادہ رکھتے تھے۔۔۔۔ ذرائع معاش ان سے کہیں بہتر رکھتے تھے اور اپنے کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ کلمہ گو مسلمانوں کے گروہ میں تھے اور حق کے طالب اور جویا تھے، جب ہم نے دیکھا کہ مالک کی مرضی اس وقت جہاد کے قائم کرنے ہی میں ہے، ان تمام بیکار مشاغل کو اللہ کی خوشی کے لئے خیر باد کہہ دیا۔" (۲۴۹) جب منشی امین الدین نے سفرحج میں مولانا شاہ اسماعیلؒ سے کلکتہ میں ملاقات کی تو انہیں یقین نہیں آیا کہ اس انتہائی معمولی لباس میں ملبوس وہی مشہور زمانہ عالم دین ہیں جن سے نیاز حاصل کرنے کا انہیں اس قدر اشتیاق تھا۔ (۲۵۰)

سید صاحبؒ کا ساتھ اختیار کرنے کے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی، جو بہار کے ایک انتہائی ممتاز اور متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے، کی طرز رہائش، صورت و شکل اور لباس میں اتنی زیادہ تبدیلی پیدا ہو گئی کہ ان کے گھر کا پرانا نوکر رائے بریلی تکیہ میں انہیں دیکھ کر پہچان نہ سکا۔ انہوں نے اللہ کے دین کی حمایت میں بے دریغ قربانیاں دیں اور اسی نسبت پر گھر سے سیکڑوں میل دور سرحد میں آسودۂ خاک ہوئے۔ یہ ایثار و قربانی صرف مولانا ولایت علی عظیم آبادی تک ہی محدود نہیں تھی، بلکہ ان کے خاندان کے سارے ہی افراد ــ غازی عنایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا یحیٰی علی، مولانا فرحت حسین، مولانا عبداللہ، مولانا عبدالرحیم اور دیگر حضرات نے انتہائی حوصلے کے ساتھ اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر وہ سب کچھ بہ خوشی قربان کر دیا جو ان کے دامن میں تھا۔ شیخ باقر علی جو اس خاندان عالیہ کے ایک فرد تھے، سرحد میں لڑی گئی جنگ کے پہلے شہید تھے۔ غازی عنایت علی نے سرحد میں وفات پائی۔ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحیٰی نے جزیرہ انڈمان میں، جسے کالا پانی

---

(۲۴۸) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۳۶۔ (۲۴۹) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۱۳۶۔

(۲۵۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۶۔

کہا جاتا تھا، انگریزوں کی قید میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ مولانا عبدالرحیم کو انگریزوں نے قید کر کے کالا پانی کی سزا دی اور وہاں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ ایک طویل مدت کے بعد جب انہیں رہائی ملی تو اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد پٹنہ مرکز کے امیر کا انتقال ہو گیا۔ ضرورت کے پیش نظر ایک بار پھر یہ ضعیف العمر مجاہد آگے بڑھا اور امارت و قیادت کی ذمہ داری قبول کر لی جسے اٹھانا اس وقت ایک دہکتے ہوئے انگارے کے ہاتھ میں لینے سے کم خطرناک نہیں تھا۔

عظیم آباد کے اس عالی ہمت خاندان کی قربانیاں پڑھنے والوں کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس خاندان کے اہم مردوں کو جزیرہ انڈمان جلاوطن کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ باقی ماندہ افراد خاندان، مردوں، عورتوں اور بچوں کو ٹھیک عید کے دن ان کے آبائی گھر سے اس طرح باہر نکال دیا کہ انہیں ایک تنکہ بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی گھر سے باہر سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ تھی۔ انگریزوں نے اس خاندان کا قدیم قبرستان بھی بلا کسی سبب کے کھود کر بے نشان کر دیا اور اس پر ایک سرکاری عمارت بنوا دی۔ وہاں ایک درخت تھا جو اس خاندان کے لئے ایک یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگریزوں نے اسے بھی کٹوا دیا تا کہ یہ خاندان بے نشان ہو جائے۔

جس طرح ہندوستان کے مراکز میں لوگ قربانی پیش کر رہے تھے اسی طرح مجاہدین نے سرحد میں بھی ایثار و قربانی کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ سیکڑوں ایسے افراد نے جن کا نام محفوظ نہیں رہ سکا اخلاص کے ساتھ جان و مال کی قربانی دے کر اس تحریک کو زندہ رکھا۔ سرحد ہجرت کرنے والے ہر مجاہد کو اس کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاید کبھی اپنے لوگوں تک واپس نہ ہو سکے گا۔ لیکن احیاء دین کے لئے کوئی بھی قربانی ان کے لئے بڑی قربانی نہیں تھی۔ سرحد میں ان کو سہولت و آرام سے کوئی کام نہ تھا۔ غلام رسول مہر، ''منظورۃ السعداء'' اور ''وقائع احمدی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ رات کے وقت مجاہدین سید صاحبؒ کے بستر کے قریب جمع ہو جاتے تا کہ آپ کی باتیں سن سکیں اور مستفید ہوں۔ پھر جب سونے کا وقت ہوتا تو سب سید صاحبؒ کے اردگرد فرش پر سو جاتے۔ کسی کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں تھی اور نہ ہی ان کے علیحدہ بستر تھے۔ وہ بے تکلفی کے ساتھ زمین پر اس طرح لیٹ جاتے کہ ایک کا پاؤں دوسرے کے سر کی جانب ہوتا۔ (۲۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے پر آشوب ماحول میں احیاء اسلام کے لئے ایثار و قربانی کی آبرو بس انہیں مجاہدین کے دم سے زندہ تھی۔ غلام رسول مہر مجاہدین کے بارے میں

(۲۵۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۷۔

شہادت دیتے ہیں: "سید صاحبؒ کی جاری کی ہوئی تحریک کے سلسلے میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی وسیع سرزمین میں احیاء اسلام اور اسلامیت کے لئے جاں بازی وجاں فشانی صرف اسی گروہ میں محدود رہ گئی تھی جو سید صاحبؒ کی آغوش فیض میں تربیت پاچکا تھا۔۔۔وہ جہاں بھی تھے اور جس حال میں بھی تھے، صرف اس نصب العین کے حصول کو تقویت پہنچانے کے لئے وقف تھے جس کا علم سید صاحبؒ نے بلند کیا تھا۔" (۲۵۲)

۴۔ استقامت

سید صاحبؒ کی للّٰہیت اور اثر انگیز صحبت کی برکت سے مجاہدین میں استقامت کی صفت بدرجۂ اتم پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی نگاہوں میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ خاص طور پر اس کے لئے اپنے رب سے دعاء مانگا کرتے تھے۔ سید صاحبؒ خود اس صفت عالیہ کی مثالی پیکر تھے۔ ان کی پوری زندگی جہد پیہم اور اس راہ میں غیر متزلزل استقامت کی کہانی سناتی ہے۔ وہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہمارے سر جسموں کے ساتھ ہیں، ہم بصد حیلہ وفن اسی سودے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے مالک کی اطاعت میں مشغول ہیں اور محض رضاء الٰہی کے آرزومند۔" (۲۵۳) سید صاحبؒ کو اس کا از حد خیال تھا کہ ان سے اس معاملے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ جب ایک مجاہد نے ان سے اپنے لئے استقامت کی دعاء کی درخواست کی تو ان کا جواب تھا: "بھائی! سچ کہتے ہو۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ اپنے نفس پر اعتماد مشکل ہے۔ پروردگار کی تائید شامل حال ہونی چاہئے۔ میرے لئے بھی دعاء کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس طریق پر قائم رکھے۔" (۲۵۴)

سید صاحبؒ اس بات کی پوری فکر رکھتے تھے کہ ان کے رفقاء میں ثابت قدمی کی صفت کمزور نہ ہونے پائے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی خوش دامن صاحبہ، جو ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ زہراء کے ساتھ ہجرت کر کے سندھ آگئی تھیں اور وہاں ٹھہری ہوئی تھیں، وطن واپس جانے کا ارادہ فرما رہی ہیں تو انہوں نے انہیں ایک مکتوب میں لکھا: "ضروری ہے کہ آپ استغفار سے کام لیں اور یہ وسوسہ نکالیں، دوسروں کے لئے تسلی اور تشفی کا باعث ہوں اور اس راستے میں ثابت قدمی اپنے اوپر واجب ولازم بنالیں۔" (۲۵۵)

---

(۲۵۲) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۶۳۔

(۲۵۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۹۳۔

(۲۵۴) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۶۷۔

(۲۵۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۷۵۔

اسی طرح مولانا شاہ اسماعیلؒ استقامت اور ثابت قدمی کی ایک روشن مثال تھے۔ وہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں: "اگر سید صاحبؒ مجھے اس مبارک لشکر سے نہایت سختی اور ذلت واہانت کے ساتھ نکال دیں اور باہر کر دیں تو بھی ہرگز ہرگز اس فرشتہ صفت فوج سے جدا نہیں ہو سکتا۔ سو تدبیروں سے پھر ان کے خدام میں داخل ہو جاؤں گا۔" (۲۵۶)

مولانا عنایت علی عظیم آبادی کی زندگی بھی عزم واستقامت کی دل چھونے والی کہانی سناتی ہے۔ جب بعض نامساعد حالات کی وجہ سے ایک زمانہ میں پٹنہ مرکز سے مالی تعاون رک گیا اور سرحد میں مجاہدین مالی بحران کا شکار ہو گئے تو سرحد میں مجاہدین کے سالار مولانا عنایت علی نے اپنی ساری ذاتی املاک فروخت کر دیں تا کہ اخراجات کا بوجھ سنبھالا جا سکے۔ جلد ہی غلہ کا ایک ایک دانہ ختم ہو گیا اور مجاہدین کا گزر بسر درخت کے پتوں اور پودوں کی نرم ڈنٹھلوں پر ہونے لگا۔ لگا تار کئی مہینے تک اناج کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ عنایت علی بیمار پڑ گئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ عبدالمجید اور عبدالمجید کی بیٹی بھی بیمار پڑ گئیں۔ ساتھ ہی مقامی قبائل نے انگریزوں کی شہ پر دشمنانہ روش اختیار کر لی۔ لیکن ان جانکاہ مصیبتوں کے سامنے مولانا عنایت علی ایک چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ بیمار اور بھوکے پیاسے، وطن سے ہزاروں میل دور انہوں نے سرحد میں موت کو لبیک کہا، لیکن اپنی کوششوں کو ترک کر کے وطن لوٹ جانے جیسا کوئی خیال کبھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکا۔ (۲۵۷)

سرحد میں مجاہدین کے خلاف خوفناک سازش اور ان کے قتل عام کے موقعہ پر عبدالعلی نامی ایک مجاہد شیوہ نامی ایک مقام پر دوسرے مجاہدین کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ اس کے ساتھ امیر علی نامی ایک مجاہد بھی تھا جس کے پاس بیت المال کا کچھ روپیہ امانت کے طور پر تھا۔ حافظ عبدالعلی نے امیر علی کو شیوہ کی سرحد تک پہنچا دیا اور پنجتار پہنچنے کی تاکید کی، لیکن وہ خود شیوہ لوٹ آیا کہ ایسے نازک موقعہ پر شیوہ میں مقیم مجاہدین کا ساتھ چھوڑ دینا ثابت قدمی اور استقلال کے خلاف تھا۔ جب مقامی باغیوں نے مجاہدین کو گھیر لیا تو ان کے ساتھیوں میں محمد رمضان نامی ایک مجاہد بھی تھا۔ شیوہ کے ایک بارسوخ شخص نے اسے اپنے گھر میں پناہ دینے کی پیشکش کی۔ لیکن اس نے بھی اپنے ساتھیوں کو خطرے میں گھرا چھوڑ کر اپنی جان بچانا بے غیرتی سمجھی اور ثابت قدم رہتے ہوئے شہادت حاصل کی۔ اسی طرح جب منگئی میں مجاہدین پر حملہ کر دیا گیا تو بونیر کا ایک نوجوان حبیب اللہ خان، جو ایک

(۲۵۶) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۳۸۔ (۲۵۷) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۸۰۔۲۸۷۔

مقامی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، مجاہدین کے ساتھ تھا۔ باغیوں نے بار بار اسے آواز دی کہ وہ مجاہدین کا ساتھ چھوڑ کر ان کی حفاظت میں آجائے لیکن ہر بار اس کا جواب تھا: "مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا میرے نزدیک ہزار درجے بہتر ہے اور تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔" (۲۵۸)

تحریک کے ایک لیڈر محمد جعفر تھانیسری کو جب انگریز حکومت نے گرفتار کر لیا تو ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تاکہ وہ تحریک کے راز انگریزوں کو بتا دیں۔ انہیں گھنٹوں اس قدر زدوکوب کیا گیا کہ انہیں لگا کہ ان کی جان چلی جائے گی۔ زندگی سے مایوس ہو کر انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ کہیں ان کے ذمہ کوئی فرض تو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ انہیں یاد آیا کہ ان کے ذمہ چند فرض روزوں کی قضا ہے۔ اس قید میں جس میں ان کی جان پر بنی تھی، انہوں نے دوسرے ہی دن سے قضا روزے رکھنا شروع کر دیا اور اس طرح دین پر استقامت اور استقلال کی ایک روشن مثال قائم کی۔ (۲۵۹)

ایک بار جب انگریز فوج مجاہدین کے مرکز ملکا کو تباہ کرنے کے ارادے سے بڑھی تو علاقے کے مسلمان قبائل، مجاہدین کے شانہ بہ شانہ انگریزوں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ان سب نے ساتھ چھوڑ دیا اور مجاہدین مورچے پر اکیلے رہ گئے۔ اب یا تو وہ بھی پسپائی اختیار کر کے جان بچاتے یا ثابت قدمی کی راہ اختیار کرتے ہوئے انگریز فوج کا مقابلہ کرتے جس سے تعداد اور ہتھیار میں ان کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ اس وقت مولانا عبداللہ عظیم آبادی ان کے امیر تھے۔ انہوں نے دو سو مجاہدین کا انتخاب کیا، انہیں دو رسالوں میں تقسیم کیا، ان کی کمان ناصر محمد اور کلیم الدین نامی دو مجاہد کو دی اور انہیں انگریزی فوج سے مقابلہ کا حکم دیا تاکہ تاکہ ان مٹھی بھر مجاہدین کو اسلام پر نثار ہوتے دیکھ کر وہ قبائل جو ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے، یا جنہوں نے دور کے تماشائی بننے کو روا رکھا تھا، یہ سوچیں کہ ان کی دون ہمتی نے مجاہدین کو کس مقام پر کھڑا کر دیا تھا۔ منتخب مجاہدین نے صدق دل سے ایک دوسرے سے غلطی معاف کرائی اور انگریزی فوج کے مقابلے میں صف آراء ہو گئے اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ ان میں سے ایک ایک مجاہد شہید نہیں ہو گیا۔ (۲۶۰)

اس طرح مجاہدین نے ایک دوسرے موقعہ پر بھی استقامت کا ثبوت دیا۔ جب انگریزی فوج نے اپنے مقامی حلیفوں کو ساتھ لے کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ مجاہدین کی پناہ گاہ ستھانہ پر حملہ کر دیا تو مجاہدین تعداد میں بہت تھوڑے تھے اور آخری وقت میں بس جدون قبیلے کی ایک چھوٹی سی

(۲۵۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۲۔
(۲۵۹) تھانیسری، کالا پانی، ۵۴۔
(۲۶۰) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۳۴۷۔

جماعت ان کے ساتھ رہ گئی تھی۔ ان کا انگریزوں کی متحدہ فوج کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے: پہاڑوں میں پناہ لے کر جان بچا لیں، یا جان ہتھیلی پر لے کر انگریزوں سے ٹکرائیں اور اپنے نصب العین کو زندہ رکھیں۔ انہوں نے دوسری راہ کا انتخاب کیا۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی اور ڈاکٹر بیلیو کے مطابق، مجاہدین کی تعداد صرف ساٹھ (۶۰) تھی۔ وہ شاہ نور لڑی نامی پہاڑی پر انگریزی فوج کے مد مقابل ہوئے۔ ان کی قیادت شاہ اکرام اللہ کر رہے تھے جو مولانا عنایت علی کے بعد مجاہدین کے ان تین سالاروں میں تھے جنہیں انتظام امارت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ان سب نے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے جیسے وہ کوئی خوشی کا موقعہ ہو۔ پورے معرکے میں انہوں نے بے مثال شجاعت اور غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا۔ ہر مجاہد شہید ہو گیا یا گرفتار لیکن جنگ کے کسی موڑ پر بھی ان کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ (۲۶۱)

در حقیقت استقلال اور استقامت مجاہدین کی پوری جماعت کی پہچان بن گئی تھی۔ جب سے انہوں نے اللہ کے راستے میں قدم نکالا، کوئی مشکل ان کی استقامت کو متزلزل نہ کر سکی۔ ذرائع سے محروم، خطرات میں محصور اور دوستوں کی بے وفائی سے شکستہ دل مجاہدین کے لئے سرحد میں ٹھہر جانا ہی جہاد سے کم نہ تھا، لیکن ان مصائب اور مشکلات کے باوجود ان کا حوصلہ کبھی کم نہ ہوا۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد جب سید جعفر علی نقوی نے شیخ حسن علی سے ہندوستان واپس ہونے کے بارے میں مشورہ کیا تو حسن علی نے جواب دیا: ''میں تو خدا کے ساتھ عہد کر چکا ہوں کہ ساری عمر جہاد میں بسر کروں گا۔ جہاد امام کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا کابل، قندھار، سندھ اور عرب میں امام کو تلاش کروں گا۔ جب امام مل جائے گا تو کسی مناسب مقام پر بیٹھ کر جہاد شروع کر دوں گا۔'' (۲۶۲)
حکومت برطانیہ نے مجاہدین کے خلاف اپنی ساری طاقت جھونک دی، لیکن وہ انہیں سرحد چھوڑ کر

---

(۲۶۱) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ مہر لکھتے ہیں: ''مجاہدین کا دستور تھا کہ جب مقابلے کے لئے مورچے قائم کر لیتے تو پھر پیٹھ پھیرنا ان کے نزدیک قرآن کی رو سے جائز نہ تھا'' (سرگزشت مجاہدین، ۲۹۶)۔ صحابہ کرام کے واقعات بھی اس کی تائید میں مل جاتے ہیں، جیسے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا رومیوں کے مقابلے میں شہادت حاصل کرنے کے شوق میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ جان دینا۔ تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں۔

(۲۶۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۱۸۔ یقیناً چند مجاہدین ہندوستان واپس ہو گئے، لیکن وہ سب بلا استثناء ساری عمر احیاء دین کی کوششوں میں مشغول رہے۔ ان کے سامنے دین کی مدد کی یہی شکل بہتر تھی اور اس میں نصب العین سے گریز کا ہرگز کوئی پہلو نہیں تھا۔

اپنے گھر واپس جانے پر مجبور نہ کر سکی۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، ۱۹۴۷ء تک مجاہدین کا سرحد میں مرکز قائم رہا۔

سید صاحبؒ کی جماعت کے جو افراد ہندوستان میں تھے، انہوں نے بھی سرحد کے مجاہدین کی طرح ہی غیر معمولی اولوالعزمی اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ہندوستان میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ماتحت اپنے آپ کو منظم کر لیا اور ہندوستان میں تحریک کے کام کو بھی سنبھالا اور سرحد پر مقیم مجاہدین کے لئے بھی امداد کا نظم جاری رکھا۔ ان پر بھی مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کے لیڈر جیلوں میں بند کر دیئے گئے، انہیں کالا پانی جلاوطنی کی سزا دی گئی، ان کے مکانات اور املاک ضبط کر لئے گئے۔ لیکن ان کی استقامت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ جب انگریز سرکار نے انہیں مقدمات میں الجھا کر خریدنے کی کوشش کی تو وہ ایسے مستقل مزاج بن کر سامنے آئے جیسے ان کی قیمت جنت سے کم کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ولیم ہنٹر مولانا یحییٰ عظیم آبادی کے رفقاء کے بارے میں شہادت دیتا ہے:

"ان میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف سے یا لالچ کی ترغیب سے اپنے تباہ شدہ امام (مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی) کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔" (۲۶۳)

۴۔ شجاعت

سید صاحبؒ کی صحبت، رفاقت اور تعلیمات کی برکت سے ان کے رفقاء میں خصوصاً اور عام مسلمانوں میں عموماً شجاعت اور اولوالعزمی کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنے نصب العین کے لئے بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ خود سید صاحبؒ جنگ بالاکوٹ کے موقعہ پر اپنی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: میں تو چاہتا ہوں کہ تمام جہان سے جو عمدہ چیز ہو، اس کو اپنے پروردگار کی نذر کر کے اس کی رضامندی حاصل کروں، اور اپنی جان کو اس کی راہ میں نثار کرنے کو تو میں ایسا سمجھتا ہوں جیسے کوئی ایک تنکا توڑ کر پھینک دیتا ہے۔" (۲۶۴)

عام مجاہدین کا یہ حال تھا کہ ان کے لئے جینا دوبھر اور اللہ کی راہ میں جان دینا آسان، بلکہ مرغوب و محبوب تھا۔ خدا بخش رام پوری نامی ایک مجاہد کے یہ الفاظ سارے مجاہدین کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں: "ہم شوق شہادت ہی لے کر دور دراز سے یہاں آئے تھے۔ جو لوگ شہید ہوئے، وہ مراد کو پہنچ گئے۔ جو باقی ہیں، ان کا ارادہ بھی یہی ہے کہ راہ حق میں جانیں دے دیں۔"

---

(۲۶۳) ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ۱۳۶۔ (۲۶۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۴۲۰۔

مہراس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”سید صاحب ؒ کی تربیت نے مجاہدین کے دل سے خوف مرگ زائل کردیا تھا۔ تربیت کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جس پر خاص توجہ مبذول ہونی چاہیے۔“ (۲۶۵)

مجاہدین کی شجاعت اور بے خوفی ہی کی بات تھی کہ ہر جنگ میں انہوں نے غیر معمولی حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کیا اور تعداد میں اپنے سے بڑے اور ہتھیار میں فائق فوجوں کو میدان جنگ میں بارہا شکست دی۔ مہر لکھتے ہیں:

> یہ امر خاص توجہ کا مستحق ہے کہ اس مختصر سی فوج سے سید صاحب ؒ نے سرحد میں سکھوں کے لئے حد درجہ نازک صورت پیدا کردی۔۔۔۔ جن لڑائیوں میں انہیں شاندار فتوحات حاصل ہوئیں، ان میں مجاہدین کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ مثلاً اکوڑہ کی جنگ میں سکھوں کی فوج پانچ ہزار اور دس ہزار کے درمیان تھی اور اس کے پاس پورا جنگی سامان موجود تھا۔ اس لشکر پر چھاپے کے لئے جو مجاہدین بھیجے گئے ان میں سے صرف ایک سو چھتیس ہندوستانی تھے اور اسی قندھاری۔ کچھ کم سات سو مقامی لوگ تھے۔ جنگ کا سب سے بڑا بوجھ صرف مجاہدین نے اٹھایا اور شاندار فتح حاصل کی۔ زیدہ کی لڑائی میں یار محمد خان کا لشکر آٹھ، دس ہزار سے کم نہ تھا۔ تاہم صرف سات سو مجاہدین نے اسے شکست فاش دی۔ مجاہدین میں صرف دو شہید ؒ ہوئے اور چار زخمی۔ مایار کی لڑائی میں درانیوں کے چار ہزار پیادوں اور آٹھ ہزار سواروں سے مقابلہ تھا۔ مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے اور میدان انہیں کے ہاتھ رہا۔ (۲۶۶)

اوپر مجاہدین کے مختلف اوصاف کے ضمن میں متعدد ایسے واقعات تحریر کیے گئے ہیں جن میں ان کی صفت شجاعت بھی عیاں ہے۔ پھر بھی نیچے صرف دو واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کتنے بے خوف ہو کر موت کا سامنا کرتے تھے۔

شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری نے جنگ مایار میں شرکت کی اور شانہ اور ہاتھوں پر کاری ضرب کھائی۔ ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی کٹ گئیں جس سے وہ جنگ جاری رکھنے سے معذور ہو گئے۔ مجبوراً انہوں نے اپنی رائفل ایک مجاہد کو اور تلوار دوسرے مجاہد کو دی اور کہا: ”یہ خدا کا مال ہے۔ میں آپ کو امین سمجھ کر دیتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ وسعی اٹھا نہ رکھیں گے۔“ اس کے بعد وہ میدان جنگ سے نکل پڑے۔ راستے میں ایک مجاہد میانجی محی الدین کو

---

(۲۶۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۰۔ (۲۶۶) مہر، جماعت مجاہدین، ۷۶۔۷۷۔

دیکھا کہ ان کے پاؤں بری طرح زخمی ہو گئے ہیں اور وہ چلنے سے معذور ہیں۔ گرچہ شیخ محمد اسحٰق کے ہاتھ خود زخمی تھے، لیکن انہوں نے میاں جی کو کسی طرح اٹھایا اور چلنے میں مدد کی۔ لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد ہی دونوں پر غشی طاری ہو گئی اور دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد سید جعفر علی نقوی اس مقام پر پہنچے۔ ہوش آتے ہی شیخ محمد اسحٰق نے ان سے جنگ کے نتیجے کے بارے میں پوچھا۔ فتح کی خوش خبری سنتے ہی انہوں نے اپنے مجروح ہاتھ سید جعفر علی کی طرف بڑھا دیئے اور کہا: ''آؤ بھائی گلے سے لگ جاؤ۔'' (۲۶۷)

میر محمد علی بہاری ایک شہزور فوجی جوان تھے اور تیغ زنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ جنگ پھولڑا میں سکھ سواروں نے جو تلوار اور بندوق سے لیس تھے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ محمد علی کو اندازہ ہو گیا کہ کسی بھی لمحہ ان پر گولی چلائی جا سکتی ہے۔ موت سامنے کھڑی تھی، لیکن مرعوب ہوئے بغیر انہوں نے سکھوں کو للکارا: ''ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں بھاگ نہ جاؤں گا۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ اور میرے شمشیر زنی کے جوہر دیکھ لو۔'' پھر خاصی دیر تک تمام سواروں سے تنہا لڑتے رہے۔ جس پر ان کی تلوار پڑ جاتی، یا تو سر قلم ہو جاتا، یا بازو کٹ جاتا، یا پاؤں اڑ جاتا۔ آخر ایک سکھ نے گولی مار کر انہیں شہید کر دیا۔'' (۲۶۸)

مجاہدین کی دلیری ایک ایسی حقیقت کے طور پر ثابت ہو چکی تھی کہ اس تحریک کے دشمن بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔ ولیم ہنٹر، جیمز او کنلی کے حوالے سے بنگالی مسلمانوں کے بارے میں جن کی طبعی پہچان ایک غیر جنگجو قوم کی حیثیت سے کی جاتی رہی ہے، لکھتا ہے: ''کم ہمت بنگالی بھی، بعض مخصوص حالات میں، اسی طرح جوش و خروش سے لڑتے ہیں جیسے افغانی۔'' (۲۶۹) نواب وزیر الدولہ نے بھی مجاہدین کی شجاعت کو ایک فارسی رباعی میں خراج تحسین پیش کیا ہے جس کا اردو میں ترجمہ غلام رسول مہر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''سب بڑے بہادر تھے، مخالفوں کی زرہیں چیر کر رکھ دیتے تھے اور پیکان توڑ ڈالتے تھے،
سب کمان چلانے میں مشاق تھے، جنگ کے دھنی اور دشمنوں کو ختم کرنے والے،
وہ حملہ کرنے میں ہواؤں کی مانند تیز تھے، جب ان پر حملہ ہوتا تھا تو پہاڑ کی طرح جم جاتے تھے،
وہ رعد کی طرح نعرے لگاتے تھے اور ان کی تلواریں بجلی کی طرح چمکتی تھیں۔'' (۲۷۰)

---

(۲۶۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۶۸۔
(۲۶۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۲۳۔
(۲۶۹) ہنٹر، ۲۱۱۔
(۲۷۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۴۳۔

۵۔ مساوات

مجاہدین کے درمیان ہر شخص کے ساتھ مساویانہ سلوک برتا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے پر مالی حیثیت، سماجی حیثیت، مرتبہ یا خاندان کی بناء پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔ سید صاحبؒ اپنے رفقاء کو مسلمانوں کے درمیان مساوات کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ انہوں نے راج دواری میں مجاہدین سے جو بیعت لی تھی اس میں مندرجہ ذیل دو باتیں براہ راست مساوات سے ہی متعلق تھیں:
(۱) جس بات کو بیعت کنندہ اپنے حق میں معیوب و مکروہ سمجھے گا، اس کا حکم کسی مسلمان بھائی کو نہ دے گا۔ جو کچھ اپنے لئے پسند کرے گا، وہی ہر مسلمان بھائی کے لئے پسند کرے گا۔ (۲) بیعت کنندہ اپنی حاجت و ضرورت پر مسلمان بھائیوں کی حاجات و ضروریات کو مقدم رکھے گا۔(۲۷۱)

مجاہدین میں مساوات کا اصول برتنے کا عام مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا محمد یوسف پھلتیؒ مجاہدین کو روزانہ راشن تقسیم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ سب کو برابر حصہ دینے کے سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس سلسلے میں کسی کو بھی ترجیح نہیں دیتے تھے، حتیٰ کہ سید صاحبؒ کو بھی نہیں۔ ان کے بعد شیخ عبدالوہاب اس کام کے لئے ذمہ دار بنائے گئے تو وہ بھی اس بات کا بہت خیال رکھتے کہ جس مجاہد کی باری ہو وہی اپنا راشن لے۔ کوئی اہم مجاہد بھی ہوتا تو اسے بھی کسی غیر معروف مجاہد پر سبقت نہ دیتے۔ ہر مجاہد کو برابر حصہ دیا جاتا۔ جتنا حصہ راشن کا ایک عام مجاہد کو ملتا، اتنا ہی سید صاحبؒ کو بھی دیا جاتا۔ مطبخ میں جلانے کے لئے جنگل سے لکڑی لانے کے لئے جو جماعتیں باری باری کام کرتی تھیں، ان میں سے ایک جماعت سید صاحبؒ کی بھی تھی۔ جب باری آتی تو سید صاحبؒ بھی اپنی جماعت کے ساتھیوں کے ساتھ جنگل جاتے اور لکڑی لاتے۔ ان کے لئے علیحدہ بہتر طعام کا انتظام نہیں کیا جاتا تھا۔(۲۷۲)

گرچہ مجاہدین سید صاحبؒ کی للّٰہیت اور معاملہ فہمی کے حد درجہ قائل تھے، لیکن اگر وہ کبھی ضرورت محسوس کرتے تو ان کے کسی فیصلے یا رائے سے اختلاف کا اظہار کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر سید صاحبؒ نے حسن زئی قبیلہ کے لوگوں کی درخواست پر ان

---

(۲۷۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۶۷۔
(۲۷۲) کبھی مہمانوں کے لئے لشکر میں اچھا کھانا بھی پکتا تھا اور سید صاحبؒ بھی مہمان نوازی کے تقاضے کے طور پر گاہے بگاہے ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے، ورنہ وہ مہمانوں کو کھانا کھلا دیتے اور خود مجاہدین کے کسی جھلیے میں ان کے ساتھ تھوڑا بہت کھا لیتے۔ (مہر، جماعت مجاہدین، ۲۵)۔

پر عشر کا حق معاف کر دیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس قبیلے کے لوگ شرعی نظام کی برکات کو دیکھتے ہوئے جلد ہی خود عشر ادا کرنا قبول کر لیں گے۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ عشر اسلامی شریعت کے مطابق اسلامی ریاست کا حق ہے اور اسے امام بھی معاف نہیں کر سکتا۔ سید صاحبؒ نے شاہ اسماعیلؒ کی بات فوراً مان لی اور اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

جب سید صاحبؒ درانی سردار سلطان محمد خان کا تعاقب کرتے ہوئے پشاور کے راستے میں مچنی نامی مقام پر پہنچے تو وہاں لشکر کے لئے رسد کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا۔ تھوڑا سا کھانا کسی طرح بنا لیا گیا اور اسے سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے کھانے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ان کے رفقاء بھوکے رہیں اور وہ کھانا کھا لیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے خدام نے درخواست کی کہ چونکہ اس تھوڑے سے کھانے سے لشکر کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، اس لئے کم از کم وہ ضرور کھانا کھا لیں۔ لیکن انہوں نے اس کھانے کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگایا جب تک کہ اناج کا انتظام نہیں ہو گیا اور رسد لشکر میں تقسیم نہیں کر دی گئی۔ (۲۷۳)

ارباب بہرام خان سید صاحبؒ کے انتہائی وفادار اور جان نثار ساتھی تھے۔ کشمیر کی ہجرت کے سفر میں ان کی بیوی اور بیٹی کے لئے گھوڑے کا انتظام کیا گیا جب کہ سید صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ کے لئے پالکی کا۔ ارباب کی خواتین نے اسے مساوات کے خلاف سمجھا اور ارباب نے یہ بات سید صاحبؒ کے گوش گزار کر دی۔ سید صاحبؒ نے جواب دیا: "میری اہلیہ حالت خاص میں ہے ورنہ اس کے لئے بھی گھوڑے ہی کی سواری کا انتظام کیا جاتا۔ ارباب کے اہل خانہ میں سے کسی کو ایسا عذر ہو تو ضرور پالکی کا انتظام کر دیا جائے گا۔" (۲۷۴)

جب سید صاحبؒ رائے بریلی میں تھے تو ایک دن ان کے لوگوں نے ایک گائے کو جو سید صاحبؒ کے باڑے میں گھس گئی تھی، باہر نکال کر دور تک دوڑایا جس سے گائے بہت ہلکان ہو گئی۔ گائے کا مالک پیر داد خان بہت ناراض ہوا۔ واقعہ معلوم ہونے پر سید صاحبؒ خود اس کے گھر اپنے لوگوں کی طرف سے معافی مانگنے کے لئے گئے۔ پیر داد خان نے گھر سے باہر نکل کر سید صاحبؒ سے ملاقات بھی نہ کی۔ یہ محسوس کر کے کہ پیر داد کو بہت زیادہ احساس ہوا ہے، سید صاحبؒ گھوڑے سے اتر پڑے، اس کے دروازے پر بیٹھ گئے اور اس وقت تک وہاں سے نہیں ہٹے جب تک کہ پیر داد خان نے ان لوگوں کو معاف نہیں کر دیا۔ (۲۷۵)

(۲۷۳) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۴۴۔ (۲۷۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۷۵۔ (۲۷۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۳۹۔۱۴۰۔

سفرِ حج میں مکہ مکرمہ میں سید صاحبؒ کے یہاں صاحب زادی تولد ہوئیں۔ عبداللہ نامی ایک نومسلم اور اس کی اہلیہ جو سید صاحبؒ کی مالی کفالت میں تھے، سفر میں کام کاج میں مدد کے لئے ساتھ تھے۔ ان کے یہاں بھی ایک نوزائدہ بچہ تھا۔ سید صاحبؒ نے عبداللہ کی اہلیہ سے اپنی بچی کو بھی دودھ پلانے کو کہا۔ اس خاتون نے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ اس کا دودھ خود اس کے بچے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ سید صاحبؒ کا ذہن معاملہ کی باریکی کی طرف نہیں گیا۔ انہوں نے دوبارہ اسے اپنی بچی کو دودھ پلانے کو کہا اور اور یہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے بہتر کھانے اور دوا کا انتظام کریں گے۔ لیکن چند دنوں کے بعد انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے بلا استحقاق اس غریب عورت پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے۔ وہ فوراً اپنے گھرانے کی چند خواتین کو ساتھ لے کر عبداللہ کی بیوی کے پاس گئے اور اس سے معافی طلب کی۔ اپنے مشفق آقا کے حلم و مساوات کو دیکھ کر وہ خاتون رو پڑی، لیکن سید صاحبؒ اس سے معافی کے الفاظ سننے کے بعد ہی واپس ہوئے۔ اس کے بعد وہ عبداللہ کے پاس گئے اور سب کے سامنے اس سے بھی معافی مانگی۔ (۲۷۶)

سید صاحبؒ نے ایک بار اپنے ایک خادم کو اس کی ایک غلطی پر "مردود" کہہ دیا۔ بعد میں ان کے رفقاء نے اس بات کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ سید صاحبؒ فوراً اس خادم کے پاس گئے اور سب کے سامنے اس سے معافی مانگی۔ (۲۷۷)

ایک زمانے میں جب ہندوستان سے نئے مجاہدین کی آمد بند ہوگئی تھی تو ضرورتاً سید صاحبؒ نے ساتھیوں کے مشورے سے دو سو سپاہیوں کو ملازم رکھ لیا۔ انہیں دنوں دین محمد جو ہندوستان سے سرحد روپیہ پہنچانے کے ذمہ دار تھے، سرحد آئے۔ انہوں نے سید صاحبؒ کو مشورہ دیا کہ چونکہ اس وقت تک جماعت مجاہدین کی آمدنی کی کوئی مستقل صورت نہیں تھی، اس لئے تنخواہ پر سپاہیوں کا رکھنا مناسب نہیں تھا۔ سید صاحبؒ نے فوراً اپنے صلاح کاروں سے مشورہ کیا اور پھر ان ملازم سپاہیوں کو پورا معاوضہ دے کر رخصت کردیا۔ اس واقعہ کے بارے میں مہر لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ کے لشکر میں "ہر شخص رائے دینے کا مجاز تھا، حتیٰ کہ قاصد بھی۔" (۲۷۸)

۶۔ عفو و درگذر

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء اپنی ذات کے تقاضوں سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ اگر کوئی ان

---

(۲۷۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ (۲۷۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۳۷

(۲۷۸) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۴۵۶۔ ۴۵۷، فوٹ نوٹ ۱، ۴۵۷۔

کے ساتھ زیادتی کرتا تو وہ دل سے معاف کر دیتے اور اگر ممکن ہوتا تو اس کے ساتھ احسان کا معاملہ فرماتے۔

سید صاحبؒ نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا جو ان کی جان کے درپے تھے۔ ایک بار رائے بریلی میں ایک مسلح شخص نے آپ پر حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا۔ سید صاحبؒ نے نہ صرف اسے معاف فرما دیا بلکہ اسے کئی دن اپنے ساتھ رکھا، اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا اور پھر اسے کسی سزا کے بغیر آزاد کر دیا۔ جاتے وقت انہوں نے اس شخص کو پیسے بھی عنایت فرمائے۔ (۲۷۹) دوسرے موقعہ پر جب سید صاحبؒ پٹنہ کے قریب دیگھا نامی مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے، ایک شخص کو ان کی قیام گاہ کے ارد گرد چکر لگاتے دیکھا گیا۔ وہ مسلح تھا اور موقعہ کی تلاش میں تھا کہ دھوکہ سے گھر میں داخل ہو کر سید صاحبؒ پر قاتلانہ حملہ کرے۔ اس شخص کو سید صاحبؒ کے سامنے لایا گیا اور اس نے اقبال جرم بھی کر لیا۔ لیکن اسے سزا دینے کے بجائے سید صاحبؒ نے اس کی معافی کی درخواست قبول کی، اس کے لئے دعاء خیر کی، اسے اچھی باتوں کی تلقین کی اور پانچ روپے دے کر آزادانہ واپسی کی اجازت دی۔ (۲۸۰) اسی طرح انہوں نے نذر محمد اور ولی محمد کشمیری نامی یار محمد خان کے ان دونوں خادموں کو بھی معاف فرما دیا جن کے ذریعہ یار محمد خان نے جنگ شیدو کے موقعہ پر انہیں زہر دلوایا تھا۔ جب ایک موقعہ پر وہ سید صاحبؒ کے حامیوں کی گرفت میں آ گئے تو سید صاحبؒ نے ہی انہیں رہائی دلائی اور حفاظت کے ساتھ نکل جانے کا موقعہ فراہم کیا۔ (۲۸۱)

ایک مرتبہ شیخ امان اللہ نے جو لشکر مجاہدین میں بعض وجوہ سے امتیازی شخصیت کے حامل تھے، لاہوری نامی ایک شخص کو جو دنیاوی نقطۂ نظر سے کم رتبہ تھے۔ ایک معمولی نزاع کی وجہ سے گھونسہ مار دیا۔ قاضی نے فیصلہ سنایا کہ یا تو لاہوری امان اللہ کو معاف کر دیں یا اسی طرح اسے بھی گھونسے مار لیں۔ لاہوری نے قصاص لینے پر اصرار کیا۔ چنانچہ امان اللہ کو لاہوری کے سامنے کھڑا کیا گیا تاکہ لاہوری بدلہ لے لیں۔ لاہوری آگے بڑھے اور امان اللہ کو محبت سے گلے لگا لیا اور کہا کہ وہ صرف شریعت کی رو سے اصول مساوات کی بالادستی ثابت کرنا چاہتے تھے، ورنہ وہ دل سے اپنے بھائی کو معاف کرتے ہیں۔ (۲۸۲)

---

(۲۷۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۷۶۔

(۲۸۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۷۵۔۲۷۶۔

(۲۸۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۳۹۸۔

(۲۸۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۱۵۷۔۱۶۱۔

عبدالوہاب لکھنوی لشکر میں رسد تقسیم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ لوگوں کو ان کی باری آنے پر ہی ان کا حصہ دیتے تھے۔ مجاہدین ان کے اصول سے واقف تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ ایک دن ایک نووارد مجاہد امام علی نے جلدی مچائی اور ان کے انکار کرنے پر انہیں اس طرح دھکا دیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ لشکر کے لوگ عبدالوہاب کا احترام کرتے تھے۔ غصے کی حالت میں انہوں نے اس نووارد شخص کو گھیر لیا اور چاہا کہ اسے سزا دیں۔ لیکن مولوی عبدالوہاب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، مجاہدین کو روکا اور ان سے کہا: ''امام علی میرا بھائی ہے۔ دھکا دیا تو مجھے دیا ہے۔ آپ لوگ کیوں جوش میں آگئے؟'' جب سید صاحبؒ کو اطلاع ہوئی اور انہوں نے مولوی عبدالوہاب سے واقعہ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ''امام علی نیک بخت آدمی ہیں۔ وہ رسد لینے آئے تھے۔ باری ان کی نہ تھی۔ انہوں نے جلدی کی اور مجھے دھکا لگ گیا۔'' (۲۸۳)

لشکر میں عبدالرحیم نامی ایک نومسلم نوجوان تھے جو منشی محمدی انصاری نام کے ایک مجاہد کے بندوق کی دیکھ ریکھ کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ بندوق منشی جی کے پاس لائے اور کہا کہ اس میں کچھ خرابی ہوگئی ہے۔ بندوق میں گولی بھری ہوئی تھی لیکن عبدالرحیم، منشی جی سے اس کا ذکر کرنا بھول گئے۔ منشی جی نے آزمانے کے لئے لبلبی دبا دی۔ بندوق چل گئی اور گولی بہت نزدیک سے عبدالرحیم کے شانے میں لگی۔ منشی محمدی اس حادثے پر انتہائی غمگین تھے۔ عبدالرحیم کا دوسرے ہی دن انتقال ہوگیا۔ وہ شدید درد و تکلیف میں مبتلا تھے لیکن اس حال میں بھی وہ منشی محمدی کی دلجوئی کرتے اور کہتے: ''بھائی صاحب! رنج و غم نہ کریں۔ آپ نے مجھے نہیں مارا۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے۔ میں بتا نہ سکا۔ جو کچھ پیش آیا وہ تقدیری معاملہ تھا۔'' (۲۸۴)

مولانا محمد بشیر پر، جو بعد کے دور میں مجاہدین کے چمرکنڈ مرکز کے امیر تھے، کئی بار نامعلوم دشمنوں کی طرف سے جان لیوا حملہ ہوا، لیکن ہر بار وہ بال بال بچ گئے۔ اس خطرے کے احساس سے کہ مستقبل میں ہونے والا کوئی حملہ ان کی جان بھی لے سکتا ہے، انہوں نے اپنی آخری وصیت مرتب کی جس میں انہوں نے جماعت کے لوگوں کو تاکید کی کہ اگر ایسا حادثہ پیش آجائے تو قاتل کو معاف کر دیا جائے۔ البتہ اگر وہ جماعت کا رکن ہو تو اسے جماعت سے خارج کر دیا جائے۔ (۲۸۵)

---

(۲۸۳) مہر، سرگزشت، ۵۵۲۔
(۲۸۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۷۸۔۲۷۹۔
(۲۸۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۵۵۲۔

۷۔ تقویٰ

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء تقویٰ اور پرہیزگاری کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کی آلائشوں سے پاک تھے اور ہر حال میں اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ غفلت کا ان کے دل کی دنیا میں گزر نہ تھا۔ غلام رسول مہر، سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کے حوالے سے مولانا عبداللہ عظیم آبادی کے مجاہدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ لوگ صابر و شاکر، ہر وقت ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے پہرے دار ایک دوسرے کو آواز دیتے تو ایسے انداز میں 'سبحان اللہ' کا نعرہ بلند کرتے کہ جو یہ نعرہ سنتا، اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ دوسرا پہرے دار جواب میں کہتا: 'الحمد للہ'۔ تیسرا پکارتا: 'یرحمکم اللہ' چوتھا جواب دیتا: 'یہدیکم اللہ'۔ یہ جماعت ذات باری تعالیٰ کے عاشقوں کی جماعت تھی۔ (۲۸۶)

سید صاحبؒ بذات خود تقویٰ و پرہیزگاری کا پیکر تھے۔ ہزاروں خواتین ان سے بیعت ہوئی تھیں لیکن انہوں نے کبھی کسی کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ان کے مجاہدین ضرورت کے تحت آس پاس کی بستیوں میں آتے جاتے تھے جہاں کبھی خواتین بھی سامنے آجاتی تھیں، لیکن مجاہدین کبھی انہیں نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ سرحد میں یہ بات اس طرح مشہور ہو گئی تھی کہ "سید صاحبؒ کے غازی یا تو خواہشات جنسی سے فطرتاً محروم ہیں یا پھر اولیاء اللہ ہیں۔" (۲۸۷)

یہ بات صرف جنسی کمزوری تک ہی محدود نہیں تھی۔ مجاہدین نے روپے پیسے، شہرت و عزت، عہدہ و رتبہ اور ایسی ہر دنیاوی خواہشات سے دل اٹھا لیا تھا اور ایسی کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ بھی نہیں اٹھتی تھی جس میں اللہ کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔

جب سید صاحبؒ نے قاضی حبان کو باغی سرداروں کی سرزنش اور عشر کا انتظام درست کرنے کے لئے علاقے کا دورہ کرنے کی ذمہ داری دی تو ان کی ماتحتی میں چھ سو مجاہدین دیئے اور انہیں عوام کے حقوق کے معاملے میں احتیاط برتنے اور اپنے نفس پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی۔ قاضی حبان نے بھی سید صاحبؒ سے عرض کیا: "شاہ اسماعیلؒ کو میرے ساتھ کر دیجئے تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول ﷺ کی رضاء کے خلاف سرزد ہونے لگے تو شاہ صاحبؒ مجھے روک دیں۔" (۲۸۸)

---

(۲۸۶) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۳۴۸۔

(۲۸۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۴۲۔

(۲۸۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۵۰۔

فتحِ پشاور کے موقعہ پر جب مجاہدین وہاں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ چونکہ سب دکانیں بند تھیں، اس لئے مجاہدین کے لئے رات کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا جاسکا۔ باقاعدہ کھانا مجاہدین کو تیسرے دن نصیب ہوا۔ اگرچہ یہ ایک فاتح فوج تھی اور پورا شہر اس کے رحم وکرم پر تھا، لیکن نہ کوئی دکان لوٹی گئی، نہ کسی کے گھر کا دروازہ توڑا گیا، اور نہ ہی کھلے باغات سے کسی نے پھل توڑے۔ خود سالارِ اعظم سید صاحبؒ نے ایک سرائے میں قیام کیا، اگرچہ سلطان محمد خان کا محل خالی پڑا تھا۔ (۲۸۹)

سید جعفر علی نقوی ایک بار مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ پنجّوں سے بالاکوٹ کا سفر کر رہے تھے۔ سخت سردی، تیز برفانی ہوا اور برف باری نے اس پہاڑی سفر کو اتنا مشکل بنا دیا کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ جب قدم اٹھانا بھی مشکل ہو گیا تو انہوں نے اپنے ہتھیار اور چند چیزیں ایک ساتھی مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سونپیں کہ وہ انہیں بیت المال میں جمع کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مقامی شخص کو اپنی دستار پیش کی اور درخواست کی کہ اس کے بدلے میں وہ انہیں پاس کے گاؤں تک اٹھا کے پہنچا دے۔ مہر لکھتے ہیں: ''صرف دستار کی پیش کش اس لئے کی کہ جو سامان وہ گھر سے لائے تھے، اس میں سے محض دستار باقی رہ گئی تھی۔ باقی سب کپڑے بیت المال کے تھے اور انہیں کسی کے حوالے کرنا مولوی صاحب کے نزدیک تقویٰ کے خلاف تھا۔'' (۲۹۰)

ایک بار جب مجاہدین فتح خان کے ساتھ سکھ کمانڈر ہری سنگھ نلوہ کی فوج کے آمنے سامنے تھے، نجم الدین نامی ایک مجاہد نے از خود فیصلہ کیا کہ وہ ہری سنگھ کی فوج میں جا کر وہاں مسلمان سپاہیوں کو سکھوں کا ساتھ چھوڑ کر مجاہدین کا ساتھ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ نجم الدین کو گرفتار کر لیا گیا اور پابہ زنجیر رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیج دیا گیا۔ ایک دن رنجیت سنگھ نے نجم الدین کو دربار میں بلایا، اس کے جسم پر سے زنجیر اتروا دیں اور کہا کہ اس نے مجاہدین کی بھرماری کے بارے میں بہت تعریف سنی ہے اور وہ بھی اس کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہے۔ نجم الدین نے بھرماری کے کئی فائر کیے۔ رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا اور ان کو اپنے یہاں نوکری کی پیش کش کی۔ نجم الدین نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا مقصد جہاد کے ذریعہ دین کی خدمت ہے، روپیہ کمانا نہیں۔ رنجیت سنگھ نے اسے ایک گھوڑا، دو بنارسی دوپٹے اور پچاس روپے نقد دے کر اپنے آدمیوں کے حوالے کیا کہ اسے ایسے محفوظ مقام تک پہنچا دیں جہاں سے وہ بہ حفاظت اپنے لوگوں میں واپس ہو سکے۔ نجم

---

(۲۸۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ (۲۹۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۷۔

الدین پنجتار واپس ہوئے اور گھوڑا، کپڑا اور روپے مجاہدین کے امیر شیخ ولی محمد کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ چیزیں خدا کا مال ہیں، انہیں بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ (۲۹۱)

سید عمر شاہ، جو ستھانہ کے والی اور وہاں کے اس سید خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے سید صاحبؒ کے دست حق پر بیعت کی تھی اور اخیر تک وفاداری نبھائی تھی، ایک جنگ میں سخت زخمی ہو گئے۔ گولی سینے میں لگی تھی۔ رمضان کی چودہ یا پندرہ تاریخ تھی اور سید عمر روزے سے تھے۔ انہیں زخمی حالت میں مسجد میں لایا گیا اور دوا پیش کی گئی۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے دوا پینے سے انکار کر دیا کہ وہ اللہ کے حضور میں روزہ کی حالت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ (۲۹۲)

مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی، جو خاندان ولی اللّٰہی کے ممتاز علماء، سید صاحبؒ کی تحریک کے مضبوط ستون اور دہلی مرکزِ مجاہدین کے ذمہ دار تھے، سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ۱۸۴۵ء میں مکہ معظّمہ ہجرت کر گئے تھے۔ مستقل ذریعۂ آمدنی کی غیر موجودگی اور طبعی فیاضی کی وجہ سے وہ مالی طور پر زیر بار رہتے تھے۔ ایک دن پڑوسیوں نے دیکھا کہ دونوں بھائی غیر معمولی طور پر خوش نظر آ رہے ہیں۔ کسی کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ہندوستان میں حسن پور موضع ان کی زمینداری میں تھا جسے انگریزی سرکار نے ضبط کر لیا۔ وہ خوش اس لئے تھے کہ آمدنی کا ایک ظاہر ذریعہ تھا، جو اس طرح ختم ہو گیا اور اب ان کا بھروسہ صرف اللہ پر رہ گیا۔ (۲۹۳)

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ٹونک کے نواب، نواب وزیر الدولہ نے سارے مجاہدین کو ٹونک آ جانے کی دعوت دی اور انہیں حسب حیثیت و صلاحیت مناسب نوکریاں پیش کیں تا کہ ان کے مالی تعاون کی شکل پیدا ہو سکے۔ لیکن ان اللہ والوں میں بہت سے لوگوں نے اچھی اچھی نوکریوں سے معذرت کر لی اور نواب کی طرف سے بہت معمولی وظیفہ قبول کر کے انتہائی سادگی کے ساتھ زندگی گزار دی۔ سید صاحبؒ کے بھانجے سید محمد علی، مصنف مخزن احمدی، اور سید محمد یعقوب انہیں لوگوں میں تھے۔ شیخ حسن علی، جو سید صاحبؒ کے ایک جان نثار رفیق اور مخلص مجاہد تھے، نے بھی یہی راہ اختیار کی۔ انہوں نے ٹونک میں ایک بہت ہی چھوٹا سا گھر بنایا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارک کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ (۲۹۴)

تنظیم کے وہ مجاہدین جو ہندوستان سے سرحد روپیہ پہنچانے کے ذمہ دار تھے ایسے اخلاص،

(۲۹۱) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۵۰۔
(۲۹۲) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۹۴۔
(۲۹۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۰۷۔
(۲۹۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۳۱، ۱۳۹ اور ۲۴۴۔

ایمانداری اور پرہیزگاری کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ وہ قدم قدم پر خطرات کا مقابلہ کرتے اور جان پر کھیل کر روپیہ سرحد پہنچاتے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ''یہ نظام ۱۸۶۴ء تک اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا اور ہمارے زمانے میں بھی اس دینی نظام کا مالی حصہ ہر خلل سے پاک تھا۔ سوا سو سال تک کی مدت میں معمولی سی خیانت کی بھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر رقمیں پہنچانے والے لوگ سارا کام فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے اور پائی تک نہ اجرت لیتے تھے۔'' (۲۹۵)

تقویٰ کی روح ہر قدم پر اللہ پر نظر رکھنا ہے تاکہ نفس کسی کامیابی کو اپنی اہلیت وصلاحیت کی طرف منسوب کرنے کی بھول نہ کر بیٹھے۔ مجاہدین اس معاملہ میں بھی پورے اترے۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے سرحد میں ایک بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا اور وہاں اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ جب مولانا ولایت علی عظیم آبادی، جنھیں اس اسلامی ریاست کی سربراہی کرنی تھی، وہاں تشریف لائے تو انہیں بڑے پیمانے پر بندوق اور توپ کی سلامی دی گئی۔ عطر شیشہ نامی مقام پر ایک بڑے میدان میں اسلامی لشکر کے ہزاروں سپاہی اور مجاہدین دو رویہ ان کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ پورا علاقہ بندوق اور توپ کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔ دیکھنے والوں کا بڑا مجمع تھا۔ جب دونوں بھائی — مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی — آگے بڑھ کر ایک دوسرے سے ملے تو ان کے دل اللہ کے لئے شکر سے لبریز تھے جس نے وہاں ان کے قدم پھر جما دئے تھے۔ بے اختیار ہو کر دونوں بزرگ سجدۂ شکر بجالانے کے لئے زمین پر سجدے میں گر گئے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی تقلید میں پورا اسلامی لشکر اللہ کے حضور میں زمین پر سجدہ ریز تھا۔ (۲۹۶)

۸۔ خدمت واعانت

سید صاحبؒ نے اپنے رفقاء کے دل میں دوسروں کی بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان کی تربیت ان خطوط پر کی تھی کہ دوسروں کی بے لوث خدمت اللہ تعالیٰ کو بہت خوش کرنے والا عمل ہے۔ خود ان کی ذاتی زندگی شروع سے اس کی عملی مثال پیش کرتی تھی۔ کم عمری میں اپنے غریب اور مجبور پڑوسیوں کی خدمت، معاش کی تلاش میں لکھنؤ کے سفر کے درمیان گھوڑے پر

(۲۹۵) مہر، جماعت مجاہدین، ٦٦۔ (۲۹۶) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۴۰۔۲۴۱۔

سواری کی اپنی باری دوسروں کو دے دینا اور خود سب کا پورا سامان اٹھا کر پیدل چلنا، اور امیر خان کے لشکر میں اپنے کپڑوں کے ساتھ بضد ہو کر دوسرے رفقاء کے کپڑے بھی دھو دینا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جو ان کی طبیعت کے اٹھان کو ظاہر کرتی ہیں۔

ایک بار سید صاحبؒ نے مولانا عبدالحی بڈھانوی کی درخواست پر انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح جذبۂ اخلاص اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنے میں مدد فرمائی تھی جس کے فورا بعد مولانا عبدالحیؒ نے سید صاحبؒ سے بیعت کر لی تھی اور ان کے خادموں میں داخل ہو گئے تھے۔ (۲۹۷) مجاہدین نے ایک دن سید صاحبؒ سے درخواست کی کہ وہ ان کی بھی راہنمائی و مدد فرمائیں تا کہ وہ بھی اسی طرح مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرنے کی سعادت سے مشرف ہوں۔ سید صاحبؒ نے اس بات کے پیش نظر کہ ایک بڑی جماعت کے لئے یہ کام مشکل تھا، انہیں دوسرے ایک ایسے عمل خیر کے سکھانے کا وعدہ فرمایا جو رضائے الٰہی حاصل کرنے میں اس سے بڑھ کر تھا، اور وہ تھا۔ دوسروں کی بے لوث خدمت۔ انہوں نے تشریح فرمائی کہ جو چیز ایک مسلمان کو خود پسند ہو، وہ اس میں دوسرے مسلمانوں کے لئے ایثار وقربانی کا معاملہ کرے۔ اور جو چیز اپنے نفس پر گراں ہو، اس میں سبقت کر کے اپنے بھائی کے لئے راحت وآرام کا ذریعہ بنے جو خدمت کی روح ہے۔ مجاہدین کی اس صفت عالیہ کے صرف چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

پھنگلئی میں ایک زمانہ میں اکثر مجاہدین بیمار پڑ گئے۔ صرف چھ، سات مجاہدین صحت مند تھے جن پر پورے لشکر کی تیمارداری کا بوجھ تھا۔ ان میں سے ہر ایک پر بیماروں کی ایک بڑی تعداد کی تیمارداری اور خدمت کی ذمہ داری تھی۔ مثلاً، سید رستم علی چھلگانوی، جو اکوڑہ کی جنگ میں زخمی ہو گئے تھے اور ابھی پوری طرح صحت یاب بھی نہیں ہوئے تھے، چالیس بیمار مجاہدین کی خدمت کر رہے تھے۔ یہ صورت حال تھی لیکن ان میں سے سب ہی نے اپنے بیمار بھائیوں کی بے لوث خدمت کی اور اسے سعادت عظمٰی سمجھا۔ (۲۹۸)

سید صاحبؒ نے مولانا شاہ اسماعیلؒ کو ایک گھوڑا دیا تھا، لیکن انہوں نے اسے سواری کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا۔ جب بھی کوئی سفر درپیش ہوتا، وہ خود پیدل چلتے اور اپنا گھوڑا کسی مجاہد کو دے دیتے تا کہ اجر وثواب کے مستحق ہو سکیں۔ (۲۹۹) اسی طرح جب سید جعفر علی نقوی نے انیس رفقاء

---

(۲۹۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۴۶، ۱۵۰۔ (۲۹۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۵۔

(۲۹۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۲۲۔

کے ساتھ سرحد کو ہجرت کی تو ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "میں نے نیت کر لی تھی کہ ساتھیوں میں جو تھک جائے گا، اسے سوار کرا دوں گا، خود پیدل چلوں گا۔"(۳۰۰) سرحد میں مجاہدین اپنے کپڑے جمعرات کو خود دھوتے تھے۔ یہ عام بات تھی کہ کوئی مجاہد اپنے کپڑے دھونے کے لئے جانے لگتا تو کوشش کرتا کہ دوسرے مجاہدین کے کپڑے بھی ساتھ لے لے اور دھو دے تا کہ خدمت کا ثواب حاصل کر سکے۔(۳۰۱)

شیخ حسن نامی ایک مجاہد عسرت کی زندگی گزارتے تھے، لیکن دوسروں کی خدمت کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ گھر والوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ دال اور سبزی میں پانی زیادہ ڈال دیا کریں تا کہ وہ دوسرے ضرورت مندوں اور غریب پڑوسیوں کی مدد کر سکیں۔ جب وہ اسلامی لشکر میں تھے تو ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لئے مشہور تھے، چاہے جو کچھ بن پڑے۔(۳۰۲)

ایک بار لشکر میں شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ پائندہ خان کے چھوڑے ہوئے زنبورکوں کو پاس کی ایک جگہ سے لشکر میں لے آئیں۔ جب قاصد حکم لے کر پہنچا تو وہ دن میں بہت تھک جانے کی وجہ سے گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسرے مجاہد سید جعفر علی نقوی نے انہیں اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور خود اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ فوراً روانہ ہو گئے اور رات بھر مشقت اٹھا کر زنبورکیں لے آئے۔ کام اتنا مشکل تھا کہ سید جعفر کو بخار آ گیا، لیکن اپنے دینی بھائی کو آرام پہنچانے کی خاطر انہوں نے ساری صعوبتیں بہ خوشی برداشت کر لیں۔(۳۰۳)

سید ابو محمد جو سید صاحبؒ کے عزیز اور ہجرت میں ان کے رفیق تھے، بہت ہی صاف ستھری طرز رہائش کے عادی تھے۔ لیکن سید صاحبؒ کی صحبت میں دوسروں کی خدمت کا جو جذبہ ان میں پیدا ہوا، وہ ان کے فطری مزاج پر اس طرح غالب آ گیا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی سید ابو محمد ہیں۔ مہر لکھتے ہیں: "سید صاحبؒ کی معیت اختیار کر لینے کے بعد یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ غریب امیر، اپنے بیگانے، کسی کی تیمارداری یا خدمت گزاری میں نہ ننگ و عار تھی اور نہ کراہت و کاہلی کے روادار ہوتے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے، اپنے ہاتھ سے بول و براز اٹھاتے۔"(۳۰۴)

ایک شب جب سید صاحبؒ سو رہے تھے تو انہیں پیاس لگی اور انہوں نے پانی مانگا۔ مولانا محمد

---

(۳۰۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۰۱۔

(۳۰۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۰۲۔

(۳۰۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۲۵۔

(۳۰۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۷۸۔۷۹۔

(۳۰۴) مہر جماعت مجاہدین، ۱۴۶۔

یوسف پھلتی پانی لے کر آئے مگر اس وقت تک سید صاحبؒ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ مولانا محمد یوسف نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور پانی لئے اس انتظار میں کھڑے رہے کہ سید صاحبؒ کے ہوشیار ہوتے ہی پیش کریں گے۔ جب سید صاحبؒ رات کے آخری پہر میں بیدار ہوئے تو انہوں نے پانی پیش کیا۔ سید صاحبؒ ان کے جذبہ محبت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے لئے دعاء خیر کی۔ (۳۰۵)

مولوی عبدالوہاب ایک پارسا لیکن جسمانی طور پر کمزور مجاہد تھے۔ جب سید صاحبؒ نے انہیں لشکر میں غلہ تقسیم کے لئے ذمہ دار بنانا چاہا تو انہوں نے اپنی کمزوریِ صحت کی بناء پر معذرت کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ قرآن مجید حفظ کرنے کا شوق رکھتے ہیں اور اپنا وقت اس پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ سید صاحبؒ نے انہیں غلہ کی تقسیم کی ذمہ داری قبول کر لینے کی ترغیب دی، دعاء کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ انہیں مسلمانوں کی اس خدمت کے عوض صحت بھی عطا فرمائے اور قرآن بھی یاد کرا دے۔ شیخ عبدالوہاب نے ذمہ داری قبول کر لی۔ جلد ہی ان کی صحت بہتر ہو گئی اور انہیں قرآن بھی یاد ہو گیا۔ اگلے رمضان میں انہوں نے خوشی خوشی سید صاحبؒ کو تراویح میں قرآن بھی سنایا۔ (۳۰۶)

سید صاحبؒ سے تعلق رکھنے والے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات نے بھی اپنے اپنے طریقے سے خدمت کے اعمال کو عام کیا۔ دانا پور پٹنہ کے شیخ علی جان نے، جو ایک مشہور تاجر اور سید صاحبؒ کے مرید تھے، اپنا ایک باغ اس غرض سے وقف کر رکھا تھا کہ مسافر وہاں ٹھہر کر آرام کر لیں۔ شیخ کی طرف سے وہاں مسافروں کے کھانے کا انتظام بھی تھا۔ دانا پور ہی کے دوسرے تاجر صدر الدین بھی جو سید صاحبؒ کے مرید تھے، غریبوں اور مسافروں کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبدالرحیم کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ خود مسافروں کے اکرام کے طور پر ان کے ساتھ کھانا کھایا کرے۔ انہوں نے بھی ایک پھل دار باغ مسافروں اور مہمانوں کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اسی طرح شیخ محمد تقی نے جو انگریزی فوج میں گوشت سپلائی کرنے کے ٹھیکیدار تھے، سید صاحبؒ سے بیعت کرنے کے بعد تقریباً سوا لاکھ روپے کی مالیت کی جائیداد وقف کر رکھی تھی تاکہ خیر کے امور میں لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ یہ سب کچھ دوسروں کے کام آنے اور خدمت کے جذبہ سے ہی کیا جا رہا تھا۔ (۳۰۷)

---

(۳۰۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۴۳۔

(۳۰۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۹۲۔۹۴۔

(۳۰۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۸۱۔۲۸۲۔ اور ۲۸۹۔

۹۔ اعتدال

اعتدال جو اسلام کا حسن اور اس کے فکری اور عملی نقطۂ نظر کا کمال ہے، سید صاحبؒ میں اور ان کی صحبت و تربیت کی برکت سے ان کے رفقاء میں بدرجہ اتم پیدا ہو گیا تھا اور ان کی شناخت بن گیا تھا۔ خود سید صاحبؒ اس صفت کا مثالی پیکر تھے۔ وہ مصیبتوں میں صبر اور خوشیوں میں شکر کرتے اور اعتدال سے کبھی تجاوز نہ کرتے۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ''میرا طریقہ وہی ہے جو میرے نانا سردار انبیاء نے اختیار فرمایا۔ ایک روز سوکھی روٹی پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ایک روز بھوکا رہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں۔''(۳۰۸)

ایسے حالات میں جن میں لوگ جذباتیت کا شکار ہو کر حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں، سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء پوری طرح مثالی اعتدال پر قائم رہتے تھے۔ سید صاحبؒ نے ایک موقعہ پر تحریر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ مخلص مومنوں کے دل میں نہ فتح کے وقت غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے، نہ شکست کے وقت ان میں انتشار و افسردگی آتی ہے۔''(۳۰۹) مولانا شاہ محمد اسماعیلؒ نے بھی سید صاحبؒ کے تربیت یافتہ اشخاص میں اعتدال کی صفت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے: ''توسط سید صاحبؒ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں میں پایا جاتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ توسط کا یہ طریقہ مجھ سے تعلیم پانے والے بھی سیکھ لیں، لیکن یا تو وہ افراط کی راہ اختیار کر لیتے ہیں یا تفریط کرنے لگتے ہیں۔''(۳۱۰)

سید صاحبؒ گرچہ مسلکاً حنفی المذہب تھے لیکن انہوں نے دوسرے مذاہب فقہ کے تئیں ہمیشہ نہایت متوازن نقطۂ نظر رکھا۔ حج کے سفر میں جب ان کے رفقاء کی اچھی خاصی تعداد سمندری آب و ہوا کی وجہ سے بیمار پڑ گئی اور انہیں نماز ادا کرنے میں دشواری ہونے لگی، تو انہوں نے نماز میں جمع کرنے یعنی دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا حکم دیا جو دوسرے اماموں کے نزدیک جائز تھا۔(۳۱۱) یہ بات لائق صد تحسین ہے کہ سید صاحبؒ کے رفقاء میں ہر مسلک کے لوگ تھے اور سب اپنے اپنے مسلک پر عامل اور دوسروں کے مسلک کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے والے تھے۔ ان میں فقہی مسائل پر کبھی کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کرتے، لیکن اسلام کی خدمت کے لئے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار اور غیر منقسم جماعت تھے۔

(۳۰۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۹۔
(۳۰۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۷۷۔
(۳۱۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۲۸۔۱۲۹۔
(۳۱۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۵۔

جب سید جعفر علی نقوی سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد سرحد سے ہندوستان واپس ہورہے تھے تو ان کی ملاقات افغانستان کے معزول شدہ حکمران زمان شاہ سے جالندھر میں ہوئی۔ شاہ نے ان کے اکرام کے طور پر دعوت کا کھانا بھیجا۔ جب کھانا سید جعفر علی کے سامنے لایا گیا تو شاہ کے قاصد نے ان سے کھڑے ہو کر شاہ کے ''طعام خاص'' کو تعظیم دینے کو کہا۔ سید جعفر کھڑے نہیں ہوئے اور اعتدال کے اسلامی اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا: ''میں آپ کی تعظیم کرتا ہوں، یہ کافی ہے۔ طعام کی تعظیم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ضائع نہ ہو۔'' (۳۱۲)

جب سید صاحبؒ کا قیام خہر میں تھا تو مجاہدین نے ان کی اجازت سے فوجی مشق شروع کی۔ یہ سلسلہ تقریباً تین ماہ تک چلا جس سے مجاہدین کی جنگی مہارت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ایک دن سید صاحبؒ خود میدان میں تشریف لے گئے اور مجاہدین کی مشق کا معائنہ کیا۔ انہوں نے مجاہدین کی کوششوں کو سراہا اور تحسین کے الفاظ کہے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے ان الفاظ میں انہیں اعتدال کا سبق دیا: ''بھائیو! قواعد پر اعتماد نہ کرنا۔ فتح و شکست اللہ تعالی کے دست قدرت میں ہے، قواعد پر موقوف نہیں ہے۔ اگر تم صرف عنایت الٰہی پر اعتماد کرو گے تو اللہ تعالی تمہیں قواعد والوں پر فتحیاب کرے گا۔ اب کل سے قواعد موقوف کرو۔ جس کا دل چاہے، تنہا تنہا بھر ماری کی مشق کر لیا کرے۔'' (۳۱۳)

جب سید صاحبؒ کشمیر ہجرت کے لئے تیار ہوئے تو ارباب بہرام خان کی اہلیہ اور بیٹی بھی مناسب لباس میں جس میں ان کا سراپا پوری طرح چھپا ہوا تھا، باہر آئیں۔ مجاہدین نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا تا کہ ان پر نگاہ نہ پڑے۔ ارباب نے محسوس کیا اور اسلام میں اعتدال اور میانہ روی کے اصول پر زور دینے کی نیت سے ان مجاہدین کو مخاطب کر کے کہا کہ ان خواتین میں ایک ان کی اہلیہ ہیں اور دوسری ان کی بیٹی اور چونکہ دونوں شرعی پردے میں ہیں، اس لئے کسی کو الجھن نہیں ہونی چاہئے۔ اس طرح سفر حج میں مولانا عبدالحی بڈھانوی نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ وہ شرعی پردے میں کشتی سے اتر کر نماز فرض ادا کریں اور آس پاس غیر محرم مردوں کی موجودگی کا خیال نہ کریں کہ شرعی پردے کی صحیح اور افراط و تفریط سے پاک راہ یہی ہے۔ جب ان کی اہلیہ نماز پڑھ رہی تھیں تو انہوں نے پردے کے غیر متوازن اور غیر معتدلانہ تصور کو کمزور کرنے کے لئے پکار کر کہا: ''صاحبو! دیکھ لو، عبدالحی کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے۔'' ایسے ہی ایک دوسرے موقعہ پر

(۳۱۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۰۷۔
(۳۱۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۶۴۔۶۵۔

انہوں نے فرمایا تھا: "عبدالحی کی بیوی کھڑی ہے اور شرعی پردہ جو خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے موافق ہے اس کو کہتے ہیں۔" (۳۱۴)

۱۰۔ مذہبی رواداری

سید صاحبؒ سچے مسلمان تھے اور صدق دل سے اسلام کی ہر چھوٹی بڑی تعلیم کو سچا جانتے اور مانتے تھے لیکن ان کے دل میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لئے مذہبی نفرت جیسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ بہ حیثیت مذہب صرف اسلام ہی اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہے اور انسان کی نجات اخروی کا واحد ذریعہ ہے، لیکن اسلام کی دعوت عام کرنے میں وہ کسی غیر مسلم پر دباؤ ڈالنے کے تصور سے بھی کوسوں دور تھے۔ ان کی پوری زندگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کا برتاؤ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے ساتھ باعزت، شریفانہ اور مکمل رواداری کا تھا۔ اسی طرح اگرچہ وہ شیعہ عقیدے کی بعض باتوں سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن ان کا برتاؤ ان کے ساتھ ہمیشہ بہی خواہی اور عزت و اکرام کا رہا۔

لکھنؤ کے قیام کے دوران شیعہ حضرات بڑی تعداد میں سید صاحبؒ سے ملنے آتے تھے۔ سید صاحبؒ جیسے سنّی مسلمانوں کو عقیدے کی کجی، اور غیر اسلامی عادات و رسوم سے منع کرتے تھے، اسی طرح وہ شیعہ مسلمانوں کو بھی ان باتوں کے ترک کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جس طرح وہ سنّی حضرات کی دعوت قبول کرتے اور ان کے گھر جاتے، اسی طرح شیعہ حضرات کی دعوت بھی قبول کرتے اور ان کے گھر جاتے تھے۔ لکھنؤ میں وہ نواب معتمد الدولہ، جو شیعہ عقیدے پر عامل تھے، کے گھر دو بار تشریف لے گئے، ان کے دسترخوان پر کھانا کھایا، تحائف قبول بھی کئے اور نواب کو خود بھی تحائف دئے۔ (۳۱۵) اسی طرح وہ عظیم آباد میں بھی ایک شیعہ رئیس نواب قطب الدین خان کی دعوت پر ان کے یہاں گئے، کھانا کھایا اور ان کی درخواست پر انہیں اور ان کے اہل خاندان کو بیعت بھی کیا۔ (۳۱۶)

سید صاحبؒ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ بھی عزت و احترام کا معاملہ کرتے تھے۔ ایک بار ایک ہندو افسر دھوکل سنگھ نے ان کی دعوت کی اور کہا کہ جب تک ان کی دعوت قبول نہیں ہوتی، وہ کھڑے رہیں گے۔ سید صاحبؒ نے ان کی دعوت قبول کی اور انہیں بیٹھنے کو

---

(۳۱۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۳۔ (۳۱۵) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۷۱۔۱۷۲۔
(۳۱۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۰۳۔۳۰۴۔ (۳۱۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۶۹۔

کہا۔(۳۱۷) جب سفر حج میں ندی کے کنارے ایک سنسان مقام پر سید صاحبؒ کا پڑاؤ ہوا تو نیل کے ایک انگریز تاجر (جو عیسائی تھا) نے قافلہ کے لئے وہیں کھانا پہنچایا اور دعوت قبول کرنے کی درخواست کی۔ سید صاحبؒ نے بلاتردد اس کی دعوت قبول کی۔ درحقیقت سید صاحبؒ ایک غیر مسلم کی دعوت قبول کر لیتے اور مسلمانوں کی دعوت سے انکار فرما دیتے، اگر شریعت کا یہی تقاضہ ہوتا۔ جب بیگم حیات النساء نے آپ کی دعوت کی تو آپ نے قبول کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ ایک عیسائی مرد کے ساتھ اس کی شریک حیات کی حیثیت سے رہ رہی تھی، حالانکہ ایسا رشتہ ایک مسلم خاتون کے لئے جائز نہیں۔ لیکن جب اسی کے عیسائی شوہر نے انہی مدعو کیا اور کھانے پر گھر بلایا تو سید صاحبؒ نے قبول کر لیا، اس لئے کہ ایک عیسائی پر یہ شرعی قانون لاگو نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک مسلمان خاتون کے ساتھ کیوں رہ رہا تھا۔(۳۱۸)

سید صاحبؒ کا سردار وزیر سنگھ سے، جو راجہ رنجیت سنگھ کا معتمد خاص اور غالباً اس کے اقرباء میں سے تھا، بہت قریبی تعلق تھا۔ یہی وزیر سنگھ ایک بار فقیر عظیم الدین کے ساتھ سید صاحبؒ کے پاس رنجیت سنگھ کا ایک پیغام لے کر آیا تھا۔ اس نے اس اہم گفتگو میں بھی حصہ لیا تھا جو سید صاحبؒ کے نمائندوں اور ونٹورا اور الارڈ (جو سکھ فوج کے کمانڈر تھے) کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ سید صاحبؒ سے رابطہ میں رہا۔ مہر لکھتے ہیں: ''ہر نازک موقعہ پر وہ سید صاحبؒ کو خیر خواہانہ ضروری خبریں بھیجتا رہا۔ اکادکا آنے والے غازیوں کی بھی امداد کرتا رہا۔''(۳۱۹)

رام سنگھ (یا سکھ رام) قادر آباد کے قلعہ کا جو سکھوں کے قبضے میں تھا، قلعہ دار تھا۔ وہ سید صاحبؒ کے وطن رائے بریلی کا رہنے والا تھا اور ان کے آباء اجداد کی شرافت ونجابت سے واقف تھا۔ وہ سید صاحبؒ کو خط بھی لکھا کرتا تھا جن میں سے اب صرف ایک خط محفوظ ہے جو مجموعہ مکاتیب مولانا شاہ اسماعیل، صفحہ ۲۷۹ پر درج ہے۔ مہر لکھتے ہیں: ''اپنے یہاں کے مسلمانوں کو خود سید صاحبؒ کی بیعت کے لئے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہتا تھا۔''(۳۲۰)

رائے بریلی ہی کا رہنے والا منشی مہتاب سنگھ بھی جسے راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ایک خاص مقام حاصل تھا، سید صاحبؒ سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتا تھا۔ ایک بار جب رنجیت سنگھ کی موجودگی میں ایک سکھ نے سید صاحبؒ کے لئے نازیبا الفاظ کہے تو منشی مہتاب سنگھ نے کھل کر اس پر

---

(۳۱۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۶۹-۲۷۰۔ (۳۱۹) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۸۹-۵۹۰۔
(۳۲۰) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۶۴-۵۶۵۔

اعتراض کیا اور کہا کہ اگر راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں یہ روش جاری رہی تو وہ انہیں چھوڑ کر سید صاحبؒ کے پاس چلا جائے گا۔ (۳۲۱)

سرحد کو ہجرت کرتے ہوئے جب سید صاحبؒ گوالیار پہنچے تو وہاں کے مرہٹہ حاکم مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی طرف سے ان کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ مہاراجہ نے سید صاحبؒ اور ان کے سارے مجاہدین کی اپنے محل میں پر تکلف دعوت کی اور ان کی خدمت میں نہایت بیش قیمت تحائف پیش کیے۔ پھر ایک نجی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں مہاراجہ سندھیا اور سید صاحبؒ کے درمیان دیر تک سید صاحبؒ کے مقاصد جہاد پر گفتگو ہوئی۔ مہارانی بیجا بائی نے بھی پردے کے پیچھے سے گفتگو میں حصہ لیا اور سید صاحبؒ کو ریاست کے مہمان کی حیثیت سے گوالیار میں ایک سال قیام کی دعوت دی تا کہ مجاہدین کے لئے ہتھیار اور دیگر ضروری سامان کا انتظام کر دیا جائے۔ مہاراجہ کی درخواست پر سید صاحبؒ نے ان کو روحانی توجہ بھی دی۔ (۳۲۲) سید صاحبؒ نے سرحد سے گوالیار کے وزیر اعظم اور مہاراجہ کے نسبتی بھائی ہندو راؤ کو ایک خط بھی لکھا جس میں انہوں نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تھی اور یہ دعوت دی تھی کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کی فکر کی جائے۔ وہ خط آج بھی محفوظ ہے۔ (۳۲۳)

سید صاحبؒ پوری قوت سے اسلام کی حقانیت کی دعوت دیتے تھے لیکن ان کی تعلیمات یا ان کے رفقاء کے مواعظ و تصانیف دوسرے مذاہب پر بحث و تنقید سے بالکل پاک ہوتی تھیں۔ وہ اپنی تقاریر و تصانیف میں اسلام کی بات کرتے تھے، دوسرے مذاہب کی نہیں۔ محمد ہدایت اللہ لکھتے ہیں:

"ہندو مذہب سے لئے گئے رسم و رواج پر تنقید سے ہمیں یہ تاثر نہیں لینا چاہئے کہ سید احمد یا ان کے رفقاء ہندو مذہب سے بہ حیثیت مذہب اور ہندو قوم سے بہ حیثیت قوم نفرت کرتے تھے۔"

وہ آگے لکھتے ہیں:

"ان کی کتاب صراط مستقیم میں اور دوسری ساری کتابوں میں جو تحریک سے متعلق ہیں، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے دوسرے مذہب یا مذہبی قوم کا کبھی کہیں ذکر کیا ہو، خاص طور پر ہندو اور ہندو ازم کا، اس طرح کہ اسے تردید یا کم از کم تنقید کا نام دیا جا سکے۔ ان کا اصل تعلق اپنے مذہب سے تھا جس کی اصلی حیثیت اور پیغام ہندو مذہب سے لئے گئے رسم

---

(۳۲۱) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۵۸۵۔
(۳۲۲) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۷۴۔۲۷۵۔
(۳۲۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۵۔

رواج کی وجہ سے مجروح ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے لئے وہ ہندوؤں کو مورد الزام نہیں قرار دیتے تھے، بلکہ وہ مسلمانوں کو، خصوصاً خود غرض اور نفس پرست صوفیوں کو جن کے ذریعہ مسلمانوں میں ہندو اعمال داخل ہو گئے تھے، ذمہ دار مانتے تھے۔"(۳۲۴)

محی الدین احمد بھی سید صاحبؒ کی تحریک میں اس مذہبی رواداری اور وسعت قلبی کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

سید صاحبؒ کے کثیر التعداد خطوط اور شاہ محمد اسماعیل کی تصانیف میں ہندوؤں کا کوئی مخالفانہ تذکرہ نہیں ملتا جن کی درحقیقت ہمدردی، بلکہ تعاون تحریک جہاد کو حاصل تھا۔ سید صاحبؒ کا پیغام اصلاً مسلمانوں کے مذہبی تشخص کے کھلے اظہار اور ہر اس سماجی برائی کے مٹانے کے لئے تھا جو اس کی راہ روک رہا تھا اور اس کی شبیہ کو مجروح کر رہا تھا۔ (۳۲۵)

ہم یہی مذہبی رواداری اس رشتے میں دیکھتے ہیں جو پشاور کی فتح کے بعد سید صاحبؒ کا بحیثیت حاکم وہاں کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ پشاور میں ہندو تاجروں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان لوگوں نے سید صاحبؒ کے قیام پشاور کے دوران خود کو کتنا محفوظ محسوس کیا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سید صاحبؒ نے سلطان محمد خان کو پشاور کی حکومت واپس کرنے کا فیصلہ کیا تو سیٹھ بدھ سنگھ ہندو تاجروں کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کے پاس آیا اور ان سے اس فیصلہ کو واپس لینے کی درخواست کی۔ اس نے ہندو تاجروں کی طرف سے پشاور میں اسلامی حکومت کو بھرپور مالی تعاون کا یقین دلایا، اس لئے کہ وہ سید صاحبؒ کی حکومت میں مذہبی رواداری اور انصاف کا منظر دیکھ رہا تھا۔ (۳۲۶)

(۳۲۴) ہدایت اللہ، ۱۲۷۔۱۲۸۔ انگریزی سے اردو ترجمہ میرا ہے۔ (مصنف)۔

(۳۲۵) محی الدین احمد، ۲۸۷۔

(۳۲۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۶۴۸۔۶۵۲۔

اصلاح معاشرہ

> وہ لوگ جو نماز روزے سے بیزار اور بھنگ بوز سے کاروبار رکھتے تھے، شراب وتاڑی ان کے بدن کا خمیر ہو رہا تھا، برملا کہتے تھے کہ نماز [ایسٹ انڈیا] کمپنی کا حکم نہیں اور نہ ہی روزہ [برٹش] کونسل کا آئین۔ زکوۃ وحج کا پھر کیا ذکر ہے؟ شب و روز رشوت وزنا اور مردم آزاری وسود خوری میں مشغول رہتے تھے اور مرد وعورت مثل حیوانات بے نکاح باہم ہوتے۔۔۔۔ محض حضرت [سید صاحبؒ] کی تعلیم سے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نکاح اور ختنے کروائے، نیک اور پاک متقی ہو گئے۔
>
> مولانا علی حیدر رامپوری، صیانۃ الناس

اس باب میں چند ایسے ہی غیر اسلامی عقائد، اعمال اور رسوم کا ذکر ہے جنہوں نے اسلامی سماج کی شناخت ہی مٹا دی تھی۔ ان کے تجزیے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان نقوش کو مٹانا، ان کی جگہ اسلامی تعلیمات کو قائم کرنا اور ان کی عظمت ومحبت دلوں میں پیدا کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ لیکن سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے اس ذمہ داری کو انتہائی کامیابی کے ساتھ اس طرح انجام دیا کہ برائیوں کا سد باب ہوا اور اسلامی اقدار کو ان کا مقام حاصل ہوا۔

ا۔ مروجہ غیر اسلامی رسوم

چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے اسلام کا دامن چھوٹ چکا تھا اس لئے ان کی معاشرتی زندگی میں بہت سی ایسی غیر اسلامی باتیں داخل ہو گئی تھیں جو اسلامی تعلیمات سے براہ راست متصادم تھیں اور ان میں سے بعض تو شرک وبدعت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ مزید خطرے کی بات یہ تھی کہ مسلم سماج نے انہیں بہ رضا ورغبت تسلیم کر لیا تھا اور اب وہ مسلم معاشرہ کا حصہ بن گئی تھیں۔

تعزیہ سازی

سنّی مسلمان بھی محرم میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ تعزیہ نکالتے تھے اور اسے اسلام کا ایک ضروری رکن مانتے تھے۔ اس موقعہ کے لئے بعض ایسے رسوم کو اختیار کرلیا گیا تھا جن کی کوئی اصل کتاب وسنت میں نہیں تھی، مگر جنہیں اسی عقیدت کے ساتھ برتا جاتا تھا جو صرف شرعی احکام کا حق ہے۔ تعزیہ کی تزئین پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتیں۔ تعزیہ، علَم اور پنجہ کو قیمتی کپڑوں اور کبھی چاندی سے آراستہ کیا جاتا۔ امام باڑہ کو کم وبیش مسجد کا تقدس حاصل تھا اور چبوترہ کا مساجد، محلوں اور گھروں میں بنانا عام تھا۔ تعزیہ سازی سے تعلق مسلمانوں کے لئے اسلام سے تعلق کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

چونکہ سید صاحبؒ کا بنیادی پیغام توحید کو اپنانے اور سنت پر عمل کرنے کا تھا، اس لئے جہاں بھی کوئی ایسی بات نظر آئی جو توحید وسنت کے خلاف تھی، انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اسی جذبہ کے تحت تعزیہ سازی کو غیر اسلامی قرار دیا۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء مسلمانوں کو ہر افراط وتفریط سے پاک ان اسلامی تعلیمات کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے جن کی تعلیم براہ راست قرآن وسنت سے ملتی ہے۔ ان کے دعوتی دوروں اور سفرِ حج میں ان کی اس دعوت کو قبول عام حاصل ہوا۔ ان کے خلفاء نے بھی اس دعوت کو پھیلایا۔ نتیجتاً مسلمانوں میں ان رسوم کو جن کی کوئی دینی بنیاد نہیں تھی، چھوڑ دینے کا عام مزاج پیدا ہوگیا۔ یہ بات بہت بڑے پیمانے پر تعزیہ سازی کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آئی۔ مثلاً، اسرولی نامی ایک مقام پر وہاں کے سنّی مسلمانوں نے اپنے بنائے چبوتروں، علم اور پنجہ کو خود توڑ ڈالا، اور تعزیہ میں استعمال ہونے والے کپڑوں اور چاندی کو نکال کر کارِ خیر میں استعمال کیا۔ آس پاس کے دوسرے گاؤں والوں نے بھی ان کی پیروی کی۔ (۳۲۷) چھپری نامی ایک گاؤں کے رہنے والے مسلمان اسلامی تعلیمات سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان کے نزدیک تعزیہ بنانا، مزارات پر منتیں ماننا اور چادر چڑھانا، اور ایسے ہی چند رسوم کا نام اسلام تھا۔ انہوں نے بھی سید صاحبؒ کی تعلیم کے زیر اثر ایسے سب اعمال چھوڑ دیئے اور عقیدے کی تصحیح کے ساتھ اسلامی شریعت کو اپنایا۔ بنارس میں بھی وہاں کے مسلمانوں نے خود برضا ورغبت کئی سو تعزیے توڑ ڈالے۔ دانا پور، پٹنہ میں علی جان نامی ایک شخص نے اپنے گھر سے متصل ایک چبوترہ اور امام باڑہ بنا رکھا تھا۔ سید صاحبؒ کی دعوت سے متاثر ہوکر اس نے چبوترہ توڑ کر وہاں ایک مسجد بنالی اور امام باڑہ کو مسلمان مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ بنالیا۔ (۳۲۸)

(۳۲۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۷۱۔ (۳۲۸) ندوی، سیرت احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۔

مزار پرستی

مسلمانوں میں بزرگوں کے مزارات سے عقیدت اسلامی حدود سے تجاوز کر گئی تھی اور وہ ان بزرگوں کی عقیدت میں حد درجہ غلو کرنے لگے تھے۔ وہ مزارات پر سجدہ کرتے، صاحب مزار بزرگ سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دعائیں مانگتے، انہیں خوش اور راضی کرنے کے لئے مزار پر پھول اور چادر چڑھاتے اور یہ عقیدہ رکھتے کہ ان بزرگوں کی خوشنودی یا ناراضگی سے ان کی کامیابی یا ناکامی جڑی ہے۔ منت ماننے کا رواج عام تھا اور منت پورا ہونے پر بڑے دھوم دھام سے مزار پر حاضری دی جاتی اور مروّجہ رسوم پوری مذہبی عقیدت کے ساتھ ادا کی جاتیں۔ مزاروں پر عرس کا اہتمام کیا جاتا اور میلے لگتے۔

سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے اپنے اصلاحی دوروں، نجی مجلسوں اور عوامی اجتماعات میں مسلمانوں کو ایسے سارے غیر اسلامی رسوم و اعمال سے اجتناب کرنے اور توحید و سنت کو اپنا رہنما اصول مان لینے کی پرزور دعوت دی۔ مثلاً بنارس میں انہوں نے لوگوں کو مزار پرستی سے منع کیا اور تلقین کی کہ کسی غیر مستند بات کو اسلام کا حصہ مان لینے سے پرہیز کریں۔ [۳۲۹] ان کی کوششوں سے مسلم معاشرے میں اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات پر اعتماد بحال ہوا۔ کلکتہ میں حج کے سفر کے دوران ڈھاکہ سے سنّی مسلمانوں کی ایک جماعت سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کا وعظ سنا۔ اس کے بعد انہوں نے ان الفاظ میں اپنے تاثرات بیان کئے:

> ہم لوگ تو جانتے تھے کہ تعزیے بنانا، نشان کھڑے کرنا، پیروں، شہیدوں کی نذر و نیاز کرنا، ان سے مرادیں مانگنا اور شادی غمی میں طرح طرح کے خرافات کرنا، یہی کام دینداروں کے ہیں۔ اب وعظ کے سننے سے معلوم ہوا کہ وہ سب کام برے ہیں اور ان کا کرنے والا مشرک اور بددین ہے۔ ہم لوگ آج تک غلطی پر تھے۔ [۳۳۰]

اس زمانے میں مسلمان اپنے بچوں کے نام اکثر مشہور بزرگوں کے نام پر رکھتے تھے جن کی حیثیت غیر شرعی نسبت کی وجہ سے مشرکانہ ہو جاتی تھی۔ سید صاحبؒ نے اس غلط رجحان کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی۔ اگر کوئی ایسا شخص ان سے ملتا جو ایسا نام رکھتا تھا تو سید صاحبؒ اس کا نام بدل دیتے اور اس کی جگہ کوئی اسلامی نام تجویز کرتے۔ مثلاً، دیوبند میں امام بخش نام کے ایک شخص نے ان سے بیعت کی۔ سید صاحبؒ نے ان کا نام امام الدین رکھ دیا۔ مولانا احمد اللہ عظیم آبادی کا،

---

(۳۲۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۶۔ (۳۳۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۲۔

جو بعد میں تحریک کے ایک اہم رکن ہوئے، پہلا نام احمد بخش تھا۔ سید صاحبؒ نے ہی ان کا نام بدل کر احمد اللہ رکھا۔ فتح علی نام کے ایک شخص جب بیعت کے لئے ان کے پاس آئے تو آپ نے ان کا نیا نام عبدالقدوس رکھا۔ ایسے واقعات سید صاحبؒ اور ان کے خلفاء کی اصلاحی تحریک میں کثرت سے پیش آئے۔ سید صاحبؒ کی تعلیم کی برکت سے نہ صرف ایسے مشرکانہ نام رکھنے کا رواج معدوم ہوگیا، بلکہ مسلمانوں میں بزرگوں کے مزارات سے تعلق میں بھی اعتدال پیدا ہوگیا۔ بزرگوں کا پورا پورا احترام باقی رہا لیکن اس سلسلے میں عملی بے ضابطگی اور غلو کی بیخ کنی ہوئی۔ (۳۳۱)

غیر اسلامی رسوم و تیوہار

اسلامی تعلیمات سے کٹ جانے کی وجہ سے مسلمان دین سے انحراف کا شکار ہوگئے تھے، حتیٰ کہ ان کے یہاں یہ عقیدہ بھی پایا جاتا تھا کہ اللہ کے علاوہ دوسری طاقتیں بھی انہیں نفع ونقصان پہنچانے پر قادر ہیں اور انہیں بھی راضی رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً، ان کا عقیدہ ہوگیا تھا کہ چیچک کی بیماری ایک دیوی کے اثر سے کسی کو لگتی ہے اور مریض کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس دیوی کو خوش کرنے کے لئے کچھ مخصوص رسوم ادا کئے جائیں۔ مسلمان ہندو تیوہاروں میں جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے اور ان میں ایسے اعمال بھی کرتے تھے جن سے اسلام منع کرتا ہے۔ جیسے ان دیوی، دیوتاؤں کی پوجا جن کے نام پر وہ تیوہار منائے جاتے تھے۔ ایسے تیوہاروں کے سامنے مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی تیوہار، عید اور بقرعید، بے وقعت ہو کر رہ گئے تھے۔ بنارس کے لوگوں نے سید صاحبؒ کو وہاں کے نوچندی میلے میں مسلمانوں کی دلچسپی کے بارے میں بتایا کہ "اس نوچندی میلے میں لباس و پوشاک کا ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ عیدین میں اس کا چوتھائی حصہ بھی نہیں ہوتا۔" (۳۳۲)

مسلمانوں نے ہندو تیوہاروں کی نہج پر ایسے اسلامی تیوہار بھی بنا لئے تھے جن کا نہ صرف اسلام میں کوئی نام ونشان نہ تھا، بلکہ وہ اسلامی عقیدے سے بھی براہ راست متصادم تھے۔ ان کے بھی اپنے میلے لگتے تھے اور بزرگوں کے مزار پر منائے جانے والے عرس کی حیثیت تیوہار سے کم نہ تھی۔ پھر وہ ان چیزوں کو اللہ کا حکم اور اسلام کا رکن سمجھ کر کرتے تھے۔ اس بات کا واضح ثبوت چاٹگام، بنگال کے مسلمانوں کے مندرجہ ذیل اعتراف میں ملتا ہے جو ان کے یہاں رواج پا گیا تھا اور جسے وہ اپنا دین سمجھ کر برتتے تھے: "جو لوگ دونوں عیدوں کے تیوہار کرتے ہیں، وہ اپنے کو بڑا

---

(۳۳۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۶۲، ۱۶۴۔ (۳۳۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۵۔

مسلمان جانتے ہیں، اور بعض لوگ عیدین اور محرم بھی کرتے ہیں اور ہولی، دسہرا بھی کرتے ہیں۔ بھوانی کی پوجا بھی کرتے ہیں، پیروں، شہیدوں کی نذر و نیاز بھی کرتے ہیں۔"(۳۴۳)

سید صاحبؒ نے کھل کر ایسے عقائد اور اعمال پر تنقید کی اور پوری فکر اور قوت کے ساتھ مسلمانوں کو سیدھی اور سچی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی۔ ہدایت اللہ لکھتے ہیں: "ان سماجی برائیوں، جیسے پھیلی ہوئی مزار پرستی، مسلمانوں کی ہندو میلوں میں شرکت، ہندو دیوتاؤں کی عبادت، اور مزارات اور قبور پر حاضری کے خلاف سید احمدؒ نے جہاد برپا کیا۔"(۳۴۴)

انسانی شبیہ رکھنے والے مجسمے اور کھلونے

ان دنوں بعض مقامات پر مسلمان اپنے گھروں میں ایسے کھلونے اور زینت کے سامان رکھتے تھے جن پر انسانوں اور کبھی جانوروں کی شبیہ بنی ہوتی۔ سید صاحبؒ نے مسلمانوں میں اس بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی کوشش کی۔ بنارس میں جب سید صاحبؒ دین محمد نامی اپنے ایک مرید کے گھر گئے تو اس مکان کے طاقوں میں طرح طرح کے صدہا کھلونے رکھے تھے۔ کہیں آدمیوں کی مورت تھی، کہیں جانوروں کی۔ سید صاحبؒ کو یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ وہ اسے اسلامی معاشرت کے منافی اور بت پرستی کے لئے ذہن کو سازگار کرنے والا ایک رواج سمجھتے تھے۔ اس گھر کی خواتین نے بھی سید صاحبؒ سے بیعت کی۔ سید صاحبؒ نے پہلے انہیں اسلام کی بنیادی باتوں کی تلقین کی اور اپنے گھر میں اسلامی ماحول قائم کرنے کی ہدایت دی، اس کے بعد انہیں تعزیہ سازی اور انسان یا دوسری جاندار چیزوں کی شبیہ رکھنے والی اشیاء کے گھر میں رکھنے کی برائی سمجھاتے ہوئے ان باتوں سے مکمل طور پر پرہیز کرنے کی تلقین کی۔ (۳۴۵)

شراب نوشی

سید صاحبؒ کے زمانے میں مسلمانوں میں شراب نوشی نہ صرف عام ہوگئی تھی بلکہ اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: "شراب نوشی عام تھی، نشہ آور چیزوں (افیون، بھنگ، تاڑی وغیرہ) کا استعمال گھر گھر تھا جس سے اخلاق کے ساتھ قوائے عقلیہ اور صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔"(۳۴۶) سید صاحبؒ اور ان کے خلفاء نے پوری قوت کے ساتھ

---

(۳۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۲۳۔ (۳۴۴) ہدایت اللہ، ۳۹۔

(۳۴۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۳۔۲۹۴۔ (۳۴۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۶۴۔

اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کی دعوت میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ جو شرابی ایک بار ان سے رابطے میں آ گیا، اس نے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب سید صاحبؒ حج کے سفر میں کلکتہ پہنچے تو شہر اور قریبی مضافات سے مسلمانوں نے بہت ہجوم کیا۔ وہاں بھی مسلمانوں میں شراب نوشی کی عادت عام تھی۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے مواعظ سے بہت بڑے پیمانے پر لوگوں کی اصلاح ہوئی۔ یہ تبدیلی اتنی گہری، وسیع اور دیرپا تھی کہ شراب کے ٹھیکہ داروں نے کلکتہ کے متعلقہ افسر کو درخواست دی کہ انہیں اس سال ٹیکس سے معافی دی جائے، اس لئے کہ سید صاحبؒ کے کلکتہ میں ورود کے بعد ان کے سارے مسلمان گاہکوں نے شراب نوشی سے اس طرح توبہ کر لی ہے کہ اب کوئی ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ (۳۳۷)

پیشہ ور خواتین

سماج میں ناچنے گانے کا پیشہ کرنے والی عورتوں کی موجودگی نہ صرف عام تھی، بلکہ بدقسمتی سے انہوں نے معاشرے میں ایک حد تک عزت کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> بازاری عورتیں دینی مجالس سے لے کر ہر مجلس کی زینت تھیں۔ حد یہ ہے کہ بعض شرفاء، اپنے لڑکوں کو ان کے پاس زبان اور علم مجلس کی تعلیم کے لئے بھیجتے تھے۔۔۔۔ بیسوا اور زنانِ بازاری شہری زندگی اور معاشرت کا اہم عنصر اور جزو لاینفک تھیں، جن کی حکایات و روایات، محاورات و اصطلاحات اور تلمیحات و کنایات سے ادب و زبان، تحریر و انشاء اور اخلاق و عادات سب متاثر اور رنگین تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت اور مجلس اور خانگی زندگی کا جو نقشہ "دریائے لطافت" میں نظر آتا ہے، اس سے تہذیب کی آنکھیں نیچی اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہے۔ (۳۳۸)

جب سید صاحبؒ کی اصلاح حال اور اصلاح معاشرہ کی دعوت عام ہوئی تو بہت سی پیشہ ور عورتوں نے اپنے پیشے سے توبہ کر لی اور ایسی پاکیزہ زندگی اختیار کی جو بعض انداز سے گھریلو خواتین کے لئے بھی قابل رشک تھی۔ مثلاً دانا پور، پٹنہ میں بکثرت پیشہ ور عورتوں نے اپنی گناہ گارانہ زندگی سے توبہ کی، سابقہ پیشے کے ذریعہ کمائی ہوئی ساری دولت یکسر چھوڑ دی اور سادہ اور پاک زندگی اختیار کر کے دل کا سکون اور اللہ کی رضا حاصل کی۔ (۳۳۹) عظیم آباد میں گانے بجانے کا پیشہ کرنے والی ایک ڈومنی اپنی لڑکی اور دو لڑکوں کے ساتھ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی

(۳۳۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۱۸۔ (۳۳۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۶۴۔۶۵۔
(۳۳۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۸۔

اور اپنے حرام پیشے سے توبہ کیا۔ سید صاحبؒ نے انہیں مرید بھی کیا اور اپنے حج کے قافلے میں بھی شامل کر لیا۔ (۳۴۰) اسی سفر حج میں ایک دوسری بازاری عوت بھی تائب ہوئی اور اس مبارک قافلے کے ساتھ حج کی سعادت سے سرفراز ہوئی۔ (۳۴۱) ایک دن جب سید صاحبؒ ایک علاقے سے اپنے رفقاء کے ساتھ گزر رہے تھے تو ایک پیشہ ور عورت نے آپ کو دیکھا۔ نگاہ پڑتے ہی اس کے دل کی حالت کچھ ایسی بدلی کہ وہ بے اختیار دوڑتی باہر آگئی اور سید صاحبؒ سے فرمایا کہ وہ اس ذلیل پیشے سے نجات حاصل کرنے میں اس کی مدد فرمائیں۔ اس وقت اس کے گھر میں اس کے نو (۹) شناسا مرد موجود تھے۔ سید صاحبؒ نے ان میں سے ایک سے جس سے وہ سب سے زیادہ مانوس تھی اس کا نکاح کر دیا۔ ان نو اشخاص نے بھی سید صاحبؒ سے بیعت کی۔ پھر وہ سارے لوگ سرحد کو ہجرت میں شریک ہوئے اور وہ نو کے نو افراد شہادت سے سرفراز ہوئے۔ وہ خاتون لشکر میں موتی نامی ایک دوسری خاتون کے ساتھ جو مولانا شاہ اسماعیلؒ کی دعوت پر پیشہ وارانہ زندگی سے تائب ہوئی تھی، وہاں چھوٹے بڑے کام للہ فی اللہ سر انجام دیتی تھی۔ (۳۴۲)

کھانے کی غیر اسلامی عادات و رسوم

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً، وہ کھانے میں نظم و سلیقہ اور رزق کی قدر دانی کی تعلیم دیتا ہے اور اس کی بربادی سے منع کرتا ہے۔ اس زمانے کے مسلمانوں نے ہندو تہذیب کے زیر اثر بعض عادتیں اور رواج اختیار کر لئے تھے اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مثلاً مسلمان عورتیں ہر روز گوبر لیپ کر اور چوکا دے کر کھانا پکاتیں۔ مرد جوتا پہن کر مطبخ میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ جب وہ کھانے آتے تو ایک طرف بیٹھ کر بعض ننگے سر اور بعض سر پر کپڑا باندھ کر کھانا کھاتے اور جو کھانا ان کی تھالی میں بچ جاتا، اسے پھینک دیتے۔ وہ ان برتنوں کو نہیں چھو سکتے تھے جن میں کھانا پکایا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے استعمال شدہ برتن دھو کر رکھ دیتے تھے۔ تہوار اور شادی میں کھانے کی بہت بربادی ہوتی تھی۔ وہ عموماً کیلے کے پتے پر کھاتے اور جو کچھ بچ رہتا، اسے دوسروں کے لئے ناپاک سمجھ کر پھینک دیتے۔ بعض علاقوں میں وہ بکری کا گوشت کھاتے اور بکرے کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے۔ مولانا

---

(۳۴۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۰۴۔ (۳۴۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۲۔

(۳۴۲) امیر شاہ خان، امیر الروایات، ۱۴۹۔۱۵۴۔

ابوالحسن علی ندوی کے مطابق، الہ آباد سے کلکتہ تک تمام شہروں اور بستیوں میں، کیا شرفاء اور کیا غرباء علی العلوم برسوں سے کھانے کے یہی رسوم برتے جاتے تھے۔

سید صاحبؒ نے ان رسوم کے خلاف آواز بلند کی۔ الہ آباد میں انہوں نے اس کے بارے میں ایک موقعہ پر فرمایا:

"یہ کھانا نعمت الٰہی ہے اور جناب سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے جوٹھے میں شفا ہے۔ سو اس کو اس طرح ذلت و خواری کے ساتھ پھینکنا جیسے کوئی گندگی کو پھینکتا ہے، کمال بے ادبی اور نہایت بری رسم ہے۔" چنانچہ الہ آباد میں آپ نے حافظ اکرام الدین صاحب سے فرمایا کہ "جہاں کہیں تم وعظ کہنا اور شرک و بدعت کی برائی بیان کرنا، وہاں اس رسم بد کی بھی برائی ضرور بیان کرنا اور یہ بری عادت لوگوں سے چھڑانا۔"

اسی طرح ان کے کلکتہ کے قیام کے دوران جب سلہٹ، چاٹگام اور آسام کے لوگ ان سے ملنے آئے اور اپنے اپنے علاقوں میں انہیں غیر اسلامی رسوم کا ذکر کیا تو سید صاحبؒ نے وہاں اپنے خلفاء مقرر فرمائے اور انہیں ان کے تدارک کی ذمہ داری سونپی۔ (۳۴۳)

سلام مسنون کا ترک

مسلمانوں نے سلام کا مسنون طریقہ ترک کر دیا تھا اور اس کی جگہ "تسلیمات"، "آداب"، اور "بندگی" جیسے الفظ کہنے کا رواج قائم ہو گیا تھا۔ یہ چلن اتنا زور پکڑ گیا تھا کہ سلام کے شرعی الفاظ "السلام علیکم" کہنا خلاف تہذیب سمجھا جانے لگا تھا۔ اگر کوئی عمر یا رتبے میں چھوٹا اپنے بڑے کو "السلام علیکم" کہہ کر سلام کرتا تو بڑا اسے اپنی ہتک عزتی سمجھتا تھا۔ اس طرح ایک معروف و مستند سنت کی تضحیک کی جا رہی تھی۔ یہ غیر اسلامی تصور و رواج مسلمانوں کے ذہن و دل میں رچ بس گیا تھا۔ اور عام مسلمانوں میں پوری طرح رائج ہو گیا تھا۔ مولوی شمس الدین دیوبندی سید صاحبؒ کے ارادت مند تھے اور ملنے والوں کو مسنون طریقے سے سلام کیا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک شاگرد نے ان کے والد کو "السلام علیکم" کہہ کر سلام کیا تو وہ ناراض ہو گئے اور کہا: "مجھے معلوم ہے کہ کس نے سکھایا ہے۔ میں اس سے سمجھوں گا۔" (۳۴۴)

حد تو یہ ہے کہ سلام کا مسنون طریقہ دیندار خاندانوں میں بھی متروک ہو گیا تھا، حتیٰ کہ حضرت

(۳۴۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۷۶۔۲۷۷ اور ۳۲۳۔

(۳۴۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۶۱۔۱۶۲۔

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ جیسے عالم باعمل کے خاندان میں بھی اس پر عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ جب سید صاحبؒ پہلی باران کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں "السلام علیکم" کہہ کر مخاطب کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے اہل خاندان کو ہدایت دی کہ آئندہ سلام مسنون کو ہی اپنایا جائے۔ (۳۴۵)

جب سید صاحبؒ کو قبول عام حاصل ہوا تو ان سے تعلق رکھنے والے ہر شخص نے سلام کا مسنون طریقہ ہی اپنالیا اور اس طرح یہ متروک سنت پھر سے زندہ ہوگئی جس کا اندازہ آج کے مسلم معاشرے میں اس کے رواج سے کیا جاسکتا ہے۔ سید صاحبؒ خود بھی اس پر عمل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے۔ حج کے سفر میں جب وہ جہاز تک پہنچنے کے لئے کشتی پر سوار ہونے لگے تو خدا حافظ کہنے کے لئے آئے ہوئے معتقدین کی بہت بڑی تعداد دریا کے کنارے جمع تھی۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بلند آواز سے "السلام علیکم" کہا۔ بہار میں باڑھ نامی مقام پر ایک مسلمان نے ملاقات کے وقت "آداب" یا "بندگی" کہا۔ سید صاحبؒ نے اس کو اور وہاں موجود دوسرے مسلمانوں کو سلام کرتے وقت "السلام علیکم" کے مسنون الفاظ کہنے کی تاکید کی۔ (۳۴۶)

سید صاحبؒ کی جہد مسلسل نے سماج کے اقدار بدل دیئے اور عوام وخواص سب کے دل میں سلام مسنون کی عظمت پیدا کردی۔ حیدرآباد کے فرمانروا نواب نصیر الدولہ کے بھائی نواب مبارزالدولہ نے سید صاحبؒ کی کتاب صراط مستقیم اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کی کتاب تقویۃ الایمان پڑھی اور ہر غیر اسلامی بات سے یکسر ناطہ توڑلیا۔ انہوں نے حکم جاری کیا کہ ان کے دربار میں سلام کرتے وقت "السلام علیکم" ہی کہا جائے اور اُن الفاظ کو ترک کردیا جائے جو درباری نظام میں رائج تھے۔ ان کے گھر، دربار اور زیر اثر علاقے میں شرعی احکام پر ہی عمل ہوتا تھا۔ (۳۴۷)

۲۔ گمراہ صوفی طریقے

سماج میں غیر اسلامی تصورات کو در لانے اور عام کرنے میں اس زمانے کے گمراہ اور نام نہاد صوفی افراد اور اداروں کا بڑا دخل تھا۔ تصوف جس نے ہندوستان میں اسلام کو پھیلانے اور جمانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اب ایک ایسی اندرونی لہر کا شکار ہوگیا تھا جو مخالف سمت میں بہ رہی تھی، اور اس کے دامن میں ایسے غیر اسلامی رجحانات پرورش پا رہے تھے جن کا مقصد اسلام کے نام پر ذاتی مفاد حاصل کرنے کی غرض سے عوام کے استحصال کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

(۳۴۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۱۴۔ (۳۴۶) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۲۰۳۔

(۳۴۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۱۷۰۔۱۷۱۔

مروجہ باطل رسوم

گمراہ نفس پرستوں نے اپنے مفاد کے لئے خود کو صوفی کے طور پر سماج میں متعارف کر کے تصوف کی تعلیمات کو ایک چیستان بنا دیا تھا۔ اس کے بجائے کہ وہ تزکیۂ نفس میں لوگوں کی رہنمائی کرتے اور نفسانیت اور مادہ پرستی کے جال سے نکلنے اور اخلاص و تعلق مع اللہ حاصل کرنے میں ان کی مدد کرتے جو تصوف کا اصل میدان تھا، انہوں نے اپنے اپنے روحانی سلسلے کے اکابرین کی برتری اور کمالات کے تراشیدہ قصے اور کہانیوں کو پھیلانا اپنا معمول بنا لیا اور اس سلسلے کو کھانے کمانے کے ایک پیشے میں تبدیل کر دیا۔

وہ غیر اسلامی رسوم جن کی وہ ہمت افزائی کرتے تھے، صرف عرس اور چہلم کی تقریبات کے انعقاد، بزرگوں کے مزارات کی تزئین، ان پر یادگار عمارتوں کی تعمیر اور وہاں اپنی حاجتوں کے پورا ہونے کے لئے منت ماننے تک ہی محدود نہیں تھیں۔ بہت سے گمراہ اور گمراہ کن پیشہ ور ایسے بھی تھے جو جاہل عوام کو فرض نماز اور رمضان کے روزے کی ذمہ داری سے بھی بری کر دیتے تھے۔ بنارس میں سید صاحبؒ کی ملاقات ایک ایسے ہی پیشہ ور پیر سے ہوئی جنہوں نے سید صاحبؒ کو اپنے طریقے کے بارے میں ان الفاظ میں بتایا: ''حضرت سلامت! ہماری تو وجہ معاش یہ ہے کہ تمام مریدوں کے یہاں ششماہی مقرر ہے۔ اور یہ لوگ پیشہ ور ہیں، ان سے پنج وقتی نماز کہاں ہو سکتی ہے۔ اس کی معافی میں یہ ہم کو چھٹے مہینے مقدور کے موافق کچھ زر نقد نذر کرتے ہیں۔'' اس نے آگے بیان کیا: ''مگر رمضان کے روزوں کی ہم ان کو بہت تاکید کرتے ہیں۔ جو کوئی عذر کرتا ہے کہ ہم حقہ پیتے ہیں یا کوئی نشہ کھاتے ہیں، ہم سے روزہ نہیں رہا جاتا تو ہم ان سے ششماہی کے سوا کچھ اور نقدی یا دو چار دعوتیں وغیرہ ٹھہرا کر ان کو معاف کر دیتے ہیں۔'' یہ واقعہ بیان کرتے وقت سید صاحبؒ نے فرمایا: ''فی الحقیقت اس وقت کے پیروں کا یہی دستور ہے اور اسی آمدنی پر ان کی گزران ہے۔''

ایسے گمراہ پیروں نے معاشرے میں اپنی جگہ بنالی تھی اور ان کے طریقوں کو مسلمانوں نے راہ نجات مان لیا تھا۔ جیسا کہ اسی پیر کے مریدوں نے بعد میں کہا: ''ہم تو آج تک اسی کو دین اسلام اور خدا کی راہ جانتے تھے جس پر وہ ہم کو چلاتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم لوگ غلطی پر تھے۔ دین حق اور خدا کا طریق یہ ہے کہ جو آپ تعلیم فرماتے ہیں۔ اب ہم نے ان سب اگلی باتوں سے توبہ کی۔'' (۳۴۸)

---

(۳۴۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۸۶۔۱۸۷۔

سنت سے انحراف کی بہت سی رسوم معاشرے میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ رائے بریلی سے مشرق کی جانب سلون کی خانقاہ میں عرس کے موقعہ پر علاوہ دوسرے رسوم کے گاگر اٹھانے کی رسم مدت سے چلی آرہی تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مانکپور اور سلون دونوں جگہ دستور تھا کہ سجادہ نشین کوراگھڑا سر پر اٹھا کر لاتے اور ان کی اتباع میں دوسرے مرید وخدام بھی کورے گھڑے اٹھائے ہوئے چلتے اور قوالی ہوتی۔'' چونکہ اس خاندان کے بزرگوں نے دین کی بڑی خدمات انجام دی تھیں، اس لئے سید صاحبؒ نے اس وقت کے سجادہ نشین شاہ کریم عطا صاحبؒ کو ان کے مقام بلند کی دہائی دی اور فرمایا: ''آپ لوگ درویش وہادی دین ہیں، آپ کے اقوال وافعال عوام الناس کے نزدیک حجت اور دستاویز ہوتے ہیں۔ یہ جو ہر سال آپ عرس کرتے ہیں اور اس میں جو منہیات شرعیہ ہوتی ہیں، ازراہ انصاف فرمایا جائے کہ یہ طریقہ سنت سنیہ کے موافق ہے یا مخالف۔ اگر موافق ہے، فہوالمراد، ورنہ اس کو ترک کردینا چاہیے۔''(۳۴۹)

اسی طرح سرحد میں اسقاط (گناہوں کے کفارہ) کی رسم بہت اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ کسی مسلمان کے انتقال کے موقعہ پر اس کے اعزہ، علماء کی ایک مجلس منعقد کرتے تھے جس میں قرآن مجید کا ایک نسخہ لایا جاتا تھا اور حلقے میں بیٹھے ایک عالم کے ہاتھ میں دیا جاتا تھا۔ وہ اسے اپنے پہلو میں بیٹھے دوسرے عالم کے ہاتھ میں دیتا تھا۔ اس طرح پورے حلقے سے ہوتے ہوئے وہ قرآن پھر پہلے عالم کے پاس آجاتا تھا۔ اس کے بعد یہ مان لیا جاتا تھا کہ مرنے والے کے گناہ معاف ہو گئے۔(۳۵۰) ایسے دوسرے کئی مروجہ رسوم دینی اعتقاد کے ساتھ منائے جاتے تھے اور لوگوں کو خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ان کی اسلامی حیثیت کیا ہے۔

صوفی طریقوں پر شریعت کی بالادستی کی دعوت

سید صاحبؒ نے ایسے سارے غیر اسلامی تحریفات کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے واجب الترک ہونے پر بہت زور دیا۔ انہوں نے گمراہ صوفیوں کی بھی کھل کر تنقید کی۔ انہوں نے عوام میں رائج اس باطل اعتقاد کی بھی پرزور تردید کی کہ بیعت کے بعد پیر اپنے مرید کو جنت میں داخل کرانے کا ضامن ہوجاتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''یہ محض ان کا خام خیال اور وہم ہے۔ پیر صاحب خود

(۳۴۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۸۲۔۱۸۳۔ (۳۵۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۷۷۔

اپنے ہی مآل خیر سے بے خبر ہیں، کچھ نہیں جانتے کہ قیامت کے دن ہمارا کیا حال ہوگا اور وہاں کا تو حال دریافت کرنا امر محال ہے۔"(۳۵۱)

گرچہ وہ خدا کے فضل سے زبردست باطنی قوت کے حامل تھے، لیکن انہوں نے علی الاعلان یہ فرمایا کہ کسی مرید کو باطنی فائدہ پہنچانا ان کے بس میں نہیں، بلکہ خدا کے فضل پر منحصر ہے:

> اگر کوئی کہے کہ سید احمد کی توجہ میں بڑی قوی تاثیر ہے تو اس کو کاذب اور مفتر سمجھنا چاہئے۔ یہ معاملہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو میں نے چاہا کہ فائدہ ہو اور بڑی کوشش کی۔ ان کو ذرا نفع نہ ہوسکا۔ اور بعض لوگوں کی طرف میرا خیال بھی نہ تھا، لیکن ان کو اتنا فائدہ پہنچا کہ اعلیٰ مراتب ولایت تک پہنچ گئے۔ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور بالکل من جانب اللہ بات ہے۔ (۳۵۲)

لیکن سید صاحبؒ ان مخلص صوفی بزرگوں کے ہمیشہ قائل اور ممنون رہے جنہوں نے مسلمانوں کی ایک انتہائی بڑی تعداد کو اخلاق حسنہ کا سبق سکھایا، تزکیۂ نفس میں ان کی مدد کی اور رضاء الٰہی کے راستہ پر چلنے میں ان کی رہنمائی فرمائی۔ خود اپنی تربیت کے لئے وہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ممنون احسان تھے اور جانتے تھے کہ سارے روحانی مربیوں نے لوگوں کو اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات سے جوڑنے کا کام کیا تھا۔ وہ تصوف کی حقیقت کو اندر سے جانتے تھے اور ذاتی طور پر اسے برت چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے تصوف کے روحانی سلسلوں سے انکار نہیں کیا، بلکہ ان غیر اسلامی رسوم کو اس نظام سے دور کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی جو اس میں بعد میں پیدا ہوگئی تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے صحیح فرمایا: "سب مشائخ طبیب امت ہیں۔ اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے انہوں نے طریق رکھے ہیں۔ سب کا مآل ایک ہے اور سب کا خلاصہ اتباع سنت ہے۔ بعد کو لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں۔ ان کے مجدد حضرت سید صاحبؒ ہوئے۔"(۳۵۳)

سید صاحبؒ تصوف کے چاروں معروف سلسلے۔ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور مجددیہ۔ میں بیعت لیتے تھے جن میں اصل زور تزکیۂ باطن پر تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ "طریقۂ محمدیہ" میں بھی لوگوں سے بیعت لیتے تھے جو تزکیۂ نفس کا ایک نیا سلسلہ تھا اور جسے انہوں نے خود ایجاد کیا تھا۔ اس طریقے میں مریدوں کو زندگی کے ہر کام ظاہراً بھی سنت کے مطابق کرنے کی تاکید کی جاتی تھی۔

---

(۳۵۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۵۔
(۳۵۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۴۰۔
(۳۵۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۵۴۔

اس طرح مذکورہ بالا چاروں سلسلوں کے اصولوں کے مطابق ایک طرف اگر طالبوں کو دل کی برائیوں اور غلط رجحانات، مثلاً حرص وطمع، حسد، بدخواہی، دھوکہ دہی وغیرہ سے بچنے کی تاکید کی جاتی تھی، تو اس کے ساتھ ہی انہیں "طریقہ محمدیہ" کے تحت کھانے پینے، سونے جاگنے، نکاح وشادی، پہننے اوڑھنے، زراعت، تجارت اور نوکری اور اس طرح روزمرہ کے ظاہری اعمال میں بھی سنت کی پیروی اور اللہ کی رضا کی نیت کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (۳۵۴)

اور ان سب کے لب لباب کے طور پر بیعت لیتے وقت سید صاحبؒ اپنے مریدوں کو دو باتوں "توحید وسنت" پر مضبوطی سے قائم ہوجانے اور دو باتوں "شرک وبدعت" کو یکسر ترک کردینے کی تاکید فرماتے تھے۔

سید صاحبؒ نے بیعت کی شرعی غرض وغایت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا۔ ایک موقعہ پر انہوں نے فرمایا: "بیعت کرنا اسی کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں آدمی سچے دل کے ساتھ سب بری باتوں سے توبہ کرے اور ان کو چھوڑ دے۔ نہیں تو بیعت کرنا، نہ کرنا برابر ہے۔" دوسرے موقعہ پر انہوں نے اپنی بات ان الفاظ میں رکھی: "جو کام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے، سب کو ترک کردو۔ تب اس بیعت کرنے کا تم کو فائدہ ہوگا۔ نہیں تو محض لاحاصل ہے۔ نہ میں ان کا پیر ہوں، نہ وہ میرے مرید۔" (۳۵۵)

سید صاحبؒ نے بیعت کے مقصد کو جتنا واضح طور پر اپنے مریدوں کے سامنے پیش کیا، انہوں نے بھی اس کو اسی طرح صحیح طور پر اور صاف صاف سمجھا۔ اس کی واضح مثال ہمیں تلو کا نامی ایک شخص کے واقعہ میں ملتی ہے جو پیشہ سے چمار تھا۔ اس کے دوست عبداللہ اور جھولا نے سید صاحبؒ سے بیعت کی اور تلوکا کو بھی ان سے بیعت ہونے کی تلقین کی۔ تلوکا غیر تعلیم یافتہ تھا اور بیعت کے معنی ومطلب سے بھی ناآشنا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ بیعت کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "بری باتوں سے توبہ کرنا، اس کو بیعت کہتے ہیں۔"

بیعت کی یہ سادہ تعریف جو ایک عامی شخص نے مندرجہ بالا الفاظ میں بلاتکلف بیان کی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے حلقے میں، جو غیر معمولی طور پر بہت وسیع تھا، بیعت کے مفہوم اور مقصد پر غیر مستند رسم ورواج یا غیر اسلامی تصورات کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں پڑا تھا

---

(۳۵۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۱۱-۵۱۲۔ اور مہر، جماعت مجاہدین، ۲۱۷۔

(۳۵۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۹۴ اور ۲۹۶۔

اور وہ بیعت کو بری باتوں سے توبہ کرنے اور انہیں چھوڑ دینے کا ایک عہد ہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب تلوکا نے سید صاحبؒ سے بیعت کی تو سید صاحبؒ نے اس کے دوست عبداللہ سے فرمایا: "اس کی تعلیم تمہارے ذمہ ہے۔ روزے، نماز کے مسائل سکھاؤ اور نماز پڑھاؤ۔" (۳۵۶) اس سے یہ بات مزید واضح ہوتی ہے کہ سید صاحبؒ کے نزدیک بیعت کا مقصد ایک مسلمان کو اسلام کے شرعی احکام پر ڈالنا تھا۔

سید صاحبؒ کے خلفاء کا شریعت پر زور

یوں تو سید صاحبؒ کی جماعت کا ہر فرد توحید و سنت پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرتا اور اسی کی دعوت دیتا تھا، لیکن خصوصاً ان کے سارے خلفاء نے جنہیں انہوں نے اپنے سلسلے میں بیعت لینے کی اجازت دی تھی، شریعت کی غیر مشروط برتری کی تبلیغ و ترویج کو اپنا نصب العین بنایا اور اس راہ پر پوری ہمت کے ساتھ قائم رہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں اس بات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں:

سید صاحبؒ اپنے ایک خلیفہ کے نام ایک مکتوب میں توحید و سنت کے مقام بلند کی ان الفاظ میں وضاحت فرماتے ہیں:

> بیعتِ طریقت کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضامندی کا راستہ ہاتھ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کی رضامندی منحصر ہے شریعت کی پیروی میں۔ جو شخص شریعت محمدی کے سوا کسی اور راستے کو حصول رضاء خداوندی کا ذریعہ سمجھتا ہے، وہ شخص جھوٹا اور گمراہ ہے اور اس کا دعویٰ باطل اور نا مسموع۔ اور شریعت کی بنیاد دو باتوں پر ہے: ایک ترک اشراک، دوسرے ترک بدعات۔ (۳۵۷)

اور سید صاحبؒ کے خلیفہ حاجی عبدالرحیم ولایتیؒ اپنے خلیفہ میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کو بیعت لینے کی اجازت دیتے وقت لکھتے ہیں:

> ضروری مدعا یہ ہے کہ آپ کو (بیعت لینے کی) اجازت ہے۔۔۔۔ اہم مقصد و مطلوب یہ ہے کہ انسان خود بذاتہ شریعت پر ثابت قدم ظاہراً و باطناً ہر وقت رہے اور ہر طرح کے شرک و بدعت سے پاک رہے۔ اسی طرح سے دوسرے مومنین مخلصین کی ہدایت اس کے پیش نظر رہے۔ (۳۵۸)

---

(۳۵۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۸۔۲۸۹۔ (۳۵۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۲۔

(۳۵۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۶۔

اور میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے خلیفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے خلفاء کو ہدایت دیتے ہیں:

> ہر مرید سے یہ کہلانا چاہیے کہ میں تمام ان دینوں سے جو شرک و کفر کے حامل ہیں اظہار بیزاری کرتا ہوں اور اللہ اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہوں اور دین اسلام کو اپنا دستور العمل بناتا ہوں اور اپنے گناہوں پر اظہار شرمندگی کرتا ہوں اور ان سے پرہیز کا عہد کرتا ہوں اور محض خدا کی رضا مندی کے لئے دنیا اور اس کے لذات کو ترک کرتا ہوں [وہ آگے فرماتے ہیں کہ پیر کو چاہئے کہ مرید کے گوش گزار کر دے کہ] اپنے مقصد میں کامیابی بغیر پابندیٔ شرع کے نہیں ہو سکتی، اس واسطے احکام شرع کی پابندی ضروری ہے۔ اور اس کے عقائد کی اصلاح کرے اور بتا دے کہ جو مکاشفہ خلاف شرع ظاہر ہو وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور محرمات سے اجتناب اور کبائر سے پرہیز کی تاکید کرے اور بتائے کہ تمام اشغال پر احکام شرعی مقدم ہیں۔ (۳۵۹)

اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء، مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ (دار العلوم دیو بند کے بانی) اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے خلفاء کو اور ان سب نے اپنے بعد آنے والے حضرات کو ہر حال میں شریعت کی اتباع اور اس کی بالاتری کے پیغام کو عام کرنے کی تاکید کی۔ وہ سب لوگ جو سید صاحبؒ کے روحانی سلسلے سے منسلک رہے، شریعت کی تعظیم میں منفرد رہے۔ مولانا غلام رسول عرف مولانا عبد اللہ (قلعہ میہان سنگھ والے) جو اپنے وقت کے مشہور عالم دین و مصلح تھے، ملاّ سید میر صاحب کوٹھا جو سید صاحبؒ کے سلسلہ میں اجازت یافتہ تھے، کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنی کتاب "سوانح حیات" میں لکھتے ہیں کہ سید امیر صاحب ایسے پر تاثیر بزرگ تھے کہ ان کی خدمت میں حاضری دینے والا کوئی بھی مسلمان روحانی طور پر خالی واپس نہیں جاتا تھا: "جو حلقے میں بیٹھ جاتا۔ یک بارگی اس کے تمام لطائف جاری ہو جاتے۔ متبع الانام [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والا] بن جاتا۔۔۔۔ آپ کے وظائف مطابق سنت تھے۔ (۳۶۰)

۳۴۔ سماجی نابرابری کا روگ

مسلم معاشرہ امیر و غریب، شریف و رذیل، بلند و پست طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ انسان کی بہ حیثیت انسان عزت نہ تھی، بلکہ وہ مالی، سماجی اور خاندانی حیثیت سے مقام پاتا تھا، اور اس ذہنیت کو مسلم معاشرے میں پوری طرح قبول کر لیا گیا تھا۔ سید صاحبؒ نے اس غیر اسلامی رجحان کے

---

(۳۵۹) حاجی امداد اللہؒ، کلیات امدادیہ، ۱۱۔

(۳۶۰) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۴۹-۴۵۰۔

خلاف آواز بلند کی اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے تئیں مساوات کا اسلامی سبق یاد دلایا۔

اونچ نیچ کے مروجہ دائرے

اس زمانے میں غریبوں کو اپنے بچوں کے وہ نام رکھنے کی اجازت نہیں تھی جو سماج کے امیر لوگوں کے نام ہوتے تھے۔ ایسا کرنا امراء کی توہین مانا جاتا تھا۔ غریب لوگ اپنے گھروں میں ایسی چیزیں بھی نہیں پکا سکتے تھے جو امراء کے دسترخوان کی زینت مانی جاتی تھیں۔ اس طرح امیر لوگ سماج کے کسی غریب کی دعوت بھی قبول نہیں کرتے تھے اور شادی غمی یا عید بقرعید میں بھی کسی غریب کے یہاں کسی امیر کا چلا جانا تصور سے باہر تھا۔

سماجی تفریق کو مٹانے کے لئے سید صاحبؒ کی کوشش

اپنی نجی گفتگو اور عوامی خطبات میں سید صاحبؒ اور ان کے خلفاء نے ہر طبقاتی تفریق کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے، جہاں تک ممکن ہوسکا، ذاتی مثال قائم کر کے اس رجحان کے خلاف لوگوں کا مزاج بنایا۔ ایک موقعہ پر جب ایک نو برس کے ہندو لڑکے نے اسلام قبول کیا تو مولانا عبدالحی بڈھانوی نے اس کا نیا نام "کریم الدین" تجویز کیا۔ اس پر وہاں موجود مقامی لوگوں نے عرض کیا کہ اس نام کے رکھنے سے علاقے کے لوگ ناراض ہونگے اس لئے کہ اس شہر کے کئی بڑے لوگوں کا نام "کریم الدین" ہے۔ اس بات پر سید صاحبؒ بہت آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا: "اچھا، پھر اس کا نام 'احمد' رکھو اس لئے کہ یہ میرا نام ہے۔" پھر سید صاحبؒ کی ایماء پر مولانا عبدالحی بڈھانوی نے اس بُرے رواج کی مذمت میں ایک دل ہلا دینے والا خطبہ دیا۔ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ رواج کتنا مذموم ہے تو وہ بے اختیار رو پڑے اور دل سے توبہ کر کے اس رواج کو معاشرے سے مٹانے کا عہد کیا۔ (۳۶۱)

اس طرح سید صاحبؒ نے، جو غریبوں کے ساتھ امراء و رؤساء کی نگاہ میں بھی انتہائی مکرم تھے، غریبوں اور پسماندہ طبقات کے ساتھ برابری اور عزت و اکرام کا معاملہ کر کے امراء کے سامنے عملی مثال قائم کی۔ مرزا نامی مقام پر انہوں نے اینٹ بنانے والے غریب مسلمانوں کی دعوت قبول کی، ان کے گھر گئے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اسی طرح انہوں نے تلوکا نامی

(۳۶۱) ندوی، جب ایمان کی بہار آئی، ۴۳-۴۶۔

ایک غریب شخص کی، جو پیشے سے چمار تھا، دعوت بھی قبول کی، اس کے گھر تشریف لے گئے، اس کی دلجوئی کے لئے اس کا معمولی نذرانہ بھی قبول کیا، اور اس کے لئے دعاء بھی کی۔ (۳۶۲) بریلی کے نواب نے سید صاحبؒ کی دعوت کی اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون اپنے اعزہ کے لئے دعاء مغفرت کرنے کی درخواست بھی کی۔ سید صاحبؒ نے ان کی درخواست قبول کی لیکن وہ پہلے عام مسلمانوں کے قبرستان گئے اور ان کے لئے دعاء کی۔ اس کے بعد نواب صاحبؒ کے خصوصی قبرستان جا کر ان کے اہل خاندان کے لئے دعاء فرمائی۔ (۳۶۳) اسی طرح انہوں نے اس بات کو بھی عام کیا کہ کوئی کھانا کمتر نہیں ہوتا کہ اسے صرف نادار لوگوں کا کھانا ہی مان لیا جائے۔ سردھنہ میں جب سپاہیوں نے آپ کی دعوت کی تو آپ نے اس شرط پر دعوت قبول کی کہ وہ باجرے کی روٹی اور دال کے علاوہ کچھ اور پیش نہیں کریں گے۔ (۳۶۴)

سید صاحبؒ نے اس بات کی بھی فکر کی کہ امراء غریبوں کے قریب آئیں اور یہ طبقاتی فرق مٹے۔ مثلاً، الہ آباد میں انہوں نے شہر میں کے رئیس اعظم شیخ غلام علی سے فرمایا:

> شیخ بھائی! تمہارے علاقے کی بستیوں میں جو مسلمان بستے ہیں، ان کی تعلیم وتلقین کے لئے ہم نے تم کو مقرر کیا۔ ان زمیندار لوگوں کا اکثر کاروبار سرکار دربار سے تعلق رکھتا ہے۔ تم ان کے حامی ومددگار رہو اور وہ تمہاری سرکار کے مالگوار۔ جس قدر تم سے ہو سکے ہر ایک کی لیاقت کے موافق روپیہ لینے میں تخفیف کرو۔ جب ان پر تمہارا احسان ہوگا، تب جو کچھ تم ان سے کہو گے، بے انکار سب مانیں گے۔ (۳۶۵)

لکھنؤ میں انہوں نے منڈو خان کی سرکاری نوکری میں ترقی کے لئے اس شرط پر دعاء کا وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے علاقے سے گزرنے والے مسافروں اور غریبوں کے سلسلے میں اس بات کا خیال رکھیں گے کہ وہ رات میں بھوکے نہ رہ جائیں۔ منڈو خان کی ترقی ہوئی، عہدہ ملا اور مالی حیثیت بہت اچھی ہو گئی۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "کچھ دنوں میں جب ان کو بہرائچ کا علاقہ [عطا] ہوا، تب تو مسکینوں اور مسافروں کی اطلاع کو صبح وشام کھانے کے وقت ترم بجوانا شروع کیا کہ جو مسکین مسافر لائن میں اترا ہو، آئے اور ہمارے دسترخوان پر ہمارے ساتھ کھائے۔" (۳۶۶)

لیکن مساوات پر مبنی معاشرے کی تشکیل کا سب سے اچھا موقعہ سید صاحبؒ کو پنجتار میں ملا

---

(۳۶۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۹۔

(۳۶۳) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۷۷۔

(۳۶۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۱۵۷۔

(۳۶۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۷۵۔۲۷۶۔

(۳۶۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۰۹۔۲۱۰۔

جسے سرحد میں اسلامی ریاست کے دارالسلطنت کی غیر رسمی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہاں ایک ایسا معاشرہ ظہور میں آیا جہاں اسلامی اصولوں پر مبنی مکمل مساوات کا سکہ رائج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہاں امان اللہ خان نامی ایک بااثر مجاہد نے ایک دن ایک معمولی بات پر ایک غریب سائیس لاہوری کو طمانچہ مار دیا تو قاضی کے حکم سے لاہوری کو اجازت دی گئی کہ وہ امان اللہ خان کو بدلے میں اسی طرح طمانچہ مار لے۔ پنجتار میں ایک بے سہارا بوڑھی خاتون سید صاحبؒ کے پاس آئی اور اپنی بے چارگی کی فریاد کی۔ آپ نے اسے منہ بولی ماں بنالیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ اور لشکر کا ہر غریب و امیر مجاہد اس کو مقامی زبان میں ''ماں'' ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ سید صاحبؒ ہر مجاہد کو اس کے نام کے ساتھ ''بھائی'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب۔ پنجتار میں سارے کام لشکریوں میں بانٹ دیئے گئے تھے جس میں سید صاحبؒ اپنے حصے کا کام اپنی جماعت کے ساتھ خود انجام دیتے۔ اس کے علاوہ بھی وہ ہر چھوٹے بڑے کام میں ہمیشہ خوشی خوشی شریک ہوتے۔ ایک بار جب اچانک بارش ہونے لگی تو مجاہدین باہر پڑے اناج کو اٹھانے کے لئے دوڑ پڑے۔ سید صاحبؒ بھی فوراً ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ دوسرے موقعہ پر جب انہوں نے ایک مجاہد کو چکی میں آٹا پیستے دیکھا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور خود بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ پنجتار کی مسجد کی توسیع ہو رہی تھی تو تعمیر کے لئے پتھر لانے میں وہ خود بھی شریک تھے۔ (۳۶۷)

۴۔ شادی کے غیر اسلامی رسوم

شادی جسے اسلام نے انتہائی سادہ اور آسان عمل بنا دیا تھا، اس زمانے میں اپنی یہ صفات کھو چکا تھا۔ اب وہ ایسا موقعہ ہوتا تھا جس میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر جاہ و ثروت کا اظہار کیا جاتا تھا اور دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس موقعہ پر جشن اور رقص و سرود کا بھی اہتمام ہوتا تھا اور دوسرے ایسے غیر اسلامی رسوم کو ادا کرنا بھی ضروری مانا جاتا تھا جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

شادی میں مروجہ بے ضابطگی

لیکن مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ شادی کے نام پر بہت سی ایسی بے ضابطگی بھی برتی جانے لگی تھی جن کی حیثیت گناہ کبیرہ کی تھی۔ مثلاً، بنگال اور آسام میں مسلمانوں میں عام رواج تھا کہ وہ

(۳۶۷) مہر، سید احمد شہیدؒ، ۸۳۰۔

چار سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ کبھی ایک مسلمان ایک شادی تو با قاعدہ کر لیتا اور پھر کئی عورتوں کو بغیر شادی کے گھر میں رکھ لیتا۔ ان سے جو اولاد ہوتی، ان کو سماج میں برضاء ورغبت اس کی جائز اولاد کی حیثیت سے قبول کیا جاتا تھا۔ (۳۶۸) بعض علاقوں میں ہندو مذہب کے اثر سے رشتہ داروں میں شادی کو، جس کی اسلام میں اجازت ہے، ایک بُرا اور قابل شرمندگی عمل مانا جاتا تھا۔ کبھی ایک مسلمان دو حقیقی بہنوں کو زوجیت میں لے لیتا تھا جو اسلام میں حرام ہے۔ (۳۶۹)

اس بات کا بڑا خطرہ تھا کہ اگر ان بے ضابطگیوں کا تدارک نہیں کیا جاتا تو بنگال اور آسام میں اسلام کی شکل اتنی بدل جاتی کہ اسے پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا۔ سید صاحبؒ نے شادی کے سلسلے میں ایسے سارے غیر اسلامی رواج اور تصورات کے خلاف پوری قوت سے آواز بلند کی۔ ان کی تعلیم تھی: "بیاہ برات، شادی غمی میں خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شرک و بدعت کے رسوم کوئی نہ کرنے پائے۔ ہر امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نگاہ رہے۔ اس میں کوئی خوش ہو یا ناخوش۔" (۳۷۰)

سید صاحبؒ کی کوششوں نے سماج کی کایا پلٹ دی۔ اسلامی تعلیمات پھر سے معاشرے میں زندہ ہوئیں اور مسلمانوں نے شادی کی تقریب کو پھر اسی سادگی کے ساتھ منانا شروع کیا جس کی اسلام تعلیم دیتا تھا۔ سید صاحبؒ کے ایک مرید نے لکھنؤ میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> شادی بیاہ میں ہم نے اپنے یہاں یہ دستور رکھا ہے کہ دُھلے ہوئے کپڑوں کے سوا دولہا دولہن کے لئے نیا کپڑا ابھی نہیں بنواتے، اگرچہ بنوانا درست ہے۔ اور ولیمے اور عقیقے کے کھانے کے سوا نہ کھاتے ہیں، نہ کھلاتے ہیں۔ اور جو خرافات اور رسوم بدعات لوگ اپنے یہاں شادی بیاہ میں کرتے ہیں، جیسے سہرا، کنگنا بندھنا، رت جگا کرنا، گیت گوانا، طوائف کا ناچ کرانا اور اس طرح کی کوئی بات ہم نہیں کرتے۔ اور جو کرتے ہیں، ان کے بیاہ شادی میں ہم لوگ شریک نہیں ہوتے۔ (۳۷۱)

معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگوں نے بھی سید صاحبؒ کی دعوت پر لبیک کہا اور شادی میں برتے جانے والے ہر غیر اسلامی رسم کو یکسر ترک کر دیا۔ مثلاً، مولانا فرحت حسین نے، جو مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی غیر موجودگی میں پٹنہ مرکز کے امیر تھے، اپنے بچوں کی شادی انتہائی سادگی کے ساتھ کی جو ان روایات کے بالکل برعکس تھی جو سید صاحبؒ سے تعلق سے پہلے ان کے خاندان

(۳۶۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۳۔
(۳۶۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۶۳۔
(۳۷۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۱۲۔
(۳۷۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۱۳۔

میں رائج تھیں۔ (۳۷۲) اسی طرح مولانا عنایت علی عظیم آبادی کی شادی سیدہ آمنہ سے جو سید محمد مسافر کی صاحبزادی تھیں، نہایت سادگی سے انجام پائی۔ مہر لکھتے ہیں: "بہار میں یہ پہلی شادی تھی جو انتہائی سادگی سے شریعت کے مطابق انجام پائی۔" (۳۷۳)

غیر اسلامی تعدد ازواج کا رواج

سید صاحبؒ نے شادی میں رائج دوسری برائیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ جن مسلمانوں نے کسی عورت کو شادی کے بغیر اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا، انہیں اس عورت سے فوراً شادی کر لینے کی ہدایت دی گئی۔ جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، انہیں چار کے علاوہ باقی خواتین کو طلاق دینے کی تلقین کی گئی۔ حج کے سفر کے دوران سید صاحبؒ کا کلکتہ میں کئی ماہ قیام رہا اور وہاں انہوں نے غیر اسلامی تعدد ازواج کو ختم کرنے کی بہت کوشش کی۔ لوگوں نے شرعی احکام کو قبول کرنے کے لئے دل سے رضامندی کا اظہار کیا اور اس پر عمل کیا۔ سید صاحبؒ پر بھی اس کا بہت اثر پڑا اور انہوں نے ان الفاظ میں بنگال کے مسلمانوں کے بارے میں امید ظاہر کی: "جو کوئی زندہ رہے گا، تھوڑی مدت میں اس ملک بنگال کا حال دیکھے گا کہ اللہ تعالی کس طرح ہدایت عام کرتا ہے۔" (۳۷۴)

ہدایت کی یہ لہر صرف کلکتہ تک محدود نہیں رہی، بلکہ پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور عوام کے ساتھ ساتھ خواص نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔ مثلاً، حیدرآباد میں نواب مبارز الدولہ نے، جو فرمانروائے ریاست حیدرآباد کے حقیقی بھائی تھے، بھی اپنے حرم میں چار بیگمات رکھیں اور باقی کو اپنی پسند کی شادی کر کے شرعی طور پر پاکیزہ زندگی گزارنے کی اجازت دے دی۔ (۳۷۵)

جہیز کا ایک غیر اسلامی رواج

جہیز کا ایک انتہائی ظالمانہ رواج سرحد میں زور پکڑ گیا تھا جس کے مطابق لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے لڑکے سے جہیز کے نام پر اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کرتا تھا جو عموماً اس کی استطاعت سے باہر ہوتی تھی اور اس طرح لڑکیاں اچھے رشتے سامنے ہونے کے باوجود بڑی عمر تک کنواری رہ جاتی تھیں۔ جب سید صاحبؒ کی نگرانی میں پنجتار میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا گیا تو انہوں نے اس برے رواج کی طرف فوراً توجہ دی، ایسے معاملوں کی محتاط تفتیش کی اور ان خواتین کے حق میں جن کا

(۳۷۲) مہر، کاروان مجاہدین، ۱۱۰۔
(۳۷۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۸۸۔
(۳۷۴) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۳۲۴۔
(۳۷۵) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۷۰۔۱۷۱۔

نکاح ہو چکا تھا اور جو لڑکے کی جانب سے پیسے کی عدم ادائیگی کی وجہ سے گھر بیٹھی تھیں، رخصتی کا حکم جاری کیا۔

مسلمان عورتوں کی غیر مسلموں میں شادی

اس زمانے میں یہ رجحان بھی پیدا ہو گیا تھا کہ مسلمان عورتیں غیر مسلم مردوں سے شادی کر کے یا شادی کے بغیر ان کے ساتھ شریک حیات کے طور پر رہتیں۔ آکٹر لونی نے، جو ہندوستان کا پہلا برٹش ریزیڈنٹ تھا اور مذہبا عیسائی تھا، تین ہندوستانی عورتوں سے شادی کی تھی جن میں سے ایک مسلمان تھی جس کا نام بی بی مہرۃ النساء بیگم تھا۔ اس خاتون کا باقاعدہ تذکرہ آکٹر لونی کے وصیت نامہ میں ملتا ہے۔(۳۷۶) اسی طرح بیگم حیات النساء، آگسٹس بروک نامی ایک عیسائی کے ساتھ اس کی بیوی کی طرح رہتی تھی۔ سید صاحبؒ نے ایسی شادی کے غیر اسلامی ہونے کو واضح کیا اور اسے ترک کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ حیات النساء نے سید صاحبؒ کی تلقین کے زیر اثر اپنے عیسائی شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔(۳۷۷)

بیوہ خواتین کے عقد ثانی کی مخالفت

شادی میں مروجہ بے راہ روی اور غیر اسلامی رجحانات کو روکنے کے سلسلے میں سید صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ بیوہ خواتین کے نکاح ثانی کا اجراء ہے۔ ہندو مذہب کے زیر اثر مسلمان بھی ایک بیوہ خاتون کی دوبارہ شادی کو ایک غیر شریفانہ، معیوب اور قابل ترک عمل سمجھنے لگے تھے اور یہ مانا جانے لگا تھا کہ دوسری شادی ایک بیوہ کی شرافت اور خودداری کے منافی اور اس کے اہل خاندان کے لئے باعث ننگ و عار ہے۔ ایک موقعہ پر سید صاحبؒ نے اسلام سے انحراف کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> انہیں چیزوں میں سے بیواؤں کا دوسرا نکاح نہ کرنا ہے۔ خصوصا وہ بیوہ کہ جوان ہو، اس کا نکاح ثانی کرنا ایسا بڑا گناہ سمجھنا جیسا کہ خدا کے یہاں کفر و شرک ہے۔ اور جو بیوہ نکاح کرے، اس کو بازاری عورت اور بے حیا سمجھنا اور قحبہ کا خطاب دینا اور اس کو مطعون و بدنام کرنا اور ساری عمر بیوہ کو زندہ در گور کر دینا اسی قبیل سے ہے۔

---

(۳۷۶) Dal Rimple, The Last Mughal, pp. 66-67۔

(۳۷۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۸۶۔

انہوں نے مزید فرمایا: ''یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا تمام امہات المومنین بیوہ تھیں۔''(۳۷۸)

اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کو یہ بات اب اس طرح بتائی جا رہی تھی کہ بیوہ کا مجرد رہنا دراصل اسلام کی نگاہ میں بھی ایک پسندیدہ عمل ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول میں صفحات ۲۳۰ تا ۲۳۳ میں ایک ایسے ہی فتویٰ کا پورا متن نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر ایک مسلمان بیوہ خاتون عقد ثانی کے لئے تیار بھی ہو جائے تو اس کا ولی اسلامی تعلیم کی روح کے مطابق اسے اس شادی سے روک سکتا ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے یہ فتویٰ اپنی کتاب ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں رقم کیا ہے اور اس میں دیئے گئے دلائل کی تردید کی ہے۔ اس فتویٰ کا ایک مختصر اقتباس نیچے پیش کیا جاتا ہے تاکہ صورت حال کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

> اور بالفرض اگر وہ نکاح ثانی پر راضی بھی ہو جائیں اور ان کے ولی کی جانب سے ممانعت ظہور میں آئے تو اس میں بھی شرع کی مخالفت لازم نہیں آتی ہے، اس واسطے کہ بعضے مقام اور بعضے امور میں اس لحاظ سے کہ اس میں کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے میں غیرت ہوتی ہو اور شرافت میں خلل آتا ہو اور اپنی طرف ایسی صفت کی نسبت ہونے کا خوف ہو کہ باعتبار عرف نہایت مذموم ہو تو ایسی صورت میں شرع سے تجاوز کرنے کو علماء نے مستحسن جانا ہے۔(۳۷۹)

سید صاحبؒ نے اس رجحان و عمل کے خلاف زبان سے بھی آواز بلند کی اور قلم سے بھی اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں اسے دین سے انحراف قرار دیا۔ لیکن اس بددینی کے سماج میں زور پکڑ لینے کا مشاہدہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ذاتی عمل سے مثال قائم کر کے اس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنے مرحوم بھائی محمد اسحٰق کی بیوہ کو خود شادی کا پیغام دیا اور اپنی خالہ سے عرض کیا: ''آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ رشتہ میں حظ نفس کے لئے نہیں کرتا، محض سنت کے جاری کرنے اور ہندوستان کی ایک رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔''(۳۸۰) اس طرح دو تین ماہ کے بعد شرفاء کے خاندان میں ایک مدت دراز کے بعد یہ تقریب انجام پائی۔ سید صاحبؒ نے اس تقریب کو ایک سنت کے احیاء کی نسبت سے ایک قابل فخر عمل کے طور پر عام کرنے کی کوشش کی اور اپنی اہلیہ کو اپنی دوسری شادی کی شیرینی عورتوں میں خود تقسیم کرنے کی ہدایت دی۔

---

(۳۷۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۲۷۔
(۳۷۹) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۳۱۔۲۳۲۔
(۳۸۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، اول، ۲۲۷۔

اس کے بعد سید صاحبؒ نے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور اپنے رفقاء کو اس سنت کے اجراء کی اطلاع دینے کی غرض سے خطوط لکھے۔ جواب آنے پر معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں نے بھی اس پر عمل کیا اور کئی مقامات پر بیوہ خواتین کے عقد ثانی کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے اپنی بیوہ ہمشیرہ بی بی رقیہ کو مولانا عبدالحی بڈھانوی کے عقد میں دیا۔ وہ پاکباز خاتون عمر رسیدہ تھیں، لیکن سنت کو زندہ کرنے کے جذبہ سے انہوں نے بھی یہ رشتہ منظور کیا۔ بہار میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے "اپنے ہاتھ سے اپنے خاندان میں متعدد بیواؤں کا نکاح ثانی کیا۔" (۳۸۱) جب ان کے ایک عزیز قمر الدین پشاور میں شہید ہو گئے تو مولانا ولایت علیؒ نے خود ان کی بیوہ سے شادی کر لی۔ (۳۸۲) مولانا عنایت علی عظیم آبادی کی پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد ان کا نکاح ثانی شاہ محمد حسین کی بیوہ صاحبزادی سے ہوا۔ (۳۸۳) ایسے اعلیٰ خاندانوں میں بیواؤں کی شادی کی ان مثالوں نے مسلم سماج کا طرز فکر بدل ڈالا اور بیوہ کی دوسری شادی کی سنت نے پھر سے سماج میں اپنی اسلامی حیثیت حاصل کر لی۔ سید صاحبؒ کی مخلصانہ کوشش کا نتیجہ اس وقت بھی ہندوستانی مسلم معاشرے میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں بیوہ کی شادی عام ہے اور تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

(۳۸۱) ندوی، کاروان ایمان وعزیمت، ۴۷۔

(۳۸۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۲۹۔

(۳۸۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۸۸۔

پانچواں باب

اسلامی ریاست کا قیام

سید احمد بریلوی کی جدوجہد کا مقصد مغلوں یا مغل شہنشاہیت کو بحال کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ہندوستان کی سرحد پر مسلمانوں کے اولین معاشرے کے نمونہ پر ایک مسلم معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔

(P. Hardy, The Muslims of British India)

سید صاحبؒ کی تحریک ارتقاء کی فطری منازل سے گزری اور پروان چڑھی۔ یہ تحریک ذاتی تزکیۂ نفس سے شروع ہوئی، پھر اس نے اصلاح اخلاق اور اصلاح معاشرہ کی دعوت کی شکل اختیار کی، پھر یہ شدید ظلم واستحصال کے خلاف جہاد کے لئے صف آرا ہوئی، اور اس کے بعد اس کی سرپرستی میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی جو مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ جب سید صاحبؒ کو سرحد میں اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے پنجتار اور اس کے گردونواح کے ان علاقوں میں جہاں کے لوگوں کا ان کو تعاون حاصل ہوا، شریعت کا نظام نافذ کیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انہوں نے مقامی سرداروں کو نظام کے خیر و برکات سے آگاہ کرتے ہوئے ان کو اسے اپنے علاقوں میں نافذ کرنے کی دعوت ضرور دی، مگر کسی جگہ پر بھی اپنی حکومت قائم کرنے کی غرض سے لشکر کشی نہیں کی۔ بے شک انہوں نے بعض مقامات پر اپنا لشکر بھیجا اور انہیں اپنے زیر اثر لینے کی کوشش کی، لیکن ایسے ہر موقعہ پر ان کا مقصد وہاں پرورش پا رہی بغاوت کا سد باب کرنا تھا۔ ایسے علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لینے کے بعد ہر موقعہ پر انہوں نے وہاں کی حکومت اس شرط کے ساتھ وہیں کے مقامی سرداروں کو سونپ دینے کی پیش کش کی کہ وہ شرعی نظام کے مطابق حکومت کریں گے۔

ا۔ اسلامی ریاست کی تشکیل

اس طرح سید صاحبؒ کی امارت میں سرحد میں اسلامی ریاست کا ایک ڈھیلا ڈھالا ڈھانچہ ظہور میں آیا جس میں وہ سب علاقے شامل تھے جو اپنے یہاں شریعت کے نفاذ کے حق میں تھے۔ اگرچہ اس اسلامی ریاست کی زندگی ایک سال سے بھی کم رہی، لیکن یہ بات بہت قابل تحسین ہے کہ یہ ریاست نہ صرف نہایت تیزی کے ساتھ اپنی تکمیل کی طرف گامزن رہی بلکہ ابتداء سے انتہا تک مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست کو اپنا نمونہ بنانے میں پورے طور پر کامیاب رہی۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے لیکن یہ دعویٰ پورے اعتماد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک نے اپنے آغاز سے سید صاحبؒ کی شہادت تک، بلکہ اس کے بعد بھی ایک عرصے تک، اسلامی تعلیمات سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔

ریاست کے امیر کا انتخاب

اسلامی ریاست کے اعلیٰ نظم و نسق کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسا مسلمان اس کا قائد ہو جو صحت مند ذہن و دل کا مالک ہو اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتا ہو۔ وہ اسلام کے بارے میں ضروری علم رکھتا ہو اور ایسی سمجھ بوجھ بھی جس کے ذریعہ وہ ریاست کے مسائل کو حل کر سکے۔ وہ ہمت اور حوصلہ بھی رکھتا ہو کہ ریاست کو پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ کر سکے اور ریاست کے لوگوں کو متحد رکھ سکے۔ اس کے علاوہ نہ تو وہ بذات خود اس عہدے کا طالب ہو اور نہ ہی اس سے غیر ضروری طور پر گریزاں کہ وہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے تیار ہی نہ ہو۔ چونکہ یہ سب صفات سید صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھیں، اس لئے ایک بڑے اجتماع میں مسلمانوں نے انہیں امیر المومنین کی حیثیت سے منتخب کیا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے، سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جو موجود نہیں تھے وہ دور و نزدیک سے پنجتار آ آ کر بیعت ہونے لگے۔ ہندوستان میں بھی علماء، صلحاء، امراء اور عوام نے یکساں طور پر ان کے انتخاب پر دل سے خوشی اور اطاعت کا اظہار کیا۔ سرحد میں جمعہ کے خطبہ میں بہ حیثیت امیر المومنین ان کا نام شامل کیا گیا۔

ریاست کا دار الخلافت

اسلامی ریاست کو اپنے مرکز یا ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرنے کے لئے ایک مقام کی ضرورت تھی جہاں سے ریاست کا نظم و نسق سنبھالا جا سکے۔ سید صاحبؒ نے پنجتار کو اپنے مرکز کے

لئے منتخب کیا۔ پنجتار پہاڑوں سے گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے فطری طور پر نہایت محفوظ مقام تھا۔ وہاں کا حاکم فتح خان سید صاحبؒ کا مرید اور میزبان تھا اور اس نے اپنی ریاست میں شرعی نظام قائم کرنے کا نہ صرف زبانی اعلان کیا تھا بلکہ اس مضمون کی ایک تحریر بھی سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ پنجتار کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ چونکہ سید صاحبؒ اور مجاہدین کا وہاں خاصے عرصے سے قیام تھا اس لئے وہ اس مقام کے نشیب و فراز سے واقف اور وہاں کے لوگوں سے مانوس تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر پنجتار اسلامی ریاست کا مرکز بنائے جانے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس طرح غیر رسمی طور پر اسے اسلامی ریاست کے دارالخلافت کی حیثیت حاصل تھی۔

اسلامی ریاست کے شعبے

اسلامی ریاست کے نظم و نسق کی مجموعی ذمہ داری مندرجہ ذیل تین اہم شعبوں میں بٹی ہوئی تھی:

(الف) : شعبۂ قانون سازی (Legislature)

(ب) : شعبۂ انتظامیہ (The Executive)

(ج) : شعبۂ عدلیہ (The Judiciary)

ان تینوں شعبوں کا سلسلہ وار بیان نیچے کیا جاتا ہے۔

(الف): شعبۂ قانون سازی (Legislature)

یہ شعبہ اسلامی ریاست کے لئے قانون سازی کا ذمہ دار تھا تاکہ ریاست کا کام واضح قوانین کی روشنی میں انجام پائے۔ قانون سازی کے رہنما ذرائع قرآن و سنت تھے۔ علماء کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ ایسے قوانین مقرر کریں جن میں ریاست کی مقامی ضرورتوں کے لئے مکمل راہنمائی ہو اور شریعت مطہرہ سے ہرگز کوئی انحراف نہ ہو۔ خوش نصیبی سے وہاں سید صاحبؒ کے ہندوستانی رفقاء میں موجود علماء اور سرحد کے مقامی علماء کی ایسی تعداد موجود تھی جو اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی پورے طور پر اہل تھی۔

قوانین کی تدوین

اسلامی شریعت کے معروف قوانین جیوں کے تیوں لے لئے گئے۔ لیکن سرحد کے معاشرے کے مقامی رسم و رواج بھی تھے جو شریعت کے خلاف تھے۔ ان کو کنٹرول کرنے کے لئے

قوانین وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ ایسی ساری غیر اسلامی رسم ورواج کو غیر قانونی قرار دیا گیا اوران کے لئے سزائیں مقرر کی گئیں۔ مثلاً، لڑکی کے والد کی طرف سے لڑکے سے جہیز کے نام پر بڑی رقم کا مطالبہ کر کے ان کی شادی موٴخر کرنا، جرم کر کے اپنے علاقے سے بھاگ کر دوسرے علاقے میں پناہ لینا اور اس طرح سزا سے محفوظ ہو جانا، کسی کی زمین وجائیداد چھین کر اسے اس کے علاقے سے زبردستی نکال دینا، ندی میں ننگے ہو کر نہانا اور میت پر غیر اسلامی طریقے سے سوگ منانا غیر قانونی قرار دیا گیا۔

یہ بات اہم ہے کہ علاقے کے معاشرتی رواجوں کو سمجھنے میں غلطی سے بچنے کی خاطر قاضی محمد حبّان کو جو مقامی بھی تھے اور عالم دین بھی، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دیا گیا۔ انہوں نے پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ مقامی اور ہندوستانی علماء کے مشورے سے مختلف جرائم کی سزا کے لئے قوانین بنائے۔ انہوں نے زکوٰۃ اور عشر کی تحصیل کے سلسلے میں بھی رہنما اصول مرتب کئے تا کہ اسلامی ریاست کے عمالوں کے لئے صحیح طریقے سے کام انجام دینا آسان ہو۔

ابتداء میں ندی میں ننگے نہانے پر ایک شخص کو جرمانہ کیا جاتا تھا، بعد میں جرمانہ کو کوڑے کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابتداء میں کسی شخص کو اپنا مویشی دوسرے کے کھیت میں چرانے کے جرم میں جانوروں کی تعداد کے مطابق جرمانہ کیا جاتا تھا، بعد میں فصل کے نقصان کا اندازہ لگا کر اس شخص پر جرمانہ کیا جانے لگا۔ اگر کوئی مرد فرض نماز چھوڑ دیتا تو اسے کوڑے لگائے جاتے جس کے ذمہ دار امان خان گنج پوری تھے۔ اگر کوئی عورت کسی جرم کا ارتکاب کرتی تو اسے پردے کا لحاظ کرتے ہوئے زنان خانہ میں سید صاحبؒ خود سزا دیتے۔ اس پوری مدت میں دو عورتوں کو اس طرح سزا دی گئی، ایک کو فرض نماز چھوڑنے پر اور دوسری کو غلط بیانی سے کام لے کر اپنے کو بیوہ ظاہر کرنے پر۔ ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک خان دِہ کو فرض نماز چھوڑنے پر دو روپیہ جرمانہ کیا جاتا تھا، ایک کاشتکار کو جس کی ملکیت میں کچھ زمین ہوتی تھی ایک روپیہ اور ایک عامی کو آدھا روپیہ۔ (۳۸۴)

جنگ کی حالت میں مجاہدین کو شرعی قوانین کی پابندی کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ انہیں ان دشمنوں سے لڑنے کی اجازت تھی جو ان سے لڑتے تھے اور ان لوگوں کو امان دینے کا حکم تھا جو امان کے طالب ہوتے تھے۔ (۳۸۵) اگر اسلامی لشکر کا ایک عام سپاہی بھی دشمن کی فوج کے کسی فرد یا جماعت کو امان دیتا تھا تو پورا لشکر اس کو تسلیم کرتا تھا۔ جنگ میں کسی کے مال کو مال غنیمت کے طور پر

(۳۸۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۴۔۴۵۔ (۳۸۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۴۷۔

لینے کی صرف اسی صورت میں اجازت تھی جب کسی مسلمان فرد یا جماعت نے شرعی امام وقت کے خلاف بغاوت کی ہو، یا کوئی غیر مسلم فرد یا جماعت مسلمانوں کے لشکر سے لڑنے کے لئے نکل آئی ہو۔ (۳۸۶)

امان دینے کے بعد اس کے شرائط کا پورا احترام کیا جاتا تھا۔ جنگ ہوتی، مردان میں مقامی لوگوں کی ایک جماعت نے جو قلعہ کی حفاظت کے لئے اسلامی لشکر کے خلاف لڑ رہی تھی، امان طلب کیا۔ ان سب کو آزادانہ ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا اور انہیں اپنی ذاتی ملکیت کا سامان بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔ اس جنگ میں رسول خان نے، جو مردان کے حاکم احمد خان کا حقیقی بھائی تھا، ہتھیار ڈال دیئے اور مجاہدین سے امان طلب کی۔ اس کے جان و مال کی حفاظت کی گئی۔ جنگ کے بعد مردان کے چند لوگوں نے شکایت کی کہ اسلامی لشکر کے کچھ مقامی سپاہیوں نے ان کی چیزیں لے لی ہیں حالانکہ اس وقت انہیں امان دی جا چکی تھی۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ نے فوراً اس کی تفتیش کی اور سارا سامان مالکوں کو واپس دلایا گیا۔ (۳۸۷) قبائلی جنگ میں حصہ لینا اور غیر منصفانہ طور پر اپنے قبیلے کی حمایت کرنا غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیا گیا۔ (۳۸۸) قیدیوں کے انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا تھا۔ جنگ میں لوٹ مار یا کسی قسم کی زیادتی و ناانصافی قانوناً جرم تھا۔

اسلام کے شرعی قوانین کو پورے طور پر بالادستی حاصل تھی اور ریاستِ اسلامی کے قائد کے لئے بھی اس کی پابندی کرنا لازم تھا۔ اس اصول کے تحت سید صاحبؒ نے ایک سے زیادہ موقعہ پر اپنا فیصلہ تبدیل کیا۔ مثلاً، ایک بار انہوں نے ایک علاقے کے مسلمانوں کو ان کی درخواست پر کچھ دنوں کے لئے عشر اس خیال سے معاف کر دیا کہ مانوس ہو جانے کے بعد وہ خود ہی دوسرے اسلامی احکام کی طرح عشر بھی ادا کریں گے۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ عشر کا معاف کرنا امام کے شرعی دائرۂ اختیار سے باہر ہے تو انہوں نے فوراً اپنا حکم واپس لے لیا۔ (۳۸۹)

مال غنیمت کی تقسیم کے لئے شرعی احکام کو اپنایا گیا۔ مثلاً، جنگ زیدہ میں حاصل ہونے والا مال غنیمت پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور چار حصے لشکریوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ پیدل سپاہی کو ایک حصہ اور گھوڑ سوار کو دو حصے دیئے گئے۔ (۳۹۰)

---

(۳۸۶) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۳۹۔
(۳۸۷) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۲۳۶۔۲۳۹۔
(۳۸۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۱۴۷۔
(۳۸۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۸۶۔
(۳۹۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۱۴۹۔

(ب): شعبہ انتظامیہ (The Executive)

شرعی قوانین کو لاگو کرنے اور اسلامی ریاست کے نظم و نسق کو ممکن بنانے کے لئے پنجتار میں ایک مضبوط شعبہ انتظامیہ ابھر آیا جو ریاست کی ساری ضرورتوں کو بہ حسن وخوبی پورا کرتا تھا۔ اس شعبہ نے ضرورت کے مطابق جلد ہی مختلف ادارے قائم کر لئے جو انتظامیہ کی عملی ضرورتوں کی دیکھ بھال کے لئے ذمہ دار تھے۔ ان کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

مجلس شوریٰ (Advisory Council)

اسلامی لشکر میں مختلف مسائل پر غور خوض کرنے اور سید صاحبؒ کو مشورہ دینے کے لئے ایک مجلس شوریٰ قائم تھی جو فہم، علم، تجربہ اور تقویٰ رکھنے والے افراد پر مشتمل تھی۔ سارے ضروری معاملات پر مجلس شوریٰ میں غور و خوض کے بعد ہی اسلامی تعلیمات کی رہنمائی میں فیصلے لئے جاتے تھے۔ مختلف موقعوں پر اس مجلس شوریٰ کے جو ممبر رہے ان کی تعداد بائیس (۲۲) تھی۔ ان سب کے نام غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "جماعت مجاہدین" میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ غلام رسول مہر کے مطابق "ہر اہم معاملے کے متعلق ان میں سے موجود اصحاب کو بلایا جاتا اور رائے پوچھنے کے بعد قطعی فیصلہ کیا جاتا۔"(۳۹۱)

سید صاحبؒ کی طرح ان کے رفقاء بھی مشورے سے کام کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً مولانا شاہ اسماعیلؒ اپنے مشیروں سے اہم کاموں کے بارے میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں جو انہوں نے امب سے سید صاحبؒ کو لکھا تھا تحریر فرماتے ہیں: "بارگاہ الٰہی سے امید واثق ہے کہ اس فدوی کے رفقاء عموماً اور اس کے اہل شوریٰ خصوصاً اس بارے میں اس فدوی کے ساتھ پورے طور پر شریک حال ہوں گے۔"(۳۹۲)

اس طرح رسالدار عبدالحمید خان، جو گھوڑ سوار دستہ کے کمانڈر تھے، ہر اہم معاملے میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تھے۔ انہیں شیوہ نامی مقام پر تعینات کیا گیا تھا تا کہ وہ علاقے کا دورہ کیا کریں اور نظم نسق پر نگاہ رکھیں۔ اس طرح انہیں کبھی کبھی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کی فوری ضرورت پڑ جاتی تھی۔ سید صاحبؒ نے ان کے اصحاب میں سے اہل حضرات کا انتخاب کر کے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دے دی تھی جس کے گیارہ ممبر تھے۔ غلام رسول مہر نے ان کا نام لکھا ہے۔(۳۹۳)

---

(۳۹۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۱۔۴۲۔

(۳۹۲) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۴۷۔

(۳۹۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۸۔

بیت المال (Public Treasury)

شعبہ مالیات کے نظم ونسق کے لئے پنجتار میں ایک بیت المال قائم کیا گیا تھا جو ریاست کی آمدنی واخراجات کا انتظام کرتا تھا۔ اس کے انتظام کے تحت ہر مجاہد کو سالانہ تین جوڑے کپڑے اور دو جوڑے جوتے دیئے جاتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر مجاہدین کو مزید کپڑے دیئے جاتے تھے۔ موسم سرما میں انہیں گرم کپڑے الگ سے ملتے تھے۔ ہر جمعرات کو انہیں کپڑے دھونے کے لئے بیت المال سے صابون دیا جاتا تھا۔ بیمار پڑ جانے پر ان کے لئے دوا کا انتظام بھی بیت المال سے کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہندوستان میں مقیم مجاہدین کے اہل خانہ کی، جن کی آمدنی کی کوئی صورت نہیں تھی، بیت المال سے مالی مدد بھی کی جاتی تھی۔ (۳۹۴) بیت المال سے ان مجاہدین کی مالی مدد بھی کی جاتی تھی جو ہندوستان سے سرحد آنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس سفر کے خرچ کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ (۳۹۵)

بیت المال مجاہدین کے لئے رسد مہیا کرنے کا بھی ذمہ دار تھا۔ ابتداء میں غلہ خرید کر مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ بعد میں جب اناج عشر کی شکل میں علاقے کے کاشتکاروں کے ذریعہ پنجتار مرکز بھیجا جانے لگا تو اسے منئی نامی مقام پر بھیجا جاتا تھا جہاں آٹا پیسنے کی چکیاں لگی تھی۔ وہاں آٹا تیار کر کے پنجتار لایا جاتا تھا۔ اس کام کے لئے مجاہدین کا ایک دستہ ذمہ دار تھا جو منئی میں تعینات تھا۔ آٹا پنجتار آنے کے بعد روزانہ ایک پیمانے کے مطابق مجاہدین میں تقسیم ہوتا تھا اور اسی طرح دال اور اس مد کی دوسری اجناس بھی۔ مولانا محمد یوسف پھلتی، میر امانت علی اور شیخ عبدالوہاب لکھنوی یکے بعد دیگرے اس کام کے ذمہ دار ہوئے۔ جب کام بڑھ جاتا تو دو تین اور مجاہدین تعاون کے لئے بلا لئے جاتے۔ (۳۹۶)

ریاست کے دوسرے اخراجات کا انتظام بھی بیت المال سے کیا جاتا تھا جن میں خاص مد منشی خانہ کے اخراجات، ہتھیار، گولہ بارود اور دیگر سامان جنگ کی تیاری یا خریداری، سرکاری مہم پر مجاہدین کے اسفار کے اخراجات اور مہمانوں کے کھانے پینے کا نظم شامل ہوتا تھا۔ دو مواقع پر جب دو ہزار سے ڈھائی ہزار علماء اور خوانین پنجتار میں مشورے کے لئے جمع ہوئے تو ان کی ضیافت بیت المال سے کی گئی۔ (۳۹۷) ایک بار چند ماہ کے لئے تنخواہ دار سپاہی رکھے گئے تھے۔ ان کا مشاہرہ بھی

---

(۳۹۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۸۔
(۳۹۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۵۔
(۳۹۶) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۶۔۲۷۔
(۳۹۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۳۔۶۴۔

بیت المال سے ہی دیا جاتا تھا۔ (۳۹۸) فوج میں ایک گھوڑ سوار دستہ بھی تھا اور بار برداری کے لئے اونٹ بھی۔ ایک زمانے میں وہاں ایک ہاتھی بھی تھا۔ ان جانوروں کے دانہ پانی، دیکھ ریکھ اور دوا علاج پر جو بھی خرچ آتا تھا، اس کا انتظام بھی بیت المال سے کیا جاتا تھا۔

سید صاحبؒ نے اپنے مشن کی مالی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہندوستان میں مراکز قائم کر رکھے تھے جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا مرکز دہلی میں تھا جس کے ذمہ دار شاہ محمد اسحٰق دہلوی اور مولانا شاہ یعقوب دہلوی تھے۔ چھوٹے بڑے مراکز سے روپیہ دہلی مرکز بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے ہنڈی کی شکل میں سرحد سید صاحبؒ کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ سید صاحبؒ کے معتمد سفیر بھی ذاتی طور پر ہندوستان سے سرحد روپیہ پہنچاتے تھے۔ (۳۹۹) روپیہ ان مجاہدین کے ذریعہ بھی بھیجا جاتا تھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد جاتے تھے۔ پوری احتیاط برتی جاتی تھی کہ روپیہ بھیجنے کا یہ نظام خفیہ رہے۔ اس مقصد کے پیش نظر سید صاحبؒ اس معاملے میں عموماً عربی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں نہ تو وہ اپنا نام لکھتے تھے، اور نہ خط پانے والے کا نام اور نہ ہی واضح الفاظ میں روپیہ یا رقم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ان سب کے لئے رموز (code words) مقرر تھے۔ خصوصی پیغام رکھنے والا خط تو پورا کا پورا ایسے مخفی الفاظ میں لکھا جاتا تھا جسے ایک غیر متعلق شخص ہرگز نہیں سمجھ پاتا تھا۔ مثلاً، ایک خط کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے: ”والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ اثث ثجبذ، ذرزس، سصفط، ضعفو، قسکلم، تو ہی۔“ (۴۰۰)

بیت المال کی آمدنی کے ذرائع مندرجہ ذیل تھے: (۱) عطیات (۲) مال غنیمت (۳) عُشر (۴) زکوٰۃ۔ جو ہدایا اور عطیات سید صاحبؒ کو رقم یا اشیاء کی شکل میں ان کے ارادت مندوں کے ذریعہ پیش کی جاتی تھیں، وہ پہلی مد میں آتی تھیں۔ ایسے ہدایا عام طور پر ہندوستان سے سید صاحبؒ کے صاحب حیثیت ارادت مندوں کے ذریعہ بھیجے جاتے تھے۔ اس مد میں وہ رقوم بھی شامل ہیں جو ہندوستان کے امیر و غریب مسلمان جمع کر کے ارسال کرتے تھے۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی چندے کی رقم بھی ہوتی تھی۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں ہر مسلمان کے گھر میں مٹی کا ایک گھڑا رکھا جاتا تھا۔ کھانا پکانے کے وقت مٹھی بھر چاول یا کوئی دوسری جنس الگ کر کے اس میں

(۳۹۸) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۸۰۔۸۱۔ (۳۹۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۵۳۔
(۴۰۰) مہر، جماعت مجاہدین، ۵۵۔ دوسرے رموز کے لئے صفحات ۵۴۔۵۵ دیکھئے۔

ڈال دی جاتی تھی جو ہر ہفتہ جمع کر کے فروخت کر دی جاتی تھی اور اس سے حاصل ہونے والا روپیہ بڑے مرکزوں میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے اس کے سرحد بھیجنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ (۴۰۱)

لیکن چونکہ یہ نظام خاصا غیر یقینی تھا اور اس میں بعض وجوہ سے تاخیر بھی ہو جاتی تھی، اس لئے سرحد میں مجاہدین مالی مشکلات کا شکار بھی ہو جاتے تھے اور لمبے فاقے کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایک ایسے ہی موقع پر مجاہدین نے سید صاحبؒ کی اجازت لے کر سرحد میں گنے کے کھیتوں میں مزدوری بھی کی۔ مالی پریشانی اور تنگی کے ایک دوسرے موقعہ پر سید صاحبؒ کی بیویوں نے، جو اس وقت سندھ میں مقیم تھیں، دس ہزار روپئے کی رقم مجاہدین کی مدد کے لئے بھیجی تھی۔ (۴۰۲)

بیت المال کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ مال غنیمت تھا۔ شرعی احکام کے مطابق مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کر دیا جاتا تھا اور باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ مثلاً، جنگ زیدہ کے موقعہ پر مال غنیمت کا اندازہ تقریباً پچیس ہزار روپیہ لگایا گیا جس میں سے پانچ ہزار روپیہ بیت المال میں جمع ہوا۔ اکثر مجاہدین بہ رضا و رغبت اپنا حصہ بھی بیت المال میں جمع کر دیتے تھے۔ (۴۰۳)

بیت المال کی آمدنی کا تیسرا ذریعہ عشر تھا۔ جب علاقے میں شرعی نظام قائم ہوا تو کاشتکار فصل کے موقعہ پر اناج کا ایک حصہ پنجتار بھیجنے لگے جو اسلامی ریاست کا شرعی حق تھا۔ شروع میں یہ نظام خاصا ڈھیلا ڈھالا تھا۔ بعد میں سید محمد حبان نے علاقے کا دورہ کر کے اسے منظم کیا اور جا بجا عشر اور زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے محصل مقرر کئے جو علاقے سے ملنے والے عشر کا اناج یا اسے فروخت کر کے روپیہ پنجتار بھیجا کرتے تھے۔ اس انتظام سے بیت المال کی آمدنی کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور اس میں استحکام پیدا ہوا۔ عشر کی تحصیل کا انتظام کتنا منظم تھا، اس کا اندازہ ان ذمہ داروں کے ناموں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوتا ہے جو علاقے میں اس کام کے لئے تعینات تھے۔ غلام رسول مہر نے ایسے سات نام ان کے زیر انتظام علاقوں کے ساتھ لکھے ہیں جنہیں غلام رسول مہر اپنی تحقیق سے حاصل کر سکے ہیں۔ لیکن خود ان کا خیال ہے کہ اس کام کے ذمہ دار دوسرے علاقوں میں یقیناً

---

(۴۰۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۲-۶۶۔

(۴۰۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۶۲۔ یہ روپئے غالباً انہیں سید صاحبؒ کے ارادت مندوں کی طرف سے ہدیتاً پیش کئے گئے ہوں گے۔ اس سے قبل بھی انہوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے روپئے سرحد بھیجے تھے۔

(۴۰۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۸۔

اور بھی ہوں گے۔ محصلین عشر کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ ایسے ہر ذمہ دار کے ساتھ کئی کئی مجاہدین بھی ہوتے تھے جو ان کی مدد کرتے تھے۔ (۴۰۴)

زکوۃ بیت المال کی آمدنی کا چوتھا ذریعہ تھا۔ شرعی نظام کے تحت زکوۃ بھی جمع کی جاتی تھی اور بیت المال میں داخل کی جاتی تھی اور ان مدوں میں استعمال کی جاتی تھی جو شریعت کے ذریعہ مخصوص کردئے گئے ہیں۔ زکوۃ کی وصولیابی کے بارے میں علحدہ سے تفصیلات مراجع میں نہیں ملتی ہیں، لیکن اس کا گاہے بگاہے تذکرہ ضرور مل جاتا ہے۔ مثلاً، جب قاضی سید حبّان نے شرعی نظام کے نفاذ کو تقویت پہنچانے کے لئے مختلف مقامات کا دورہ کیا تو انہوں نے عشر کے ساتھ زکوۃ کی تحصیل بھی انتظام کیا۔ محصلین عشر اور زکوۃ کا حساب علیحدہ علیحدہ رکھتے تھے۔ (۴۰۵)

منشی خانہ (Secretariat)

پنجتار میں ایک باقاعدہ منشی خانہ یا سکریٹریٹ بھی تھا جو ریاست کے ضروری ریکارڈ کو تحریری شکل میں محفوظ اور منظم رکھنے کے علاوہ خط و کتابت کے پھیلے ہوئے نظام کو انجام دینے کے لئے کام کرتا تھا۔ اس کے رئیس منشی محمدی انصاری تھے۔ غلام رسول مہر کے مطابق کم از کم سات ایسے آدمی اس ادارے میں کام کرتے تھے جنہیں باقاعدہ قلمدان دیا گیا تھا۔ مزید دو افراد جن کے پاس قلمدان نہ تھا، ان کے کام میں شریک ہوتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر مزید لوگوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی تھیں۔ مہر نے ایسے چار اشخاص کا نام بھی لکھا ہے جو ایسے موقعوں پر بلائے جاتے تھے۔ (۴۰۶) اس آفس میں کام کرنے والوں کی تعداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارہ خاصا اہم اور فعال تھا۔ اس کے ذمہ مندرجہ ذیل خدمات تھیں۔

۱۔ سید صاحبؒ یا مولانا شاہ اسماعیلؒ کے خطوط، جو انہوں نے علماء، خوانین اور مخصوص رفقاء کو سرحد یا ہندوستان بھیجے، کے لکھنے اور بھیجنے کی ذمہ داری اسی ادارے کی ہوتی تھی۔

۲۔ منشی خانہ، سرکاری احکام (official circulars) لکھ کر مختلف مقامات پر بھیجنے کے لئے بھی ذمہ دار تھا۔ ایسے کاغذات کی کئی کاپیاں تیار کی جاتی تھیں جس کی تیاری کے لئے علیحدہ سے لوگ بلائے جاتے تھے۔

---

(۴۰۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۹۔
(۴۰۵) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۹۔
(۴۰۶) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۶۔۴۷۔

۳۔ جب بھی کوئی لشکر کسی جگہ بھیجا جاتا تو ایک یا دو منشی اس کے ساتھ ضرور بھیجے جاتے۔ اگر دشمن سے یا کسی دوست قبیلے سے خط و کتابت کی ضرورت پڑتی تو یہ منشی سالار لشکر کی مدد کرتے۔ یہ حضرات مرکز یعنی پنجتار کو بھی باقاعدہ خطوط لکھ کر سارے حالات سے باخبر رکھتے۔

۴۔ یہ آفس ریاست سے متعلق ساری ضروری باتوں کا تحریری ریکارڈ رکھنے کے لئے بھی ذمہ دار تھا۔ اس آفس میں ایک رجسٹر ہوتا تھا جس میں ساری ضروری باتوں کو تفصیل سے تاریخ وار درج کیا جاتا تھا، جیسے جنگ کی تفصیلات، سفیروں کا آنا جانا، مہمانوں کا پنجتار آنا، آمدنی واخراجات، آنے والے خطوط اور بھیجے گئے جوابات۔ یہ رجسٹر مہینہ کے حساب سے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ ہر نئے مہینے کے آغاز میں رجسٹر تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ چونکہ یہ تحریک اسلامی اور دعوتی روح کی حامل تھی اس لئے اس ریکارڈ روم میں مولانا شاہ اسماعیلؒ کے خطبات کی تحریری کاپیاں بھی محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ان کی تعداد تقریباً ایک سو تھی اور یہ خطبات عموماً جمعہ یا عیدین کے موقعے پر دیئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو تحریری شکل میں لانے کے پیچھے منشی خانہ کے محرروں کی کاوش ہی کارفرما رہی ہوگی۔ ریکارڈ روم میں چند کتابیں بھی تھیں۔ غالباً اس کی وجہ سرحد میں ان کتابوں کی کم یابی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ''تفہیمات الٰہیہ'' اور ''مشکوٰۃ شریف'' بھی ان میں شامل تھیں۔

خط و کتابت کا کام انتہائی اہتمام اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا۔ رئیس منشی خانہ منشی محمدی انصاری ہر بھیجے جانے والے خط کو خود بغور پڑھتے۔ اس کے بعد ہی اس پر مہر لگایا جاتا اور اسے بھیجا جاتا۔ اگر کوئی مکتوب نہایت اہم ہوتا اور اس میں کوئی قطعی حکم ہوتا تو سید صاحبؒ اس پر اپنے قلم سے ''کلمۃ اللہ کافی'' لکھ دیتے۔ سید صاحبؒ کا مہر مولانا شاہ اسماعیلؒ کی تحویل میں رہتا تھا۔ اگر سید صاحبؒ کوئی خط خود لکھاتے تو خط کے ایک گوشے میں ''حضور'' لکھ دیا جاتا۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ کے لکھائے ہوئے خطوط میں ایک طرف ''مولانا'' لکھ دیا جاتا۔ اگر خط میں کوئی ایسی بات ہوتی جس کا اخفاء مقصود ہوتا تو خط میں رموز والے الفاظ (code words) استعمال کئے جاتے، یا پورا خط ایسی خفیہ زبان میں لکھا جاتا جسے بالکل مخصوص اور معتمد احباب کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اس کی مثال، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، غلام رسول مہر کی کتاب جماعت مجاہدین کے صفحات ۵۲۔۵۵ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ سید صاحبؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کی سرکاری مہریں تھیں۔ منشی خانہ کا ایک ریکارڈ رروم تھا جس میں سارے ضروری دستاویز رکھے جاتے تھے۔ غازی خان،

شہامت خان اور چند دوسرے مجاہد اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ (۴۰۷)

محکمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

پنجتار میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بھی محکمہ قائم کیا گیا تھا جو لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب دیتا تھا اور برائیوں کا سدباب کرتا تھا۔ مُلّا قطب الدین ننگر ہاری کو ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ علاقے کے دورے پر رہیں اور اس بات پر نظر رکھیں کہ مسلمان شرعی احکام پر عمل کرتے ہیں اور منکرات کا ارتکاب نہیں کرتے۔ تیس بندوقچی ان کی ماتحتی میں دیئے گئے تھے۔ انہوں نے اپنا کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ''تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگ شریعت کے پابند ہوگئے۔ پٹنہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ ملا قطب الدین کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کہیں جاتا تو گاؤں کے لوگ دوڑے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں۔'' (۴۰۸)

لشکر (Army)

سید صاحبؒ کے رفقاء جنہوں نے مختلف مواقع پر ان کا ساتھ اختیار کیا تھا، وہی ان کے فوجی تھے جو مجاہدین کہلاتے تھے۔ انہیں شروع سے ہی ایک فوجی نظام کے تحت مربوط و منظم کیا گیا تھا۔ جب سید صاحبؒ نے سرحد کو ہجرت کی تو گوالیار میں انہوں نے اپنے سارے رفقاء کو باقاعدہ فوجی دستوں میں تقسیم کیا اور ان پر کمانڈر مقرر کیے۔ یہی نظم آخر تک قائم رہا۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ جماعت خاص (Special Battalion)

یہ دستہ لشکر کے قلب میں رہتا تھا اور لشکر کا خاص دستہ مانا جاتا تھا۔ سید صاحبؒ اسی جماعت میں ہوتے تھے۔ مولانا محمد یوسف پھلتی اس جماعت کے پہلے کمانڈر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی محمد حسن نے اس کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالی۔ جب وہ شہید ہوگئے تو میاں ضیاء الدین پھلتی کو اس کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔

۲۔ مقدمۃ الجیش (Front Battalion)

جب لشکر حرکت میں ہوتا تو یہ دستہ اسلامی لشکر کے اگلے حصے میں ہوتا تھا۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ

---

(۴۰۷) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۶۔۴۹۔

(۴۰۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۸۔

اس کے سالار تھے۔ جنگ کے موقعہ پر عام طور پر وہ اس دستے کے ساتھ نہیں ہوتے تھے اس لئے کہ عموماً ایسے موقعوں پر پوری فوج کی کمان انہیں ہی دی جاتی تھی۔ ان کی غیر موجودگی میں سید رستم علی ان کی نیابت کرتے تھے۔

۳۔ میمنہ (Right-wing Battalion)

جنگ کے وقت یہ دستہ دائیں جانب ہوتا تھا۔ اس کے پہلے کمانڈر امجد خان تھے جو بعد میں کسی کام سے ہندوستان واپس ہو گئے تھے۔ جیسا کہ غلام رسول مہر لکھتے ہیں، اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے بعد اس دستہ کی قیادت کسے سونپی گئی۔

۴۔ میسرہ (Left -wing Battalion)

جنگ کے وقت یہ دستہ بائیں جانب کا مورچہ سنبھالتا تھا۔ سید صاحبؒ کے بھانجہ سید محمد یعقوب اس کے پہلے کمانڈر تھے۔ جب سید صاحبؒ کے حکم سے سید محمد یعقوب نے ٹونک میں قیام کیا تو ان کی جگہ پر شیخ بڈھن کو کمانڈر بنایا گیا۔ شیخ بڈھن جنگ اکوڑہ میں شہید ہو گئے۔ ان کے بعد میاں صلاح الدین کو کمانڈر مقرر کیا گیا۔ آخر میں مولانا احمد اللہ ناگپوری نے قیادت کی ذمہ داری سنبھالی اور جنگ بالاکوٹ تک وہی اس کے سالار رہے۔

۵۔ ساقۃ الجیش (Rear Battalion)

یہ جماعت چھکڑوں اور گاڑیوں کے ساتھ چلتی تھی جن پر سامان لدا ہوتا تھا۔ یہ سب سے پہلے چلتی اور سب کے بعد منزل پر پہنچتی۔ پیر خان، شیخ حسن علی، محمد خان خیر آبادی اور ابراہیم خان خیر آبادی مختلف اوقات میں اس جماعت کے سالار رہے۔ یہ جماعت لشکر کا سامان بہ حفاظت منزل تک پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔

۶۔ گھوڑسوار دستہ (Cavalry Unit)

ان پیادہ دستوں کے علاوہ اسلامی لشکر میں ایک گھوڑسوار دستہ بھی تھا جس کے کمانڈر عبدالمجید خان تھے۔ وہ اس نسبت سے لشکر میں "رسالدار" کہلاتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد حمزہ علی خان اس رسالہ کے کمانڈر مقرر کیے گئے۔

لشکریوں کی تعداد

ابتداء میں لشکر میں تقریباً پانچ سو پچاس (۵۵۰) مجاہدین تھے، جنہیں پانچ دستوں میں تقسیم

کر دیا گیا تھا۔ بعد میں قندھاریوں کی ایک بڑی تعداد نے سید صاحبؒ کی رفاقت اختیار کر لی۔ انہیں تین نئے دستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس طرح ان دستوں کی تعداد آٹھ ہو گئی۔ لشکر کا نواں دستہ بھی تھا جو چالیس مجاہدین پر مشتمل تھا۔ یہ ان دو سو فوجیوں میں سے تھے جنہیں ایک زمانے میں لشکر میں تنخواہ دار ملازم کے طور پر رکھا گیا تھا۔ جب ان ملازموں کو برخواست کر دیا گیا تو ان میں سے چالیس افراد سید صاحبؒ کی ترغیب پر بلا معاوضہ دین کی خدمت کی نیت سے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ ان مجاہدین کا ایک نیا دستہ بنا دیا گیا۔ یہ دستہ مرزا احمد بیگ پنجابی کی کمان میں تھا۔ ان دستوں کے علاوہ اسلامی لشکر میں ایک گھوڑ سوار دستہ بھی تھا۔ اس طرح اسلامی لشکر دس دستوں پر مشتمل تھا۔ (۴۰۹) جیسے جیسے ہندوستان سے نئے لوگ سرحد آتے گئے، مجاہدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن سرحد میں ان کی تعداد ڈھائی ہزار (۲,۵۰۰) سے کبھی زیادہ نہیں ہوئی۔ (۴۱۰) لیکن چونکہ وہ فتح و شکست سے بے نیاز اور دشمن کی طاقت اور تعداد سے بے پرواہ ہو کر صرف خدا کے لئے لڑتے تھے، اس لئے وہ اپنے سے زیادہ تعداد اور بہتر ساز و سامان والے لشکروں پر غالب رہتے تھے۔

ہتھیار

مجاہدین جنگ میں ان بندوقوں کا استعمال کرتے تھے جن کا اس زمانے میں چلن تھا۔ ان میں توڑے دار بندوقوں اور چقماقی بندوقوں کا ذکر آتا ہے۔ مجاہدین قرابین، زمبورک اور شاہین کا بھی استعمال کرتے تھے۔ قرابین چھوٹی بندوق ہوتی تھی جس کا منہ نسبتاً چوڑا ہوتا تھا۔ زمبورک چھوٹا توپ ہوتا تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے آسانی سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا جا سکتا تھا۔ شاہین ایک ہتھیار تھا جو بندوق سے بڑا اور توپ سے چھوٹا ہوتا تھا۔ مجاہدین نے مختلف جنگوں میں اس سے کام لیا۔ اسلامی لشکر نے زیدہ اور مایار کی جنگوں میں بڑی توپیں دشمنوں سے چھینی تھیں جو ان کے ہتھیاروں کے ذخیرے میں قیمتی اضافہ تھیں۔

جب سید صاحبؒ کے پاس بڑی توپیں آ گئیں تو ان میں استعمال کرنے کے لئے گولے کی ضرورت پڑی۔ اس طرح مجاہدین نے قاسم خیل نامی مقام پر، جو پنجتار کے شمال میں واقع ہے، گولہ

---

(۴۰۹) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۴۔۲۶۔

(۴۱۰) مقامی مسلمان جنگ کے وقت مجاہدین کے ساتھ ہو جاتے تھے جس سے لشکریوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی۔ مثلاً جنگ مایار میں مسلم سپاہیوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار (۳,۵۰۰) تھی۔

ڈھالنے کا کارخانہ قائم کرلیا جس میں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے ڈھلتے تھے۔ مجاہدین جنگ میں بانس کے نل بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ ڈیڑھ بالشت لمبے ہوتے تھے جن میں بارود بھری ہوتی تھی۔ جنگ میں انہیں آگ دے کر دشمن پر پھینکا جاتا تھا۔ اس طرح سینگوں اور بھینسوں کی آنتوں میں بارود بھر کر انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ مجاہدین تلوار، نیزے، خنجر اور گنڈاسے بھی استعمال کرتے تھے۔ قلعے کی دیوار پر چڑھنے کے لئے لمبی لمبی سیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ (۴۱۱)

فوجی تربیت کے مراکز (Military Training Centres)

لشکر میں فنون جنگ کی مشق کے لئے مختلف تربیتی مراکز قائم کئے گئے تھے۔ مجاہدین مختلف قسم کی جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ چاندماری بھی کرتے تھے۔ جن مجاہدین کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں، ان سے نشانے کی مشق کرانے کے لئے کئی افراد ذمہ دار تھے۔ اسی طرح چقماقی بندوقوں اور قرابین والوں کی تربیت کے لئے کئی افراد مخصوص تھے۔ قواعد کرانے والے اصحاب علیحدہ تھے۔ گاہے بگاہے گھوڑ دوڑ کا مقابلہ بھی ہوتا تھا اور نیزہ زنی کی مشق بھی۔ خود سید صاحبؒ نے بھی ایک بار رسالدار عبدالحمید خان کے ساتھ کئی مہینے تک نیزہ زنی کی مشق کی جس میں دونوں گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں: ''گھڑ دوڑ، تلوار اور خنجر چلانا، نیزہ بازی، توپ اور بندوق چلانا، جنگ کے قواعد سیکھنا، قلعے فتح کرنا، دشمن کو مارنا، اس غرض سے ہر قسم کے ہتھیار جمع کر رکھے تھے۔'' (۴۱۲) مجاہدین کا حوصلہ بلند رکھنے کے لئے خرم بلہوری کی نظم ''جہادیہ'' بھی میدان جنگ میں بہ آواز بلند ترنم سے پڑھی جاتی تھی۔

لشکر کے پرچم (Flags)

اسلامی لشکر کے تین بڑے پرچم تھے جن پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ قرآنی آیات کاڑھی گئی تھیں۔ پہلا پرچم ''صبغۃ اللہ'' کہلاتا تھا۔ اس پر پہلے پارہ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ اسلامی لشکر کا خاص نشان تھا اور صرف اس معرکے میں لے جایا جاتا تھا جس میں سید صاحبؒ خود شریک ہوتے تھے۔ اسے ابوالحسن نصیر آبادی اٹھاتے تھے۔ دوسرا پرچم ''مطیع اللہ'' کہلاتا تھا۔ اس پر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ ابراہیم خان خیر آبادی

---

(۴۱۱) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۳۰۔۱۳۱ اور ۱۳۴۔ (۴۱۲) مہر، جماعت مجاہدین، ۱۳۱۔۱۳۳۔

کی ذمہ داری میں رہتا تھا۔ تیسرا پرچم ''فتح اللہ'' کہلاتا تھا۔ اس پر سورہ صف کی چند آیتیں مثلاً ''یا ایھا الذین آمنو ھل ادلکم علی تجارۃ ۔۔۔۔الخ'' کاڑھی گئی تھیں۔ اسے جنگ میں محمد عرب اور بعد میں فرج اللہ شیدی اٹھاتے تھے۔ ان تین کے علاوہ لشکر کے اور پرچم بھی ہونگے۔ (۴۱۳) جب یہ پرچم لہرائے جاتے تو ان پر کاڑھی گئی قرآن کی آیات کو دیکھ کر مجاہدین کے دل ایمان ویقین اور جوش سے بھر جاتے۔

شفاخانہ (Medical Centre)

پنجتار میں ایک شفاخانہ تھا جو علاج کی ضرورتوں کے لئے خاصا منظم اور ضروری سہولتوں سے لیس تھا۔ اس میں دوا تجویز کرنے والے اہل فن کے ساتھ ساتھ جراحی کے ماہرین مریضوں کے علاج کے لئے مامور تھے۔ اس زمانے کے بعض ماہر اور مشہور جراحوں نے ہندوستان سے سرحد آکر سید صاحبؒ کی جماعت میں شرکت اختیار کرلی تھی۔ غلام رسول مہر نے ایسے افراد میں کریم بخش، نور بخش، عبدالرحیم حاجی جانی انبٹھوی، جان محمد جراح رامپوری اور عبدالرحیم جراح جانسٹھی کا نام لیا ہے۔ وہ زخم کے کھولنے، جسم سے گولی نکالنے اور زخم کو سینے میں ماہر تھے اور باقاعدہ شفاخانہ سے منسلک تھے۔ مہر کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور لوگ بھی شفاخانہ میں کام کرتے تھے لیکن ان کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ شفاخانہ میں کام کرنے والوں کی ایک جماعت جراحی کے بعد مریضوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھاتی تھی۔ عام حالات میں بیمار پڑنے پر بھی مجاہدین شفاخانہ کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ دوائیں مقامی طور پر تیار کرلی جاتی تھیں، لیکن خاص دواؤں کے ہندوستان سے منگوانے کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ (۴۱۴)

توشہ خانہ (Store)

لشکر کا ضروری سامان رکھنے کے لئے پنجتار میں ایک توشہ خانہ یا اسٹور بھی تھا جس میں اناج، کپڑے، ہتھیار اور مجاہدین کے استعمال کے دوسرے ضروری سامان رکھے جاتے تھے۔ یہاں سے ہی مجاہدین کو روزانہ راشن تقسیم کیا جاتا تھا۔ مجاہدین کو جو سالانہ کپڑے، جوتے اور ہر ہفتہ کپڑا دھونے کے لئے صابون دیا جاتا تھا، وہ سب سامان توشہ خانہ میں ہی رکھا جاتا تھا۔ توشہ خانہ میں ہتھیار بھی رکھے جاتے تھے۔ سید صاحبؒ کے ارادت مند اُن کی خدمت میں قیمتی ہتھیار پیش کرتے

(۴۱۳) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۴۔ (۴۱۴) مہر، جماعت مجاہدین، ۲۹۔

تھے،ضرورت کے مطابق ہتھیار خریدے بھی جاتے تھے اور مقامی طور پر بنائے بھی جاتے تھے۔ یہ سب ہتھیار توشہ خانہ میں رکھے جاتے تھے۔ مہر لکھتے ہیں: ''سید صاحبؒ کے توشہ خانہ میں ہتھیار جمع رہتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی، دے دیے جاتے۔'' (۴۱۵)

مویشی خانہ

چونکہ اسلامی لشکر میں ایک گھوڑسوار دستہ بھی تھا، اس لئے گھوڑوں کے رکھنے کے لئے ایک مناسب جگہ اور ان کی دیکھ بھال اور دانہ پانی کے لئے ذمہ دار لوگ بھی تھے۔ لشکر میں بار برداری کے لئے اونٹ بھی استعمال ہوتے تھے۔ جنگ زیدہ کے وقت تک لشکر میں اونٹوں کی تعداد اسّی (۸۰) ہو گئی تھی۔ بعد میں ان میں سے بہت سے مر گئے اور صرف دس بارہ اونٹ بچے تھے۔ ایک وقت میں لشکر میں ایک ہاتھی بھی تھا۔ ان سب جانوروں کی دیکھ ریکھ کے لئے لوگ مقرر تھے۔

سقا (Water Porter)

اسلامی لشکر میں مجاہدین کی ایک جماعت میدان جنگ میں لڑنے والوں کو پانی پلانے پر معمور ہوتی تھی۔ ان کو ''سقا'' کہا جاتا تھا۔

(ج) محکمۂ عدلیہ (The Judiciary)

عدلیہ اسلامی ریاست کا تیسرا اہم شعبہ تھا جو لوگوں کے درمیان حق و انصاف کا رشتہ قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ اس محکمہ کے بارے میں ضروری تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

عمومی ڈھانچہ

اسلامی ریاست کی جانب سے ہر چھوٹے بڑے مقام پر قاضی مقرر تھے۔ لوگ اپنے مقدمات اور مسائل کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے جن کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جاتا۔ ان سب قاضیوں کے اوپر ایک قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھا۔ اور پھر سب سے اوپر امیر المومنین کی حیثیت سے خود سید صاحبؒ تھے جو اس پورے محکمہ عدلیہ پر نگاہ رکھتے تھے تاکہ سارا کام شریعت کے مطابق انجام پائے۔ بعض علماء کو، جن میں تقریباً سب کے سب سرحد ہی کے تھے، مختلف علاقوں میں منصب افتاء پر معمور کیا گیا تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کر سکیں کہ کسی معاملے میں شرعی حکم کیا ہے۔

(۴۱۵) مہر جماعت مجاہدین، ۳۰۔

قاضی سید محمد حبّان کو پورے علاقے کے لئے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دیا گیا جو ایک مقامی عالم دین تھے۔ مولانا غلام رسول مہر علاقے میں مقرر کیے گئے دوسرے قاضیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مختلف علاقوں کے قاضیوں کی پوری تفصیل معلوم نہیں۔ قیاس یہ ہے کہ وہ مقامی علماء تھے۔ مثلاً، صاحب زادہ نواب عبدالقیوم مرحوم کے نانا ملا سید میر (ملا صاحب کوٹھا) کو کوٹھا کا قاضی بنا یا گیا تھا۔ اور ملا صفی اللہ شیوہ کے قاضی تھے۔ صرف پشاور میں مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو عہدۂ قضا دینا پڑا، اس لئے کہ سردار سلطان محمد خان بارک زئی کی خواہش یہی تھی۔ (۴۱۶)

عدلیہ کے رہنما اصول

سب سے پہلے اسلامی لشکر کے قاضی مولانا عبدالحئی بڈھانوی بنائے گئے تھے۔ (۴۱۷) امیر المومنین منتخب ہونے کے بعد سید صاحبؒ نے عدلیہ کو زیادہ منظم کیا۔ انہوں نے ایک باقاعدہ تحریری اعلان جاری کر کے لوگوں کو بتایا کہ عدلیہ کن اصولوں کے تحت کام کرے گی۔ اس میں جن اہم باتوں کا ذکر ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لوگوں میں جھگڑا پیدا ہو تو اس کا فیصلہ خود نہ کریں بلکہ قاضی سے کرائیں۔ کسی بھائی کو اس میں دخل دینا مناسب نہیں۔

۲۔ ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ جو کچھ کہنا ہو، قاضی کے سامنے کہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو تعدّی کا اندیشہ رہے گا اور تعدی خدا اور رسول ﷺ کے نزدیک حد درجہ ناپسند ہے۔

۳۔ اگر ہمارا کوئی لشکری قاضی کے بغیر کوئی حکم جاری کرے گا اور اس میں ظلم و تعدی کا پہلو ہوگا تو قاضی اسے سزا دیں گے۔ اگر قاضیوں سے کوئی قصور سرزد ہوگا تو ہماری طرف سے تنبیہ کی جائے گی۔ جس شخص کو کوئی حکم جاری کرانا ہو، وہ قاضی کی معرفت کرائے۔ (۴۱۸)

محکمہ عدلیہ نے اپنا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ جن لوگوں کو قاضی کا عہدہ دیا گیا، وہ عالم دین اور متقی ہوتے تھے اور لوگوں میں عدل قائم کرنے کی فکر کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے تھے۔

---

(۴۱۶) مہر، جماعت مجاہدین، ۳۷-۳۸۔ مقامی حضرات پر جس طرح اعتماد کیا گیا اور انہیں اہم منصبوں پر فائز کیا گیا اس سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ پشاور اور اس کے زیر اثر علاقوں میں مجاہدین کے خلاف جو بغاوت ہوئی اور ان کا جو قتل عام کیا گیا، اس کی وجہ قاضیوں کی زیادتی اور بے جا سختی تھی۔ جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ثابت ہوتا ہے، نہ صرف قاضی القضاۃ بلکہ اکثر قاضی مقامی علماء ہی تھے۔

(۴۱۷) ندوی، کاروان ایمان و عزیمت، ۱۵۔ (۴۱۸) مہر، جماعت مجاہدین، ۴۳-۴۴۔

سید صاحبؒ نے سرحد میں جو اسلامی ریاست قائم کی، وہ ایک سال سے کم مدت میں ہی ناعاقبت اندیش مقامی خوانین کی خونی بغاوت کی وجہ سے ختم ہوگئی جس کا تفصیلی ذکر باب اول میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشگوار استعجاب اور تحسین کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے کہ اتنے کم وقت میں اور اتنے محدود ذرائع کے ساتھ اس ریاست نے کتنا مکمل ڈھانچہ قائم کر لیا تھا اور وہ ہر پہلو سے کس قدر تعلیمات نبوی کی وفادار رہی تھی۔ اس نقطہ نظر سے اس تحریک کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اگرچہ یہ اسلامی ریاست تقریباً صرف دس مہینے کی قلیل مدت تک ہی زندہ رہی، لیکن سید صاحبؒ کی یہ مخلصانہ سعی کوئی نقش بر آب نہیں تھی جسے مخالف ہوا کے بس ایک جھونکے نے معدوم کر دیا ہو۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد بھی ان کے رفقاء نے اسے ایک مثال کے طور پر سامنے رکھا اور جہاں اور جس حد تک ممکن ہو سکا، اس نہج پر شرعی نظام کے نفاذ کو ایک نصب العین کی حیثیت سے اختیار کیا اور اسے کامیابی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ اس کی جو مثالیں مجھے تاریخ کے اوراق میں مل سکیں، ان کا مختصر ذکر نیچے کیا جاتا ہے۔

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مولانا عنایت علی عظیم آبادیؒ اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے حکم سے سرحد تشریف لائے اور مجاہدوں کو منظم کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں انہوں نے بالاکوٹ سکھوں سے چھین لیا اور دیگر بائیس (۲۲) قلعے فتح کر کے وہاں ایک مضبوط حکومت کی بناء ڈالی۔ جلد ہی مولانا ولایت علی عظیم آبادی بھی ہندوستان سے سرحد آگئے اور صدر ریاست کی ذمہ داری سنبھالی۔ وہاں اسلام گڑھ نام کے ایک شہر کو اسلامی ریاست کا دارالخلافت (Capital) مقرر کیا گیا۔ اس کی اپنی ایک فوج تھی جس میں ایک ہزار باقاعدہ سپاہی سرکاری ملازم تھے۔ یہاں اب اسلامی ریاست کا ایک ڈھانچہ قیام پذیر ہوا جس کی نگرانی میں شرعی نظام قائم ہوا۔ غلام رسول مہر کے مطابق ''حکومت کا پورا کاروبار کتاب و سنت کے مطابق انجام پاتا تھا'' عُشر باقاعدہ جمع ہوتا تھا۔ ریاست میں مقامی سرداروں کو جاگیر بھی دی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ ضرورت پڑنے پر اپنی طرف سے فوجیوں کا انتظام کر کے ریاست کی مدد کرنے کے لئے ذمہ دار تھے۔ مہر کے مطابق ''اس حساب سے نوکروں کے علاوہ بفضل خدا تین ہزار جنگ جو موجود تھے''۔

اس اسلامی ریاست کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے مہر آگے لکھتے ہیں:

> مجاہدین نے تمام قلعوں میں حسب ضرورت فوج مقرر کر رکھی تھی اور ہر قلعے کی متعلقہ آبادی کا انتظام قلعہ دار کے ہاتھ میں تھا۔ نیز ہر مقام پر تحصیل دار مقرر تھے جنہیں داروغہ محاصل کہا جاتا

تھا۔ اس طرح ہر جگہ خزانے، اسلحہ خانے اور اصطبل کے انتظام کے لئے مختلف اصحاب مامور تھے۔ بعض لوگوں کا کام یہ تھا کہ سپاہیوں کو باقاعدہ قوائد کراتے رہیں۔

اسی طرح احتساب، انسداد جرائم اور افتاء کا نظم بھی پورے علاقے میں شریعت کے مطابق جاری تھا۔ مہر کو ریاست کی خراج سے آمدنی کا صحیح علم نہ ہو سکا لیکن بعض قلمی مکتوب میں بعض علاقوں کی رقموں کے ذکر کی بنیاد پر انہوں نے جو تفصیل بیان کی ہے اس سے پوری رقم دو لاکھ چار ہزار بنتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فہرست خود ان کے مطابق نامکمل ہے اور اس خراج میں جاگیروں کو بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ (۴۱۹)

مولانا عنایت علی کے انتقال اور اسلامی ریاست کا نظام درہم برہم ہو جانے کے ایک عرصے کے بعد سرحد میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے صاحبزادے مولانا عبداللہ عظیم آبادی کو امیر منتخب کیا گیا انہوں نے سرحد میں ایک بڑے علاقے کو دوبارہ فتح کر کے اپنے زیر اثر لیا اور وہاں شریعت کا نفاذ کیا۔ ان کی فوج دس بٹالین پر مشتمل تھی۔ اپنی چالیس سالہ دور امارت میں وہ پوری قوت اور استقلال کے ساتھ انگریزوں کے خلاف صف آرا رہے۔ (۴۲۰)

جب مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے سرحد میں جہاد کا پرچم لہرایا تھا، انہیں دنوں میں سید اکبر شاہ ستھانوی کو زیریں ہزارہ کے عوام نے اپنا حاکم تسلیم کر لیا اور انہیں ''بادشاہ'' کا لقب دیا۔ سید اکبر شاہ سید صاحبؒ کے مرید اور مخلص ترین رفیق تھے۔ انہوں نے زیریں ہزارہ کے علاقے میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا۔ بدقسمتی سے اس اسلامی نظام کی عمر بہت قلیل ثابت ہوئی۔ اسی لئے وہ دور ''لنڈی مسلمانی'' (اسلامی حکومت جو بہت کم عرصہ باقی رہی) کے نام سے علاقے میں اب تک یاد کی جاتی ہے۔ (۴۲۱)

ان رفقاء کی فہرست میں جنہوں نے اپنے اپنے علاقے میں شرعی نظام کے نفاذ کی کوشش کی، ہم ٹونک کے نواب، نواب وزیر الدولہ اور حیدر آباد کے نواب کے حقیقی بھائی نواب مبارز الدولہ کا نام بھی شامل کر سکتے ہیں انہوں نے 'جہاں تک ممکن ہو سکا' اپنے زیر اثر علاقوں میں اسلامی شریعت نافذ کی اور حکومتی نظام کو اس کے تابع رکھا۔ ان کوششوں کا ذکر اس کتاب میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے مراجع سے مدد لی جا سکتی ہے۔

---

(۴۱۹) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۳۴۔ ۲۳۷۔ (۴۲۰) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۳۶۷۔ ۳۴۹، اور منشر ۵۹۔

(۴۲۱) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۲۲۔

تحریک جاری ہے

> بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا۔ اس ہندوستانی حکومت [راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت] نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمراں تھی، انہیں تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں۔
>
> ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان

اس باب میں اس حقیقت کو تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ سید صاحبؒ کی تحریک کے غیر معمولی اثرات ان کی شہادت کے ساتھ ختم نہیں ہوئے، بلکہ ان کے رفقاء نے ان کی شہادت کے بعد بھی سرحد اور ہندستان میں سو سال سے زیادہ مدت تک اس تحریک کو اپنی پوری جماعتی شناخت کے ساتھ زندہ رکھا۔ اسکے بعد اس بات پر روشنی ڈالی جائے گی کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مجاہدین کا موقف کیا تھا اور انگریزوں کے خلاف مسلسل جہاد میں انہوں نے کس طرح اپنا قیمتی خون بہایا۔ پھر اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ تحریک آج بھی اپنے دینی، اخلاقی، معاشرتی اور روحانی پیغام کے ساتھ زندہ ہے۔

۱۔ تحریک کی جہد مسلسل کا تاریخی جائزہ

جن دشوار ترین حالات میں سید صاحبؒ کے رفقاء نے ان کی شہادت کے بعد اپنی جدوجہد جاری رکھی، وہ صبر و تحمل، استقلال و استقامت اور ہمت و حوصلہ کی ایک طویل ایمان افروز داستان ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہوتی کہ اپنے محبوب قائد کی شہادت کے بعد مجاہدین بکھر جاتے، لیکن

اپنے نصب العین سے سچی وابستگی نے انہیں سید صاحبؒ کی شہادت کے صدمہ سے نکلنے میں مدد دی۔ انہوں نے ہندوستان اور سرحد دونوں جگہوں پر اپنی جماعت کو منظم کیا اور انہیں خطوط پر اپنی جد وجہد جاری رکھی جن پر سید صاحبؒ انہیں ڈال گئے تھے۔

سرحد میں انہوں نے بہت جلد شیخ ولی محمد کو اپنا قائد منتخب کیا۔ شیخ ولی محمد نے ضروری سمجھتے ہوئے سید صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ کو جو "بی بی صاحبہ" کہلاتی تھیں، بہ حفاظت سندھ پہنچانے کی ذمہ داری خود سنبھالی اور محمد قاسم پانی پتی کو سرحد میں مجاہدین کا امیر اور اپنا نائب مقرر کیا۔ پھر مولوی نصیر الدین منگلوری سرحد کے امیر بنائے گئے۔ انہوں نے کامیابی کے ساتھ مجاہدین کو منظم کیا اور سکھوں اور ان کے معاون قبائل کے خلاف کئی کامیابی لڑائیاں لڑیں۔ انہوں نے ٹوپی میں شہادت پائی۔ ان کے بعد میر اولاد علی نے قیادت کی ذمہ داری سنبھالی۔

ان دنوں جب ہندوستان خبر پہنچی کہ سرحد میں مجاہدین کمزور پڑتے جا رہے ہیں اور سید صاحبؒ کا مشن ختم ہوا جاتا ہے تو مسلمانانِ ہند ان کی امداد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور مشورے سے سید نصیر الدین دہلوی جو شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، ایک جماعت لے کر سرحد کے لئے روانہ ہوئے تا کہ سرحد میں مجاہدین کو تقویت ہو۔ وہ پہلے سندھ پہنچے۔ (۴۲۲) انہوں نے سکھوں اور انگریزوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ انہیں کے عہد امارت میں غزنی کی جنگ ہوئی تھی جو انگریزوں کے خلاف لڑی گئی تھی اور جس میں انگریزوں کے خلاف انہوں نے مجاہدین کا ایک لشکر روانہ کیا تھا۔

سید نصیر الدین دہلوی مجاہدین کے مرکز ستھانہ اس وقت پہنچے جب مولوی نصیر الدین منگلوری شہید ہو چکے تھے اور میر اولاد علی مجاہدین کے امیر تھے۔ اس وقت ستّر سے اسّی مجاہدین ان کے ساتھ تھے۔ کاروبارِ جہاد ان کی امارت میں پھر منظم ہوا۔ انہوں نے ستھانہ ہی میں انتقال کیا۔ ان کے بعد سید عبدالرحیم مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔ (۴۲۳) ان کا انتقال ۱۸۴۰ء میں ہوا۔ ان کے بعد میر

(۴۲۲) مولوی نصیر الدین دہلوی سید صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ سیدہ ام اسماعیل سے ملنے پیر کوٹ گئے تھے جہاں وہ ان دنوں مقیم تھیں۔ بی بی صاحبہ نے مولوی صاحبؒ کی حمایت میں تحریک جہاد کی مدد کے لئے ایک دردمندانہ اپیل جاری کی جس میں انہوں نے کہا کہ چونکہ وہ عورت ہیں اور ان کے بیٹے اسماعیل کم عمر ہیں، اس لئے وہ مجاہدین کے لئے صرف دعاء اور مسلمانوں سے تحریک جہاد کو قوت پہنچانے کی اپیل ہی کر سکتی ہیں۔ (مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۶۷)۔

(۴۲۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۱۳۔

اولاد علی نے امارت کی ذمہ داری دوبارہ سنبھالی۔

سید نصیر الدین دہلوی کے انتقال کے بعد سرحد میں جہاد کا کام پھر کمزور پڑ گیا۔ ستھانہ، جو مجاہدین کا مرکز تھا، سیلاب میں تباہ ہوگیا۔ پھر بھی تھوڑے سے مجاہدین میر اولاد علی کی امارت میں وہاں موجود تھے۔ اس پس منظر میں سید ضامن شاہ کاغانی نے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو سرحد تشریف لانے اور تحریک کو منظم کرنے کی دعوت دی۔ مولانا ولایت علی نے پہلے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کو عظیم آباد سے اور میر مقصود علی کو بہار سے سرحد بھیجا۔ ان کے پاس روپیہ بھی خاصی مقدار میں تھا اور جنگجوؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ جب وہ سرحد پہنچے تو میر اولاد علی مجاہدین کی جماعت کے ساتھ ان سے مل گئے اور سید ضامن شاہ کاغانی نے بھی ان کی معیت اختیار کرلی۔

مولانا عنایت علی نے سرحد میں تحریک جہاد کے تن مردہ میں روح پھونک دی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد انہوں نے ایک خون آشام جنگ میں سکھوں سے بالاکوٹ لے لیا۔ اس کے بعد انہوں نے گڑھی حبیب اللہ خان پر قبضہ کرلیا۔ پھر فتح گڑھ کا مضبوط قلعہ مجاہدین کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد مجاہدین طوفان کی طرح اٹھے اور کوئی دس دن کے قلیل عرصہ میں بائیس (۲۲) مزید قلعے فتح کرلئے۔ او کینلی (O' Kinally) کے بیان (کلکتہ ریویو، بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء ص: ۳۸۲) کے مطابق مجاہدین نے نہایت قلیل عرصے میں ایک وسیع علاقہ فتح کرکے اپنے زیر اثر لے لیا جو دریائے سندھ کے بائیں جانب ہری پور سے کاغان اور ستھانہ سے کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی مزید تفصیل پانچویں باب کے آخر میں مذکور ہے۔ (۴۲۴)

مولانا عنایت علی عظیم آبادی کے انتقال کے بعد تین ممبروں کا ایک بورڈ قائم کیا گیا اور اسے تحریک کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس بورڈ کے ممبر تھے: مولانا نصر اللہ، شاہ اکرام اللہ اور میر تقی۔ مولانا نصر اللہ اس بورڈ کے امیر تھے۔ جلد ہی مولانا مقصود علی سرحد پہنچے اور ان کو امیر منتخب کرلیا گیا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے صاحبزادے مولانا عبد اللہ عظیم آبادی کو امارت کی ذمہ داری سونپی گئی۔

مولانا عبد اللہ کا دور امارت چالیس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک بڑا علاقہ فتح کرکے اسے اپنے زیر اثر لیا اور وہاں شریعت کا نفاذ کیا۔ ان کے زمانے میں مجاہدین کو بہت قوت حاصل ہوئی۔ ان کے لشکر میں بارہ سو سے چودہ سو باقاعدہ فوجی تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے

---

(۴۲۴) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۲۲۳، ۲۳۱-۲۳۴۔

خلاف جہاد کا ایک مضبوط محاذ قائم کیا۔ انہیں کی امارت کے زمانے میں مجاہدین نے انگریزوں سے ۱۸۶۳ء میں امبیلہ کی مشہور جنگ لڑی تھی جس میں انگریز فوج کو ہولناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہی کی قبریں موجود تھیں۔ (۴۲۵)

اور اسی طرح یہ تحریک وقت کے ڈگر پر آگے بڑھتی رہی۔ جیسے جیسے ضرورت پڑی مخلصین آگے آتے گئے اور انہوں نے جان، مال اور آرزو کی بڑی سے بڑی قربانی دے کر سرحد میں تحریک جہاد و اصلاح کا پرچم بلند رکھا۔ (۴۲۶) یہ تحریک ایک سو سال سے زیادہ پورے آب و تاب کے ساتھ سرحد میں زندہ و متحرک رہی۔ اس پوری مدت میں اس میں نہ کبھی قیادت کا سلسلہ منقطع ہوا اور نہ ہی کبھی جماعت نے وقتی طور پر بھی اپنا مورچہ چھوڑا۔ ہنٹر نے بھی اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں، یا ان کو اس بات پر ہی آمادہ کرسکیں کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ہندوستان اپنے گھروں کو واپس آجائیں۔ (۴۲۷)

سرحد میں مجاہدین نے اپنی سرگرمی ۱۹۴۷ء میں اس وقت ختم کی جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور انگریز یہاں سے چلے گئے۔

۲۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور مجاہدین

سید صاحبؒ کا اصل نشانہ شروع سے انگریز تھے۔ انہوں نے پہلے سکھوں سے جہاد اس لئے کیا کہ پنجاب میں سکھ حکومت کے دور میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا تھا، اس کے فوری تدارک کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ مقامی حالات کے تحت سکھ پہلے سامنے آگئے۔ لیکن سید صاحبؒ کی نگاہوں سے یہ حقیقت کبھی اوجھل نہیں ہوئی کہ مسلمانان ہند کے اصل دشمن انگریز تھے۔ اس کے

---

(۴۲۵) ہنٹر، ۵۹۔
(۴۲۶) تحریک کے بعد کے لیڈروں کے نام اور تفصیلات کے لئے دیکھئے "مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۷۱۔۴۷۴۔
(۴۲۷) ہنٹر، ۶۳۔۶۴۔

علاوہ وہ انگریزوں کے ہندوستان پر غاصبانہ قبضے اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیر میں جکڑنے کے عیارانہ عزم وارادے کو بہت پہلے بھانپ چکے تھے اور اس کے لئے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہندو حکمرانوں کو بھی (مثلاً گوالیار کے مہاراجہ دولت راؤ سندھیا) کو بھی متوجہ کیا تھا۔ لیکن جب کسی بھی طرف سے عزم وحوصلہ کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تو وہ اپنی جماعت کو لے کر انگریزوں کے خلاف میدان میں آ گئے۔

جیسے سید صاحبؒ کو اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ انگریز ہندوستانی مسلمانوں کے اصلی دشمن تھے، اس طرح انگریزوں کو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں ان کے اصل مد مقابل مسلمان تھے۔ ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کو ہی انگریزوں کا دشمن اول قرار دیا ہے اور انہیں کی انگریز دشمنی اُس کی کتاب کا موضوع ہے۔ اس کی کتاب کا نام ''ہمارے ہندوستانی مسلمان: کیا وہ اپنے ضمیر کے مطابق ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہیں؟'' خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک ایسا دشمن دیکھ رہا تھا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر برطانیہ کی حکومت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ پوری کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کی انگریز مخالف جد وجہد اور سرحد میں ان سے باقاعدہ جنگ کی داستان سے بھری پڑی ہے۔ ہنٹر اس کا اعتراف کرتا ہے کہ سرحد میں سکھوں سے مقابلہ آرائی کے درمیان بھی اگر مجاہدین کو انگریزوں پر ضرب لگانے کا موقعہ حاصل ہو جاتا تو وہ اسے کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جو مورچہ کھول رکھا تھا۔ اس کا وہ ایک جگہ سرسری طور پر یوں ذکر کرتا ہے:

> جنگ کابل میں انہوں نے ایک لشکر جرار ہمارے دشمن کی امداد کے لئے روانہ کیا اور ایک ہزار کے قریب آخر دم تک ہمارا مقابلہ کرتے رہے۔ صرف فتح غزنی کے موقعہ پر تین سو کے قریب نے انگریزی تلواروں کے ذریعہ جام شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ (۴۲۸)

۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی تحریک آزادی میں مجاہدین نے بہت ہی اہم رول ادا کیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سید صاحبؒ کی ۱۸۳۱ء میں شہادت اور ۱۸۵۷ء میں صرف چھبیس (۲۶) برس کا فرق ہے۔ اس وقت مجاہدین سرحد میں انگریزوں، سکھوں اور مقامی قبائیلیوں کے خلاف تنہا نبرد آزما تھے اور سخت دباؤ میں تھے، اور ہندوستان میں انگریزوں کا خاص نشانہ تھے۔ لیکن ان میں

---

(۴۲۸) ہنٹر، ۳۵۔

کسی طرح کا بھی داخلی انتشار ہرگز نہیں تھا اور نہ ہی ان کی اپنے نصب العین سے وابستگی میں فرق آیا تھا۔ وہ سرحد میں فتح وشکست سے بے نیاز ہو کر انگریزوں سے جہاد کر رہے تھے اور ہندوستان میں خاموشی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف عدم تعاون اور جہاد پر بیعت لے رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا۔

جب ہندوستانی فوجیوں نے کلکتہ، میرٹھ اور دوسرے مقامات پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی تو وہ سب دہلی آئے، مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سرپرستی کی درخواست کی اور انہیں غیر مشروط طور پر اپنا بادشاہ اور جنگ آزادی میں اپنا سب سے بڑا رہنما تسلیم کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کی قیادت کی خطرناک ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اپنی قسمت پورے طور پر ہندوستانیوں کے ساتھ منسلک کر لی۔ ان ہی دنوں اطلاع ملی کہ جنرل بخت خان اپنے ساتھ باغی ہندوستانیوں کی ایک بڑی فوج لے کر دہلی آرہے ہیں۔ بخت خان پہلی جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی داخل ہوئے۔ چونکہ وہ ایک تجربہ کار فوجی اور جنگ آزادی کے مضبوط سپاہی تھے، اس لئے بہادر شاہ ظفر نے اپنے خسر ملکہ زینت محل کے والد احمد قلی خان کو ہدایت دی کہ وہ خود بخت خان کا استقبال کریں۔ بادشاہ نے بخت خان کو پوری ہندوستانی باغی فوج کا کمانڈر ان چیف (سالار اعظم) مقرر کیا۔ اس طرح یہ تحریک آزادی اس طرح منظم ہوئی کہ بہادر شاہ ظفر اس کے سرپرست اور جنرل بخت خان اس کے سالار اعظم تھے، اور چند مفاد پرست طبقوں کو چھوڑ کر پورے ہندوستان کی عوام بلاتفریق مذہب وملت ان کے ساتھ تھی۔ (۴۲۹)

جنرل بخت خان سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کے ایک باقاعدہ ممبر تھے۔ یہ تحریک اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے تحت لوگوں سے انگریزوں کے خلاف جہاد کی بیعت لی جاری تھی۔ اسی سلسلے میں مجاہدین کے ایک قائد مولوی سرفراز علی انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے گورکھپور اور اس کے اطراف میں لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ جب وہ سلطان پور پہنچے تو بخت خان نے جو ان دنوں وہاں کے صوبیدار تھے ان کی دعوت سے متاثر ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے ان کے ہاتھ

---

(۴۲۹) اقبال حسین، "جنرل بخت خان" اٹھارہ سو ستاون کے راہنما (سوانحی خاکے)۔" ۵۱۔ بعد میں مرزا مغل کمانڈر ان چیف بنادئے گئے اور بادشاہ نے بخت خان کو لارڈ گورنر بنادیا اور اسے کل اختیارات سونپ دیے۔ فوج کو بھی بخت خان کا حکم ماننے کی خصوصی ہدایت دی گئی۔ اسلم پرویز "بہادر شاہ ظفر" اٹھارہ سو ستاون کے راہنما، ۲۸۔

پر بیعت کر لی۔ (۴۳۰) اس طرح بخت خان کے سالار اعظم منتخب ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی قیادت ایک ایسے قائد کے ہاتھ میں آ گئی جو سید صاحبؒ کی جماعت مجاہدین سے منسلک تھا۔

جماعت مجاہدین کے افراد اس وقت دہلی یا دہلی سے باہر کہاں کہاں سرگرم عمل تھے اور ان کا لائحہ عمل کیا تھا، اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے تاریخ کے صفحات سے جمع کر کے ایک جگہ مربوط طور پر پیش کیا جائے۔ جو تفاصیل سامنے آسکی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے جو دہلی آ گئے تھے وہ جامع مسجد اور اس کے اطراف میں ٹھہرے تھے، منظم تھے اور تعداد میں بہت کم بھی نہیں تھے۔ سید محمد میاں، شمس العلماء ذکاء اللہ خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مولوی سرفراز علی دہلی آئے تھے۔ ذکاء اللہ خان کے مطابق، ان کی آمد کے ساتھ "وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میر لشکر اور بخت خان اس کا معاون ہوا۔" (۴۳۱)

---

(۴۳۰) سید محمد میاں، مسلمانان ہند کا شاندار ماضی، جلد ۴، ۴۶۰۔۴۶۱۔ بخت خان لکھنؤ کے نواح میں سلطان پور نامی مقام کے رہنے والے تھے۔ آغاز زندگی میں انہوں نے انگریزی فوج میں نوکری کر لی اور جلد ہی ترقی کر کے اونچے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔ پھر انہوں نے مولوی سرفراز علی سے، جو سید صاحبؒ کی تحریک کے ایک فعال قائد تھے، انگریزوں کے خلاف جہاد کی بیعت کر لی۔ جب نواب بہادر خان نے بریلی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تو بخت خان نے ان کی مدد کی۔ پھر انہوں نے ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کا رخ کیا جہاں بہادر شاہ ظفر نے ان کو ہندوستان کی باغی فوج کا کمانڈر ان چیف (اور بعد میں لارڈ گورنر) مقرر کیا۔ ان کی انگریزوں کے خلاف جنگ اب ہندوستان کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ انگریزوں نے ان کے خلاف بہادر شاہ ظفر کے دل میں اپنے ایک ایجنٹ مرزا الٰہی بخش جو بادشاہ کے سمدھی تھے کے ذریعہ شک وشبہ پیدا کر دیا۔ الٰہی بخش نے بادشاہ کو سمجھایا کہ بخت خان ایک روہیلہ ہے اور روہیلہ ہمیشہ مغل بادشاہوں کے خلاف رہے ہیں۔ اس نے انہیں یاد دلایا کہ ہمایوں کے خلاف جنگ کرنے والا شیر شاہ سوری بھی ایک روہیلہ تھا اور بادشاہ شاہ عالم پر دہلی میں حملہ آور ہونے والا اور اس کی آنکھیں نکالنے والا غلام قادر بھی روہیلہ۔ جب بہادر شاہ نے لال قلعہ کھونے کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تو بخت خان نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں اور جنگ جاری رکھیں کہ پورا ہندوستان ان کے ساتھ ہے۔ لیکن بادشاہ بے یقینی کا شکار ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے سپر ڈال دینے کا فیصلہ کیا۔ تب بخت خان نے جمنا پار کیا اور روہیل کھنڈ کی طرف نکل گیا۔ تفصیل کے لئے مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۱۶۱ تا ۱۶۴ دیکھئے۔

(۴۳۱) محمد میاں، ۱۸۵، بحوالہ تاریخ عروج انگلشیہ از ذکاء اللہ خان۔ محمد میاں اپنی کتاب میں مجاہدین کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شمولیت، تعداد اور قربانی کا تخمینہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیکھئے ۱۸۱۔۲۱۹۔

دہلی میں بخت خان کی طاقت کا ایک اہم ستون بھی مجاہدین تھے۔ اقبال حسین لکھتے ہیں:

گو کہ بخت خان کی طاقت ان کی اپنی فوج اور توپ خانہ تھا، لیکن ان کو مولوی سرفراز علی کی سرگرمیوں سے جہادیوں کی بھی مدد حاصل تھی جو ان کے ساتھ دہلی آئے تھے۔ بتدریج جہادیوں کی تعداد بھی دہلی میں بڑھتی گئی کیونکہ علماء مستقل طور پر مسلمانوں کو جہاد کا درس دے رہے تھے تاکہ انگریزوں کے خلاف لوگوں کو اکسا کر انہیں دہلی نہیں ملک کے باہر کر دیا جائے ۔ دہلی میں بخت خان جہادیوں کے قائد بن گئے۔ جہادیوں کو بعض ہم عصر مورخین نے وہابی بھی لکھا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر سید احمد بریلوی کے پیرو تھے۔۔۔۔ بہت سے جہادی ہانسی، حصار، جے پور، نصیر آباد، ٹونک اور بھوپال سے آئے تھے۔ ہانسی، حصار، ٹونک اور بھوپال میں روہیلہ افغانوں کی بڑی آبادیاں تھیں جو مولوی سرفراز علی، عبد الغفور، امام خان، رسالدار اور غوث محمد خان کے اثر میں تھے۔ (۴۳۲)

ولیم ہنٹر لکھتا ہے: "۱۸۵۷ء میں انہوں [مجاہدین] نے ہمارے خلاف عدم اتحاد کی بنیاد ڈالی۔" (۴۳۳) وہ محمد جعفر تھانیسری کی، جو سید صاحبؒ کی تحریک کے ایک اہم رہنما تھے، مثال دیتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے مجاہدین کی عملی وابستگی کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا۔ اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ (۴۳۴)

مولانا سید محمد میاں ایک طویل تجزیہ کے بعد لکھتے ہیں:

اتنی بات واضح ہے کہ جن علماء کرام نے اس تحریک [۱۸۵۷ء کی تحریک] میں حصہ لیا، ان میں سے اکثر و بیشتر حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز یا حضرت سید احمد شہیدؒ سے عقیدت یا تلمذ کا رابطہ رکھتے تھے۔ (۴۳۵)

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد بہت سی قومی تنظیموں نے کنارہ کشی اختیار کر لی، لیکن مجاہدین نے سرحد میں اسمست اور چمرکنڈ میں قائم اپنے مراکز کے ماتحت انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ حاجی میر شمس الدین نے اپنی کتاب "سیاحت افغانستان" میں

---

(۴۳۲) اقبال حسین، "جنرل بخت خان" اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما، ۵۵۔ (۴۳۳) ہنٹر، ۳۹۔
(۴۳۴) ہنٹر، ۱۳۱۔ (۴۳۵) محمد میاں، ۱۹۰۔

ایک چائے کی دعوت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو راجہ مہندر پرتاپ نے مہاجرین ہند کے اعزاز میں کابل کے ہوٹل مرکزی اندرابی میں ۱۱/ نومبر ۱۹۲۶ء کو دی تھی۔ (۴۳۶) اس موقعہ پر راجہ مہندر پرتاپ نے بہت کھلے الفاظ میں مجاہدین کی قومی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

آپ میں سے اکثر احباب کو غالباً اس صد سالہ تحریک مجاہدین ہندیہ کا پہلے سے علم ہوگا کہ کس طرح اس تحریک کے بانیوں نے جب ہندوستان میں اپنی قومی سلطنت وحکومت کے قصر کو اغیار کے ہاتھوں تباہ ہوتے پایا تو اس کی حفاظت وبحالی کے لئے املاک واوطان، خویش واقارب اور ہر قسم کی راحت وآرام کو لات مار کر بیابانوں اور سرحد ہند کی تنگ وتاریک پہاڑوں میں آ کر جگہ پکڑی اور دشمن کی ہر تباہ کن کوشش کے باوجود ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے کسی قربانی وفداکاری سے کبھی دریغ نہ کیا۔۔۔۔ اگر چہ ملک وملت نے اس

---

(۴۳۶) راجہ مہندر پرتاپ ہندوستان کی پہلی عارضی حکومت یا حکومت مؤقتہ جو ہندوستانیوں نے کابل میں تشکیل کی تھی، کے صدر تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی اس کے وزیر اعظم، مولانا محمد علی قصوری وزیر خارجہ اور مولانا محمد بشیر [امیر مجاہدین] وزیر دفاع منتخب کئے گئے۔ مولانا محمد بشیر کو یاغستان سے فوج اکٹھا کر کے ہندوستان میں انگریزی حکومت پر حملہ کرنے کو تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ ڈاکٹر خوشی محمد کو سکریٹری کا عہدہ دیا گیا (سرگزشت مجاہدین، ٦٦)۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی جماعت مجاہدین کے ذمہ دار نہ صرف جنگ آزادی کے قومی دھارے میں شریک تھے، بلکہ اس میں قائدانہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ اس پہلی حکومت مؤقتہ میں مسلمانوں کو جو نمائندگی دی گئی وہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے صف اول میں ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ اس وقت افغانستان کو انگریزوں کے خلاف جنگ کی حکمت عملی میں بہت اہمیت حاصل تھی اور جو لوگ وہاں ہندوستان کی طرف سے سرگرم عمل تھے، وہ مسلمان ہی تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں افغانستان کو ساتھ لینے کے مشن پر کابل بھیجا تھا۔ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن بھی اسی مقصد کے لئے وہاں بھیجے گئے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری بھی وہاں موجود تھے۔ جماعت مجاہدین کے امیر مولانا محمد بشیر بھی جماعت کے وکیل اور نمائندہ کی حیثیت سے وہاں تشریف لائے تھے۔ یہ سب افغانستان کی حکومت کو اس بات کے لئے آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف مورچہ کھول دیے۔ انہوں نے کابل میں ہندوستان کی پہلی حکومت مؤقتہ قائم کر کے اس کی جانب سے حکومت افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے ترکی، روس اور جرمنی سے بھی مضبوط رابطہ قائم رکھا۔ اس زمانے میں جرمنوں اور ترکوں کا ایک وفد بھی اسی مقصد کے لئے کابل پہنچا تھا، جس میں فان ہن ٹیگ (Von Hentig) جرمن وفد کا سرخیل اور قیصر جرمنی کا نمائندہ تھا اور کاظم بے ترکی وفد کا قائد اور خلیفۃ المسلمین سلطان محمد خامس عثمانی کا نمائندہ۔ اس وفد کے ساتھ جو لوگ آئے تھے، ان میں راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی بھی شامل تھے۔ (مہر، سرگزشت مجاہدین، ۴۸۸۔۴۹۳ اور ۵۱۲)۔

جماعت اور اس تحریک کی طرف کماحقہ توجہ نہیں کی، مگر ایک زمانہ آئے گا جب ہندوستان کے افق پر ان کے کارنامے سنہری حروف سے لکھے ہوئے نظر آئیں گے اور مادر وطن کا ایک ایک فرزند اس پر بجا طور پر فخر کرتا دکھائی دے گا۔

مولانا محمد بشیر نے جو امیر جماعت مجاہدین کی حیثیت سے اس دعوت میں اپنے چند رفقاء (مثلاً سید فضل اللہ شاہ اور مولوی محمد اسماعیل) کے ساتھ شریک تھے، راجہ مہندر پرتاپ کے بعد تقریر کی جس میں انہوں نے مجاہدین کے انگریزوں کے خلاف جہاد کے نصب العین کو کھل کر واضح کیا۔ انہوں نے کہا:

پروگرام محض اس قدر ہے کہ ہندوستان کی آئندہ آزادی کے قصر کی بنیادوں کے وہ پتھر نہایت ہی مضبوطی سے نصب کر دیں جن کی بنیاد پر اس کی اپنی حکومت کے قصر کے ستون اور دیواریں کھڑی ہوں۔

غلام رسول مہر ان ساری تفصیلات کی مبصرانہ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جماعت مجاہدین کے مقاصد میں آزادی ہند کو نمایاں ترین درجہ حاصل تھا اور یہ مقصد آخری دور ہی میں نہیں، بلکہ سید شہید [سید احمد شہیدؒ] کے وقت سے جماعت کے سامنے رہا۔(۴۳۷)

قیام الدین احمد بھی اپنی تحقیق میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "تحریک [سید احمد شہیدؒ] کا سیاسی نصب العین انگریزوں کے ساتھ جہاد تھا۔"(۴۳۸)

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اگر کسی جماعت نے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے (۱۹۴۷ء) تک انگریزوں کے خلاف مورچہ کھولے رکھا تو وہ جماعت مجاہدین کی تھی۔ سید صاحبؒ نے ۱۸۲۶ء میں سرحد ہجرت کی تھی۔ اس سے پہلے فکری طور پر وہ انگریز مخالف جدوجہد کی بناء ڈال چکے تھے۔ انہیں اپنی زندگی میں انگریزوں سے براہ راست ٹکرانے کا موقعہ نہیں ملا لیکن ۱۸۳۱ء میں ان کی شہادت کے بعد ان کے رفقاء نے انگریزوں اور ان کے حلیف قبائل کے خلاف باقاعدہ طور پر جہاد کا آغاز کیا۔ خصوصاً جب ۱۸۴۹ء میں سکھ ریاست کو انگریزوں نے اپنی حکومت میں ملا لیا تو مجاہدین اپنی پوری قوت کے ساتھ انگریزی اقتدار کے خلاف میدان میں آ گئے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جو عمومی بغاوت

---

(۴۳۷) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۵۶۵۔۵۶۷۔ (۴۳۸) قیام الدین احمد، ۳۵۹۔

پھوٹ پڑی وہ تحریک آزادی کا ایک اہم باب ہے، لیکن اس سے قبل ہی سے جس طرح مجاہدین نے سرحد میں ہندوستان کی برٹش حکومت کو باقاعدہ طور پر جنگوں میں الجھائے رکھا اور اسے سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا، اس کا اعتراف نہ کرنا تاریخی ناانصافی ہوگی۔ ولیم ہنٹر ۱۸۵۰ء سے انگریزی حکومت اور مجاہدین سرحد کے ٹکراؤ کی داستان اس طرح رقم کرتا ہے:

اس دوران میں مذہبی دیوانوں [مجاہدین] نے سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک واقعہ ہی تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ (۱۶) فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار (۳۵،۰۰۰) ہوگئی تھی اور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی بیس (۲۰) تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار (۶۰،۰۰۰) ہوگئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ (۴۳۹)

۱۸۶۳ء میں مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جنگ امبیلہ لڑی تھی۔ یہ زمانہ مولانا عبداللہ عظیم آبادی کی امارت کا تھا۔ اس جنگ میں انگریزی فوج مکمل تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ انگریزوں نے مقامی قبائلیوں میں پھوٹ ڈال کر اپنے کو بچالیا۔ ہنٹر لکھتا ہے: ''جس کام کو ہماری فوج سرانجام دے نہ سکی، اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) نے پورا کرنا شروع کر دیا۔'' (۴۴۰) پھر بھی جب برٹش فوج امبیلہ سے باہر نکلی ہے تو ''اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔'' جنگ کے دوران برٹش فوج کتنے سنگین خطرات کا سامنا کر رہی تھی اس کے بارے میں ہنٹر لکھتا ہے:

سارے سرحدی علاقے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۴ر نومبر [۱۸۶۳ء] کو پنجاب گورنمنٹ نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کے کیمپ کی حفاظتی فوج کا ایک حصہ عاریتاً مانگنا پڑا۔ (۴۴۱)

وہ آگے لکھتا ہے:

۱۴ نومبر [۱۸۶۳ء] کو حالات نے زیادہ خطرناک صورت حال اختیار کر لی اور برٹش فورسز کے کمانڈران چیف جلدی کر کے لاہور پہنچے اور ہدایت کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ (۴۴۲)

---

(۴۳۹) ہنٹر، ۳۸، ۳۹۔ (۴۴۰) ہنٹر، ۵۸۔ (۴۴۱) ہنٹر، ۵۳۔

(۴۴۲) ہنٹر The Indian Muslims ۲۳۔ اردو کتاب میں یہ حصہ ترجمہ میں چھوٹ گیا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ اردو میں یہاں خود کیا ہے۔ (مصنف)۔

جنگ امبیلہ کے بعد مجاہدین نے ۱۸۶۳ء اور 1915ء کے درمیان انگریزوں سے پانچ جنگیں لڑیں، جن میں انگریزوں کو اپنی حفاظت کے لئے پوری طاقت جھونکنی پڑی۔ مجاہدین نے ان سب جنگوں میں شکست کھائی لیکن ان کا عزم و حوصلہ انگریزوں کے لئے ہمیشہ نا قابل تسخیر رہا۔ (۴۴۳) ہنٹر مجاہدین کی قوت و طاقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے ۵۳٬۰۰۰ [ترپن ہزار] جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ (۴۴۴)

۱۸۶۸ء میں جب برطانوی حکومت نے مجاہدین کے خلاف جنگ کی تو "ہندوستان میں انگریزی فوج کے منتخب شدہ سپاہی مجاہدین کے مقابلہ میں جمع کر دیئے گئے تھے۔" (۴۴۵) ہنٹر مجموعی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مجاہدین بے ضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں بلکہ یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں۔ (۴۴۶)

مجاہدین نے نہ صرف انگریزوں سے میدان جنگ میں لوہا لیا بلکہ ان کے خلاف ایسی حکمت عملی کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان کی تحریک آزادی میں بعد میں بھی مجموعی طور پر بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون (non-cooperation) کی حکمت عملی اختیار کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے اپنے دور امارت میں برطانوی فوج کے نیٹیو انفینٹری (Native Infantry) کے چوتھے رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا اور کوشش کی کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس رجمنٹ کی اہمیت اس لئے بھی بہت زیادہ تھی کہ مجاہدین کے ساتھ ٹکراؤ کی شکل میں انگریزی حکومت سب سے پہلے اسے ہی آگے بڑھاتی۔ ہنٹر لکھتا ہے:

> اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی۔ یعنی انہوں نے [مجاہدین نے] کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے ان کے مقابلہ میں بھیجی جاتی۔ (۴۴۷)

---

(۴۴۳) تفصیل کے لئے دیکھئے آباد شاہ پوری، ۲۲۲۔ (۴۴۴) ہنٹر، ۴۷۔۴۸۔
(۴۴۵) ہنٹر، ۶۲۔ (۴۴۶) ہنٹر، ۶۰۔ (۴۴۷) ہنٹر، ۴۷۔

قیام الدین احمد نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانی فوجیوں کے عدم تعاون کی اہمیت کا ادراک سب سے پہلے مجاہدین نے کیا۔ (۴۴۸)

عدم تعاون کی حکمت عملی کے علاوہ مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں جو دیگر مختلف تدابیر اختیار کیں، ان سے بعد میں جنگ آزادی ہند کے لئے کوشش کرنے والے افراد اور پارٹیوں کو بھی رہنمائی ملی۔ قیام الدین احمد نے اس سلسلے میں مجاہدین کے ہندوستان کی آزادی کی قومی تحریک پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> وہابی تحریک [سید صاحبؒ کی تحریک] نے اپنے پیچھے انگریزوں کے خلاف دلیرانہ اور پائیدار کش مکش کی ایک حوصلہ افزا روایت اور ایک مستحکم و مربوط عمومی ہندوستان گیر سیاسی تنظیم کا ایک نمونہ بھی چھوڑا۔ اکثر حکمت عملیاں اور سیاسی چالیں جن کی ابتداء اور عمل درآمد وہابیوں [مجاہدین] سے ہوئی، بعد میں ابتدائی سیاسی جماعتوں، خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس نے اختیار کرلیں اور ترقی دی۔ مجہول عدم موالات یا عدم تعاون، پنچائت کی ترویج، وفادار عناصر کا سماجی بائیکاٹ، ''حقہ پانی بند'' جیسا کہ ریلی نے تعبیر کیا ہے، یہ تمام حربے آزادی کے لئے کش مکش کے دوران میں کمال کو پہنچا کر سیاسی احتجاج کے زبردست وسیلے بنا لئے گئے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی ابتداء وہابیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے ایک عام جلسے کی تقریر میں وہابیوں کے ایجاد کئے ہوئے چندوں کی تحصیل کے ایک غیر نمایاں اور مؤثر طریقہ کا ذکر خاص طور پر کیا تھا۔ ضروری خبروں کے اعلان اور تمام ملک سے آدمی اور روپے کے بھیج بھیجاؤ کے لئے وہابیوں [مجاہدین] کی پیچیدہ اور نہایت خفیہ تنظیم آج بالکل جدید اور نہایت مؤثر معلوم ہوتی ہے۔ (۴۴۹)

یہ سید صاحبؒ اور ان کی جماعت مجاہدین کے جہاد بالسیف کا ایک سرسری خاکہ ہے جس میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس تحریک نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کی مخلصانہ جد جہد پر جو گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، اور اپنی قلیل افراد و ذرائع کی متاع کے ساتھ جس درجہ ناموس شریعت کی حفاظت کی اور اپنے بھاری بھرکم مدمقابل کو جس حد تک مشکل میں ڈالے رکھا، وہ اسے دینی اور قومی حیثیت سے ایک انتہائی کامیاب تحریک ثابت کرتی ہے۔

---

(۴۴۸) قیام الدین احمد، ۳۶۰۔۳۶۱۔

(۴۴۹) قیام الدین احمد، ۳۶۰۔۳۶۱۔

۴: سید صاحبؒ کی تحریک کے اثرات کا اجمالی جائزہ

اوپر سید صاحبؒ کی جماعت مجاہدین کے جہاد بالسیف کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی تحریک کے دوسرے پہلو - احیاء دین، تزکیۂ نفس، اصلاح معاشرہ اور ان کی دعوت کی پذیرائی - کی محیر العقول وسعت کا ایک اجمالی خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

سید صاحبؒ کی دعوت میں بے پناہ قوت و تاثیر تھی۔ ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی اتنی بڑھی کہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی جیسے ذمہ دار عالم دین کی روایت کے مطابق

> ایک ایک روز میں دس دس ہزار آدمیوں کی جماعت بیعت ہونے لگی۔۔۔ پانچ چھ برس کے عرصے میں ہندوستان میں تیس لاکھ آدمیوں نے حضرت [سید صاحبؒ] سے بیعت کی اور سفر حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرف ہوئے۔ (۴۵۰)

مولوی عبد الاحد بھی سید صاحبؒ سے استفادہ کرنے والوں کی یہی تعداد لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چالیس ہزار سے زیادہ غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اور جو سلسلہ بیعت آپ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعے تمام روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلے میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔ (۴۵۱)

ولیم ہنٹر بھی سید صاحبؒ کی تحریک کے وسیع اثرات کے بارے میں ایک سرکاری رپورٹ کے حوالے سے لکھتا ہے:

> بنگال کے پولیس افسر نے رپورٹ کی تھی کہ ان کے صرف ایک واعظ نے اسّی ہزار مرید جمع کر رکھے ہیں جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے [ہیں]۔ (۴۵۲)

غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ایک مرید محمد آصف کے ہاتھ پر ایک لاکھ لوگوں نے بیعت کی۔ (۴۵۳) مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ انہوں نے حیدر آباد

---

(۴۵۰) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۲۷ (بحوالہ رسالہ تسعہ)۔

(۴۵۱) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۰۔۵۳۱۔ (بحوالہ سوانح احمدی)۔

(۴۵۲) ہنٹر، ۸۲۔ ہنٹر اس جگہ فرائضی جماعت کے ایک رکن کا ذکر کر رہا ہے۔ درحقیقت یہ جماعت سید صاحبؒ کی تحریک ہی کا ایک حصہ تھی۔ ہنٹر آگے لکھتا ہے: "بعد کے خلفاء، خصوصاً یحییٰ علی نے جنوبی بنگال کے فرازیوں [فرائضیوں] کو شمالی ہندوستان کے وہابیوں میں مدغم کر دیا تھا اور گزشتہ تیرہ برس سے ہم ان کو میدان جنگ کے مقتولین اور عدالتوں کے کٹہرے میں ساتھ ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں (صفحات ۱۴۵۔۱۴۶)۔ ہنٹر کی انگریزی کتاب میں جماعت کا نام فرائضی [Fraizi] ہی ہے۔

(۴۵۳) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۱۶۹۔

کے مشہور عالم اور بے مثال خطیب نواب بہادر یار جنگ کو ایک تقریر میں سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا کرامت علی جونپوری کے بارے میں یہ شہادت دیتے ہوئے خود سنا کہ ان کی معلومات کے مطابق

> مولانا کرامت علی کے ذریعہ بنگال میں جن لوگوں کو ہدایت ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ کو پہنچتی ہے۔ (۴۵۴)

سید صاحبؒ کی مساعی جمیلہ کی برکت سے شرک و بدعت کا سماج سے خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ پر مستند شرعی احکام پر عمل ہونے لگا اور شریعت کا احترام، نماز کی پابندی اور سنت سے محبت اس جماعت کی پہچان بن گئی۔ نواب صدیق حسن خان سید صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے۔ ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی اور جسمانی توجہ سے درجہ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں۔ (۴۵۵)

۴۔ موجودہ دور میں سید صاحبؒ کے اثرات

سید صاحبؒ کی تحریک کے اثرات ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ختم نہیں ہو گئے، بلکہ وہ آج بھی ملت اسلامیہ میں زندہ ہیں اور اس دور میں بھی مسلمانوں کی مختلف میدانوں میں راہنمائی کر رہے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی شہادت دیتے ہیں کہ بڑی تعداد میں مسلمانوں کے مذہبی، سماجی، روحانی اور تعلیمی ادارے آج بھی سید صاحبؒ کی تعلیمات سے راہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مشرقی بنگال میں نثار علی (عرف ٹیٹو میاں) کی اصلاحی تحریک، برصغیر کی جماعت اہلحدیث، صادق پور، پٹنہ کا مرکز جہاد و تربیت، امرتسر کا غزنوی خاندان اور اس کی تعلیمی و تبلیغی کوششیں، دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور ان کے طرز کے صدہا عربی مدارس جو اس برصغیر ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، سلفی المسلک مدارس و جامعات اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کا علمی و دینی مرکز، سب نے کم و بیش اسی ایک چراغ سے روشنی حاصل کی جو تیل بتی کے بجائے خون جگر اور اشک سحر گاہی سے جلایا گیا تھا اور جس کو ایک ''مرد درویش''

(۴۵۴) ندوی، ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۶۲، فوٹ نوٹ ۱۔

(۴۵۵) ندوی، سیرت سید احمد شہیدؒ، دوم، ۵۳۱۔ (بحوالہ تقصار جیود الاحرار)۔

نے جس کو خدا نے "انداز خسروانہ" بخشے تھے، تیز آندھی میں بھی فروزاں رکھا تھا۔ (۴۵۶)

اس فہرست میں ہم تحریک ریشمی رومال کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو بھی شامل کرتے ہیں، جو ہندوستان کی آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے اور جنہوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لئے ترکی اور دیگر ممالک سے مدد حاصل کرنے کی مضبوط کوشش کی تھی۔ (۴۵۷)

سید صاحبؒ کے بے پایاں اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے ان کا نام اور پیغام آج بھی مسلمانانِ ہند کے دلوں میں زندہ ہے اور انفرادی واجتماعی میدان میں انہیں خیر وترقی کی راہ دکھانے کے لئے ایک منارۂ نور کا کام دے رہا ہے۔ مدرسہ امام سید احمد بن عرفانؒ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی، جامعہ سید احمد شہیدؒ ملیح آباد، دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی میں سید صاحبؒ کی تحریک کے اثرات پر ہوئی کانفرنس، وہ کتابیں اور مضامین جو اُن پر اور ان کی تحریک پر متواتر شائع ہوتی رہی ہیں، وہ نظمیں جو شعراء آج بھی بطور تہنیت پیش کر رہے ہیں، مواعظ اور تقاریر میں ان کا ذکر خیر جو ایسی مجلسوں کی جان ہے، اور "طریقہ محمدیہ" کا روحانی سلسلہ جس میں آج بھی لوگ اپنی اصلاح وتزکیہ نفس کے لئے بیعت ہوتے ہیں۔ یہ سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی تحریک آج بھی زندہ ہے اور نیکی، خیر اور ترقی کی راہ پر مسلمانوں کی راہنمائی کر رہی ہے۔ حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ نے صحیح فرمایا کہ ہم آج بھی سید صاحبؒ کی تجدید کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ (۴۵۸)

نواب صدیق حسن خان نے سید صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، ہم اسے اس کتاب کے پیغام کا نچوڑ پیش کرنے کے لئے ان سے مستعار لیتے ہیں:

> خلاصہ یہ کہ اس زمانے میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہ حق سے مخلق خدا کو پہنچے، ان کا عشر عشیر بھی اس زمانے کے علماء ومشائخ سے نہیں پہنچا۔ (۴۵۹)

۵۔ آخری بات

ایک سوال جو کبھی ان لوگوں کے ذریعہ پوچھا جاتا ہے جنہوں نے گہرائی کے ساتھ اس تحریک کا

---

(۴۵۶) ندوی، ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۴۳۔۴۴۔

(۴۵۷) مہر، سرگزشت مجاہدین، ۵۳۶۔

(۴۵۸) مرشاد علی قاسمی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: اکابر ومشاہیر امت کی نظر میں، پھلت: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۹۸ء، ص ۶۳۔۶۴۔

(۴۵۹) ندوی، ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، ۵۸۔

مطالعہ نہیں کیا، یہ ہے کہ سید صاحبؒ کی تحریک ان کی باصلاحیت قیادت کے باوجود کیوں ناکام ہوگئی۔ یہ سوال عموماً انہیں لوگوں کو پریشان کرتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سید صاحبؒ کی تحریک کا مقصد بس ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا جس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ حقیقتاً سید صاحبؒ کی تحریک احیاء دین کی ایک ایسی جامع تحریک تھی جس نے مسلمانوں کی مکمل زندگی ـــــ دینی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ـــــ کو اپنی کارکردگی کا میدان بنایا تھا اور اس کی کامیابی یا ناکامی پر فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سارے میدانوں میں اس کی کامیابی کا تناسب کیا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے گزشتہ ابواب میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، حقیقتاً یہ تحریک ہر محاذ پر انتہائی کامیاب رہی۔ اس بات میں اختلاف ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کو عملی طور پر زندہ کرنے اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں اس تحریک نے بے مثال کامیابی حاصل کی۔ سید صاحبؒ نے سرحد میں ایک اسلامی ریاست بھی قائم کی جو نہ صرف کارکردگی کی ساری ضروری شرائط پوری کرتی تھی، بلکہ اسلامی ریاست کے شرعی آئیڈیل کا بہترین زندہ نمونہ تھی۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ یہ ریاست کتنے دنوں تک قائم رہی۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ جتنے دنوں تک یہ قائم رہی، اپنے ڈھانچے اور روح میں یہ مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست کا بہترین نمونہ تھی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس تحریک کے بارے میں اگر کوئی سوال پوچھا جانا چاہئے تو وہ یہ ہے کہ اتنے محدود وسائل اور اتنی مخالفت کے باوجود اتنے کم وقت میں اس حوصلہ ہاری ہوئی امت مسلمہ کو زمین کی پستی سے آسمان کی بلندی تک پہنچانے میں سید صاحبؒ اور ان کے مجاہدین نے کیسے اتنی بڑی کامیابی حاصل کرلی؟

اصلاً اس تحریک کی سب سے قابل فخر کامیابی یہ تھی کہ اس کا حقیقی نصب العین شرعی طور پر بالکل صحیح اور اس کے حصول کے لئے کی گئی کوشش انتہائی مخلصانہ تھیں۔ یہی وہ میزان حق ہے جس پر کسی بھی اسلامی شخصیت یا تحریک کو پرکھا جانا چاہئے۔ باقی رہا کسی بندۂ خدا کی جد وجہد کے نتائج کے طور پر سامنے آنے والی حصولیابی کا سوال، تو نتائج اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ان میں جو تصرف چاہے کرتا ہے۔ اگر ہم نتائج کو کامیابی کی لازمی شرط ماننے پر اصرار کریں تو ہم اللہ کے ان سچے اور عظیم المرتبت پیغمبروں کے بارے میں کیا کہیں گے جن میں سے بعض کی عمر بھر کی مقبول کوششوں کے بعد بھی ہدایت پانے والوں کی تعداد گنتی میں صرف چند تھی؟

فہرست کتب

اردو و فارسی

احمد، قیام الدین، ہندوستان میں وہابی تحریک، تیسرا ایڈیشن، مترجم محمد مسلم عظیم آبادی، کراچی: نفیس اکاڈمی، ۱۹۸۰ء۔
الحسنی، محمد، تذکرہ شاہ علم اللہؒ لکھنؤ: مکتبہ الاسلام مجلس تحقیقات ونشریات، ۱۹۷۰ء۔
الہاشمی، عبدالرحیم، الدار المنثور: تذکرہ صادقہ، تیسرا ایڈیشن، پٹنہ، ۱۹۶۴ء۔
آزاد، ابوالکلام، تذکرہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۱۹ء۔
بٹ، عبداللہ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، لاہور: قومی کتب خانہ، ۱۹۷۴ء۔
تھانوی، اشرف علی، ارواح ثلاثہ، لاہور: اسلامی اکیڈمی، ۱۹۷۶ء۔
تھانیسری، محمد جعفر، کالا پانی، فیصل آباد: طارق اکیڈمی، ۱۹۷۷ء۔
جلبانی، غلام، شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم، حیدر آباد، پاکستان: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۷۵ء۔
حسنی، حسین، شہید بالاکوٹ، لاہور: اسلامی پبلیکیشنز، ۱۹۸۴ء۔
حسنی، سید محمد ثانی، خانوادہ علم اللہؒ، رائے بریلی: دار عرفات ۲۰۰۵ء۔
——— صادقین صادق پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی: سید احمد شہید اکیڈمی ۲۰۰۷ء۔
——— شہید بالاکوٹ، تکیہ کلاں، رائے بریلی: سید احمد شہید اکیڈمی ۲۰۰۷ء۔
حسنی، محمد حمزہ، تذکرہ حضرت سید احمد شہیدؒ لکھنؤ: مکتبہ اسلام، ۱۹۹۵ء۔
دہلوی، مرزا حیرت، حیات طیبہ، دہلی، مکتبہ توحید ۱۹۸۴ء۔
سرور، محمد، مولانا عبید اللہ سندھی: حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، لاہور: سندھی ساگر اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔
سندھی، عبید اللہ امام، شاہ ولی اللہ اور ان کا نظریہ انقلاب، مترجم شیخ بشیر احمد، دہلی، فرید بک ڈپو، ۲۰۰۴ء۔
شاہ پور، آبادی، سید بادشاہ کا قافلہ، لاہور: البدر پبلیکیشنز، ۱۹۸۱ء۔
شہید، شاہ اسماعیل، تقویۃ الایمان، لاہور: امجد اکیڈمی، تاریخ اشاعت نہیں دی گئی ہے۔

———، منصب امامت، تیسرا ایڈیشن، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء۔
عباد الرحمٰن، شاہ، "تحریک حضرت سید احمد شہیدؒ کا دعوتی پہلو"، ارمغان، خصوصی دعوت اسلام نمبر، مظفر نگر: جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۹۸ء۔
عثمانی، قمر احمد، بریلی سے بالاکوٹ، لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۸۴ء
عوض، عبد القادر، اسلام کا نظام قانون، دمشق: الاتحاد الاسلامی العالمین، ۱۹۷۷ء
فریدی، نسیم احمد، نادر مکتوبات: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، جلد ا۔۲۔ پھلت، مظفر نگر: مکتبہ حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۹۸ء۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے)، نئی دہلی، ۲۰۰۹۔
کاندھلوی، نور الحسن، "شاہ ولی اللہؒ کے ایک خواب کی تعبیر"، الفرقان، فروری، ۱۹۹۰ء
محمد میاں، سید، علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ا۔۴، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۸۶ء
مہر، غلام رسول، سید احمد شہیدؒ، تیسرا ایڈیشن، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء
———، جماعت مجاہدین، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، سال اشاعت نہیں دی گئی ہے۔
———، سرگزشت مجاہدین، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، سال اشاعت نہیں دی گئی ہے۔
میرٹھی، محمد عاشق علی، تذکرہ الرشید، سہارنپور: اشاعت العلوم، ۱۹۷۷ء۔
ندوی، سید ابوالحسن علی، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ اول، چھٹا ایڈیشن، لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۷ء۔
———، سیرت سید احمد شہیدؒ، حصہ، دوم، تیسرا ایڈیشن، لکھنؤ: مجلس تحقیقات والنشریات اسلام، ۱۹۷۷ء۔
———، تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ، لکھنؤ: مجلس تحقیقات والنشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔
———، جب ایمان کی بہار آئی، لکھنؤ: مکتبہ فردوس، ۱۹۸۲ء۔
———، کاروان ایمان وعزیمت، لکھنؤ: مکتبہ اسلام، ۱۹۸۴ء۔
ندوی، مجیب اللہ، تذکرہ حضرت مولانا کرامت علی جونپوریؒ، دار عرفات، تکیہ کلاں، سید احمد شہید، اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔
ندوی، مسعود عالم، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر، دوسرا ایڈیشن، لاہور:

دارالدعوۃ السلفیہ، ۱۹۸۵ء۔
-----، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، حیدرآباد: دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ، ۱۹۴۶ء۔
نظامی، خلیق احمد، حضرت سید احمد شہید اوران کی تحریک اسلام وجہاد، رائے بریلی: دار عرفات دائرہ شاہ علم اللہ، ۱۹۹۱ء۔
نقوی، سید جعفر علی، منظورۃ السعداء فی احوال غزاۃ الشہداء (فارسی)، مخطوطہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لائبریری، لکھنؤ۔

English References

Ahmad, Mohiuddin, Saiyid Ahmad Shahid: His Life and Mission, Lucknow: Academy of Islamic Research and Publications, 1975.

Ahmad, Qiyamuddin, The Wahhabi Movement in India, Calcutta: Firma K. L. Mukhopadhyay, 1966.

Asad, Muhammad, The Principles of State and Government in Islam, Gibraltar: The Dar Al Andalus, 1980.

Dalrymple, William, The Last Mughal: The Fall of a Dynasty, Delhi, 1857, New Delhi: Penguin Books India, 2007.

Al-Ghazali, M., Muslim's Character, Riyadh: World Assembly of Muslim Youth. ND.

Hedayetullah, Muhammad, Sayyed Ahmad: A Study of the Religious Reform Movement of Sayyid Ahmad of Rae Bareli, Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1970.

Hunter, William, W. The Indian Musalmans: Are They Bound in Conscience to Rebel Against the Queen? Lahore: Premier Book House, 1974 (repr.).

Jalbani, Ghulam N.,Teachings of Shah Waliyullah of Delhi, 2nd ed., Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 1973.

Jameela, Maryam, Two Mujahidin of the Recent Past and Their Struggle for Freedom Against Foreign Rule, Lahore: Mohammad Yusuf Khan, 1976.

Khan, Moinuddin Ahmad, Selections from Bengal Government Records on Wahhabi Trials of 1863-1870.

Khan, Sayed Ahmad (Sir), Review on Dr. Hunter's Indian Musalmans, Lahore: Premier Book House, nd.

Kurdi, Abdurahman Abdulkadir, The Islamic State, London: Mansell Publishing Ltd., 1984.

Maududi, Abul A'la, S, Ethical View Point of Islam, 5th ed, Lahore: Islamic Publication Ltd, 1979.

........................, The Moral Foundations of the Islamic Movement, 2nd ed., Lahore: Islamic Publications Ltd., 1978.

........................, Islami Riyasat me Zimmiyon ke Huqooq (Urdu), Lahore: Islamic Publications Ltd., 1954.

Mujeeb, M., The Indian Muslims, London: George Allen and Unwin Ltd., 1967.

...................................., A Misunderstood Reformer (trans. by Mohiuddin Ahmad) Lucknow: Academy of Islamic Research and Publication 1979.

Smith, W. C, Islam in Modern Society, N.P: Mentor Books, 1957.

Titus, Murray T., Indian Islam, 2nd ed. New Delhi: Oriental Books Reprint Corporation, 1979.

اشاریے

شخصیات

(آ-ا)

(ع-غ)

(ف-ق-ک-گ)

(ل-م-ن)

(ہ-و-ی)

کتابیں اور جرائد

(ب-پ-ت)

مقامات

(ج-چ-ح-خ)

(د-ر)

(س-ش-ص-ض)

متفرقات